پرانے چراغ

مع تکملہ

سینے کے داغ

حصہ دوم

معاصر شخصیتوں، بزرگوں، استادوں، دوستوں اور عزیزوں
سے متعلق تعارفی مضامین، تاثرات، مشاہدات و واقعات
اور معلومات کا دلچسپ مجموعہ

مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مکتبہ فردوس
مکارم نگر، برولیا، لکھنؤ - ۲۰

مکتبۃ الشباب العلمیہ
ندوہ روڈ، لکھنؤ - ۲۰

بار ششم

۱۴۳۱ھ - ۲۰۱۰ء

نام کتاب	:	پرانے چراغ (حصہ دوم)
نام مصنف	:	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
صفحات	:	۳۷۶
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
کمپوزنگ	:	(حشمت علی) ڈالی گنج، لکھنؤ

تقسیم کار

مکتبۃ الشباب العلمیہ

ندوہ روڈ، ٹیگور مارگ، لکھنؤ-۲۰

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

مصنف کو مسرت ہے کہ اس کو صاحبِ ذوق قارئین کی خدمت میں اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' کی دوسری جلد کے پیش کرنے کا موقع مل رہا ہے، اس کتاب کو دینی واد بی حلقہ میں جو قبولیت حاصل ہوئی اس کا مصنف کو پہلے سے بالکل اندازہ نہ تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کو اس میں بڑا شبہ تھا کہ اس کی دوسری تصنیفات کے مقابلہ میں جو وسیع وطویل مطالعہ پر مبنی اور علمی اور تحقیقی رنگ کی ہیں، یہ کتاب سرسری و سطحی سمجھی جائے گی، اور اس کو زیادہ وقعت نہ دی جائے گی، لیکن اس کو ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ یہ دیکھ کر مسرت آمیز حیرت یا حیرت آمیز مسرت ہوئی کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور بڑے ذوق سے پڑھی گئی ہے، علم وادب کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ نہ تھا، بار ہا ایسا ہوا ہے کہ ایک مصنف، شاعر اور اہل قلم اپنی علمی تصنیفات کو اپنا سرمایۂ فخر اور حاصل عمر سمجھتا رہا ہے، لیکن اس نے اپنی زندگی میں دیکھ لیا کہ ان بھاری بھرکم تصنیفات کے مقابلہ میں جو بڑی عرق ریزی اور دیدہ وری سے لکھی گئیں اس کی دوسری کتاب جو اس کے نزدیک ہلکی اور چلتی ہوئی تھی، اور جس کو اس نے کسی ذاتی جذبہ وتقاضہ یا دوستوں کی تفریح طبع کے سامان کے طور پر لکھا تھا، زیادہ مقبول ہوئی، عربی کے مشہور مصنف علامہ ابن جوزی کا معاملہ بھی یہی ہے کہ ان کی درجنوں مایۂ ناز تصنیفات کے مقابلہ میں ان کی زندگی کے نقوش وتأثرات اور خیالات واعترافات کا مجموعہ ''صید الخاطر'' کہیں زیادہ مقبول ہوا، ہندوستان میں دیکھئے تو غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا، لیکن ان کی ساری شہرت

وعظمت ان کے اردو کلام سے ہے، جس کو وہ زیادہ خاطر میں نہیں لاتے تھے، اور اپنے بعض معاصرین کی تنقید اور خوردہ گیری پر ان کو کہنا پڑا تھا۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہے میرے اشعار میں معنی نہ سہی

"پرانے چراغ" کی تصنیف کا محرک چند محبوب ومحترم شخصیتوں کے بارے میں اپنی ذاتی معلومات، روابط وتعلقات کا اظہار، ان کے احسانات واثرات کا اعتراف اور ان کو تاریخی طور پر محفوظ کردینے کا جذبہ تھا، اس کو نفسیاتی کمزوری کہیے یا خوبی کہ اس بارے میں مصنف کچھ زیادہ ذکی الحس واقع ہوا ہے، اس کو اپنے ماضی، بیتے ہوئے دن، برتے ہوئے اشخاص، بچھڑے ہوئے بزرگوں اور احباب، اور گزرے ہوئے واقعات وحالات سے کچھ زیادہ دلچسپی اور لگاؤ ہے، اقبال نے اپنے متعلق جو کچھ کہا تھا، وہ صرف ایک لفظ کی ترمیم کے ساتھ حسب حال ہے۔

میں کہ میری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام زندگی کھوئے ہوؤں کی جستجو

"پرانے چراغ" کی پہلی جلد میں چند معاصر ناموروں کو چھوڑ دیا گیا تھا جن سے مصنف کا وہ ربط وضبط نہ تھا، جس کو اس کتاب میں شامل کرنے کے لیے مصنف نے ضروری سمجھا تھا، یا وہ بہت بڑے تھے، اور ان کا تذکرہ کرنے سے مصنف کو جودستائی وخودنمائی کے الزام کا اندیشہ تھا، لیکن کتاب کے شائع ہوجانے کے بعد خود بھی احساس ہوا، اور بعض لوگوں نے مصنف کو ٹوکا بھی کہ یہ ان کو نظر انداز کرنے کی معقول اور کافی وجہ نہیں، اگرچہ ان کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، اور ان میں سے بعض کے حالات وکمالات ملک یا ملت کی تاریخ کا جز بن گئے ہیں، ان کی ضخیم ضخیم سوانح عمریاں بھی موجود ہیں، لیکن ان کی زندگی کے بعض پہلو ایسے ہیں جن کو اپنے بعض معلومات یا تجربوں کی بنا پر مصنف شاید زیادہ نمایاں کرسکتا ہے، پھر ہر ایک اپنی نظر سے دیکھتا ہے، کیا ضروری ہے کہ وہ نظر

ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہو، بعض مرتبہ چھوٹا آدمی کسی شخصیت کے کسی ایسے پہلو کو دیکھ لیتا ہے جس کو ایک بڑا مصنف اور مبصر اہمیت نہیں دیتا۔

پھر اس پہلی جلد میں متعدد نامور ہم عصر، مشہور و مستور دونوں طرح کے اہل کمال کا تذکرہ رہ گیا تھا، ان میں سے بعض پر مصنف کو بعد میں قلم اٹھانے کا موقع ملا، اور بعض کے متعلق وہ لکھ چکا تھا، لیکن اس میں شامل کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی، اب ان سب مضامین کو اس جلد میں جمع کیا جا رہا ہے، ان کی تعداد پہلی جلد کی شخصیتوں سے زیادہ ہے، امید ہے کہ یہ حصہ بھی ذوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا، اور پڑھنے والوں کے دل میں ان مرحومین کے حق میں دعائے مغفرت کا جذبہ پیدا ہوگا کہ ان میں سے اکثر کی زبان حال اس طرح سے گویا ہے ؎

غرض نقشیست کز ما یاد ماند   کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحبدلے روزے ز رحمت   کند بر حال ایں مسکیں دعائے

ابوالحسن علی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی

۲۱ رشعبان المعظم ۱۴۰۰ھ
۵ رجولائی ۱۹۸۰ء

ہندوستان کے چند اہل کمال

و

مشاہیر رجال

- مولانا محمد علی جوہرؔ
- نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی
- مولانا ابوالکلام آزاد
- ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

مولانا محمد علی جوہر

میرے شعور وتعقل کا آغاز ۲۲-۱۹۲۱ء سے ہوتا ہے، جب میری عمر مشکل سے ۸، ۹ سال کی تھی، انسانی شعور کا تعلق عمر، انسان کی اندرونی صلاحیتوں اور ذہانت ہی سے نہیں ہے، ماحول واقعات اور خارجی دنیا سے بھی ہے، کبھی کوئی طوفان بلاخیز، کوئی خبر صاعقہ آسا، کوئی فتنۂ عالم آشوب یا شہر آشوب کسی کم سن بچہ کے شعور کو قبل از وقت بیدار کردیتا ہے، اور وہ کام کرتا ہے، جو ماہ وسال کی گردش اور تعلیم وتربیت کی مسیحائی نہیں کرتی، صور اسرافیل پر اگر مردے جی اٹھیں گے، تو ہنگامۂ رستخیز پر سوتوں کا جاگ جانا، شعور کا بیدار ہوجانا، اور بچوں کا بڑوں کے بہت سے احساسات اور گردوپیش کی دنیا کے واقعات سے باخبر ہوجانا اور ان کا اپنے سن وفہم کے مطابق اپنے بزرگوں کے رنج وغم کا ادراک کرنا محل تعجب نہیں۔

کچھ ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ پیش آیا، جنھوں نے ۲۲-۱۹۲۱ء کا زمانہ نہیں دیکھا، ان کو کیا بتایا جائے کہ اس وقت ہندوستان کس طرح کوہ آتش فشاں بنا ہوا تھا، اتحادیوں کی فتح سلطنت عثمانیہ کے خلاف ان کے منصوبوں اور خلافت کو ختم کردینے کی کوششوں کی خبر نے سارے ہندوستان میں آگ لگا رکھی تھی، مسجدوں، مجلسوں، مدرسوں، گھروں، دکانوں اور خلوت وجلوت، کہیں گویا اس گفتگو کے سوا کوئی گفتگو نہ تھی، ہمارا شہر لکھنؤ جو شروع سے سیاسی تحریکوں کا بڑا مرکز رہا ہے، اس تحریک میں بھی پیش پیش تھا، اسی تحریک کے ایک بڑے رہنما مولانا عبدالباری صاحب اسی شہر کے رہنے والے تھے، جن کا دولت خانہ محل سرائے فرنگی محل اس تحریک کے ہندو مسلم رہنماؤں کی لکھنؤ میں فرودگاہ تھی، اور خود گاندھی جی وہیں ٹھہرا کرتے تھے، اسی شہر میں چند سال پہلے مولانا شبلیؒ نے اپنی وہ زلزلہ

انگیز نظم پڑھی تھی، جو "ہنگامۂ بلقان" کے نام سے سارے ہندوستان میں مشہور ہوئی اور جس کے پہلے دو شعر یہ تھے ۔

خلافت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک؟
زوال دولت عثمان زوال ملک وملت ہے
عزیزو! فکر فرزند وعیال وخانماں کب تک؟

اسی زمانہ میں ہر بڑے چھوٹے، بوڑھے بچے اور مرد وعورت کی زبان پر یہ شعر تھا ۔

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

معلوم نہیں یہ شعر کس کا تھا؟ لیکن اس کو جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی وہ کم شعروں کو حاصل ہوئی ہوگی، یہ یاد نہیں کہ اس شعر سے پہلے یہ محبوب نام کان میں پڑ چکا تھا یا یہی شعر اس کا ذریعہ بنا، بہر حال اس میں شک نہیں کہ اس پوری بارات کا نوشہ محمد علی تھے، اور وہ اس وقت ہندوستان کے بے تاج بادشاہ معلوم ہوتے، گھر سے نکلنا اور کسی عزیز کے ساتھ امین آباد تک جانا ہوتا تو اس سڑک کے دونوں کناروں پر جس کے دونوں جانب پارک ہیں، چھوٹے چھوٹے رسالے جن میں اس طرح کی نظمیں ہوتیں، تصویریں جن میں دکھایا گیا ہوتا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان رسہ کشی ہو رہی ہے، ہندوستانیوں کی ٹیم میں مولانا محمد علی اور سب کے آخر میں مولانا شوکت علی اپنے بھاری بھرکم جثہ کے ساتھ ہیں، اور انھیں کا پلہ بھاری ہے، شہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت اٹھ گئی ہے، اور علی برادران اور گاندھی جی ہی کی حکومت ہے، پرنس آف ویلز کا لکھنؤ کا آنا بھی یاد ہے، میں کسی ضرورت سے گھر سے نکلا، دیکھا تو شہر میں ہُو کا عالم ہے، بھرے بازار، چلتی ہوئی سڑکیں ویران پڑی ہیں، امین الدولہ پارک (جھنڈے والے پارک) میں ولایتی کپڑوں کو آگ لگائی جاتی تھی، جو لوگ ولایتی کپڑوں میں ملبوس ہوتے وہ راستہ چھوڑ کر چلتے، پھر ایک

مرتبہ اپنے شعور کے زمانہ میں گاندھی جی اور علی برادران کی آمد بھی ہوئی، ایسا ہجوم، ایسا جوش وخروش، اور کسی لیڈر کی ایسی مقبولیت ومحبوبیت، نہ دیکھی نہ دیکھنے کی امید ہے، ہمارے کئی عزیز انگریزی اسکولوں میں پڑھتے تھے، وہ تعلیم ترک کرکے اسکولوں سے نکل آئے اور کسی نیشنل اسکول میں داخلہ لیا، جن لوگوں کو اعزازی یا امتیازی تمغے ملے تھے، اور ان پر انگریزی حکام کے نام یا انگریزی لکھی ہوئی تھی، ان کو پاؤں سے روندتے اپنے عزیزوں اور محلّہ والوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے انگریزی لباس بلکہ انگریزی معاشرت ترک کرکے دیسی لباس اور ہندوستانی معاشرت اختیار کرلی، تحریک نیم دینی نیم سیاسی تھی، مگر اس کا محرک وجذبہ دینی تھا، اور اس کے قائد دینی مزاج اور دینی جذبات کے لوگ تھے، اس کی دلیلیں بھی مذہب سے لائی جاتی تھیں، اور خلافت کی حمایت کے ذریعہ مذہب اور مسلمانوں کی عزت کو بچانے کا نعرہ دیا گیا تھا، اس لیے اس سے سویا ہوا مذہبی احساس جاگتا تھا، غیرت قومی انگڑائی لیتی تھی، اور خاکستر میں دبی ہوئی مجاہدانہ چنگاریاں سلگتی تھیں، کتنے بے نمازی نماز کے پابند ہوگئے، لوگوں نے داڑھیاں چھوڑ دیں، جیل جاکر کتنے آدمیوں کی زندگی سرتاسر بدل گئی، چونکہ علی برادران نے خود مغربیت سے اسلامیت کی طرف، جدید فیشن، اور فراغت وتجمّل سے فقر ودرویشی اور سادگی وجفاکشی کی طرف ہجرت کی تھی، وہ "مسٹر" سے "مولانا" بن گئے تھے، اس لیے ہزاروں آدمی ان کی تقلید میں مغربی اور امیرانہ طرز معاشرت چھوڑ کر اس سطح پر اتر آئے تھے، جو متوسط درجہ کے ہندوستانیوں کی تھی، اب وہ کوٹ پتلون کے بجائے کھدّر کے کرتہ، پاجامے میں نظر آنے لگے تھے، لوگوں نے ان جدید تعلیم یافتہ، آسودہ حال اور مغرب زدہ لوگوں کو جن کو سرکار میں قرب ورسائی اور اپنے عہدہ میں ترقی واعزاز کے سوا کوئی فکر اور دنیا ومافیہا کی خبر نہ تھی، مسلمانوں کی زبوں حالی، عالم اسلام کے زوال ونکبت اور خلافت اسلامی کی ذلت وشکست پر ہچکیوں سے روتے ہوئے دیکھا ہے، اور اس تبدیلی حال پر بڑے بڑے واقفوں کو کہتے ہوئے سنا ہے ؎

ایسی چنگاری بھی یا رب اپنے خاکستر میں تھی؟!

یہ سب تحریک خلاف کے رہنماؤں، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی کی تقریروں، مضامین، نظموں اور قربانیوں کا نتیجہ تھا، لیکن اس میں اصل روح مولانا محمد علی کی کام کر رہی تھی، جو ایک ''شعلۂ جوّالہ'' بنے ہوئے تھے، جس نے گاؤں گاؤں قصبہ قصبہ پھر کر پورے ملک کو حرارت ایمانی اور جوش آزادی سے مخمور بنا دیا تھا، دراصل انھیں نے گاندھی جی کو ان کے گوشۂ عزلت سے نکالا اور ان کے ساتھ دورہ کر کے اور ان کی ''جیکار'' لگوا کر ان کو عوامی لیڈر اور ملک کا محبوب رہنما بنا دیا، تحریک خلافت و آزادی وطن کے ساتھ، تحریک ترک موالات کو ضم کر کے غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت و بغاوت کی آگ بھڑکا دی، اور آزادیٔ وطن کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ سارے ملک یہاں تک کہ فوج و پولس میں ایک جنبش اور مضبوط انگریزی حکومت میں ایک ارتعاش پیدا ہو گیا، ہندو مسلم اتحاد کا سماں سارے ملک میں نظر آتا تھا، اور سب اسی نشہ میں سرشار تھے، پھر بار بار جیل جا کر اور مہینوں اور برسوں وہاں رہ کر جیل جانے کو ایک ہنسی کھیل بنا دیا، اور حکومت ہند کو ایک آزمائش میں مبتلا کر دیا۔

لیکن افسوس ہے کہ ۱۹۲۳ء میں جب وہ آخری بار جیل سے باہر آئے تو انگریزی حکومت کی جس کی نمائندگی اس وقت ایک یہودی النسل وائسرائے لارڈ ریڈنگ کر رہا تھا، سازش کامیاب ہو چکی تھی، ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو چکا تھا، شدھی سنگٹھن کی تحریک آندھی کی طرح چل رہی تھی، بڑے بڑے شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات وبا کی طرح پھوٹ پڑے تھے، مولانا محمد علی نے اپنی اسی سادگی اور مردانگی سے ان کی مذمت کی جو ایک مسلمان کا شیوہ اور ایک بہادر سپاہی کا مزاج ہے، لیکن ان کے زخمی دل کو اس سے بڑی چوٹ لگی کہ تحریک آزادی کے ہندو رہنماؤں نے (گاندھی جی کو مستثنیٰ کر کے) اس صاف دماغ اور کھلے دل سے ان فسادات کی مذمت اور اپنے فرقہ کے اس رجحان پر تنقید نہیں کی اور وہ ان کے خلاف اس طرح صف آرا نہیں ہوئے جیسی وہ توقع رکھتے تھے، اس

وقت سے مولانا محمد علی نے اس طرح سوچنا شروع کیا کہ شاید ان کی قسمت ان کے ہم خیال اور ہم مذہب لوگوں ہی سے وابستہ ہے، اور رفتہ رفتہ انڈین نیشنل کانگریس سے مایوس ہوتے چلے گئے، اور انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا میدان مسلمانوں کو بنالیا۔

اللہ نے محمد علی کو وہ سب صلاحیتیں اور کمالات عطا فرمائے تھے، جو ایسے رہنماؤں کے لیے ضروری ہیں، جو ملکوں اور قوموں میں انقلاب لاتے ہیں، سوتی بستی جگاتے ہیں، اور ممولوں کو شہباز سے لڑا دیتے ہیں، خلوص کا ایک دریائے بیکراں، پارے کی سیمابی اور بجلیوں کی بے تابی، خطابت کی جادوگری، شخصیت کی دلآویزی، خلقی و فطری محبوبیت و موہنی اور سب سے بڑھ کر دل کی وہ چوٹ اور جگر کا وہ زخم جو اس درجہ میں (شیخ الہند مولانا محمود حسن کو مستثنیٰ کر کے) ان کے ساتھیوں میں سے کم کسی کے حصہ میں آیا تھا، یہی وہ احساس و یقین تھا جس نے ان سے یہ شعر کہلوائے جو ان کے حال کی سچی تصویر تھی ۔

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے — پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو — خوش ہوں کہ وہ پیغام وفا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف — کافی اگر ایک خدا میرے لیے ہے

پھر ان کی وہ قلندرانہ شان اور مجذوبانہ ادا جس نے حق کہنے میں کبھی بڑے چھوٹے، دوست دشمن کی پروا نہیں کی اور جس کے نتیجہ میں وہ بعض اوقات میدان میں تنہا رہ گئے، لیکن انھوں نے اس تنہائی کی کبھی پروانہ کی بلکہ اس کو وسیلۂ نجات اور شرط ایمان سمجھا اور ان کی زبان سے وہ (الہامی) شعر نکلا جو بڑے سے بڑے عارف و موحد کی زبان سے نکل سکتا ہے ۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

انھوں نے حق کہنے میں نہ اپنے شیخ طریقت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی پروا کی، نہ اپنے سب سے محترم و محبوب شریک کار اور جنگ آزادی کے رفیق کار رزار گاندھی جی کی، نہ اپنے بعض محسنوں اور کرم فرماؤں مہاراجہ محمود آباد وغیرہ کی، نہ اس وقت کی سب

سے بڑی سلطنت (برطانیہ) کے وزیراعظم اور عہدہ داروں مسٹر لائیڈ جارج اور ریمزے میکڈانلڈ وغیرہ کی، نہ سب سے زیادہ قابل احترام سرزمین کے فرمانروا اور بانی سلطنت سلطان عبدالعزیز بن سعود کی، انھوں نے ہر جگہ حق بات کہی اور صاف اور بے لاگ کہی، اقبال کے اس شعر کے وہ صحیح طور پر مصداق تھے۔

آئین جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

وہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے ملی خصائص اور مزاج کا نقطۂ عروج تھے، عقل پر محبت کی فرماں روائی، شمع کی جاں گدازی اور پروانہ کی جاں نثاری، ذات نبوی سے عشق و شیفتگی، عالم اسلام وملت اسلامیہ کی حد سے بڑھی ہوئی فکر، عواقب ونتائج سے بے پرواہی "حاتم دگران وگدائے خویشتن" کی پرانی خو، فقیری میں شاہانہ خیالات، احتیاج میں خودداری وعزتِ نفس، استغناء ودولت کی حالت میں خاکساری وانکساری، وہ حضرت علی کے مقولہ "احذروا صولة الكريم إذا جاع واللئيم إذا شبع"(۱) کی صحیح تصویر تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ ان جیسا مخلص، جری اور نڈر بہادر اور خدا پرست، عاشق اسلام قائد اس ملت کو اس صدی میں نہیں ملا، لیکن بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ انھوں نے ایک ایسے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور اس کو اپنی سحر انگیز شخصیت کی توانائیوں اور قائدانہ صلاحیتوں کا محور بنایا تھا جس کی زمام کاران کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ملک کے باہر سات سمندر پار ایک ایسی جماعت وفرد کے ہاتھ میں تھی جو ان کے مشوروں کا تابع اور ان کی ہدایتوں کا پابند نہ تھا، بلکہ اپنے مصالح اور مغربی طاقتوں کے چشم وآبرو کا غلام تھا، یعنی مسئلہ خلافت جس کو کمال اتاترک نے اتحادیوں کے اشارہ اور خاص طور پر برطانیہ کے مشورہ اور ہدایت پر بیک جنبش لب یا گردشِ قلم ختم کردیا، اور سارا عالم اسلام خاص طور پر ہندوستان کا مجروح وستم رسیدہ مسلمان دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

---

(۱) شریف آدمی کے دبدبہ اور طنطنہ سے ڈرو جب وہ بھوکا ہو، اور سفلہ طبیعت کی غل فش سے ہوشیار رہو جب وہ شکم سیر ہو۔

پھر جب ہندوستان کے مسائل میں ان کی رہنمائی اور قیادت کا وقت آیا تو وہ اپنی بہترین توانائیاں صرف کر چکے تھے، ان کا دل زخموں سے چور چور تھا، اور ان کا جسم بیماریوں سے زار ونزار، ملت کی خوردہ گیری، حساب طلبی، تنقید وملامت، اندرونی انتشار، بیرونی مخالفت اور ساتھیوں کی بے وفائی سے ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا، وہ اپنی جوانی، طاقت، ہمت کے زمانہ میں جن لوگوں کے ساتھ تھے، اور جنھوں نے اس ملک کو آزاد کرانے کے لیے ان کے ساتھ قربانیاں دی تھیں، ان کو بعض تلخ تجربوں اور واقعات کی بنا پر چھوڑ چکے تھے، اور اب جن لوگوں کی انھوں نے رفاقت اختیار کی تھی، یا جو ان کے گرد جمع ہو گئے تھے، وہ ان کے خلوص، جذبۂ قربانی، قابلیت اور بلند عزائم میں ان سے کوئی نسبت نہیں رکھتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ''یوسف بے کارواں'' بن کر رہ گئے۔

آخر میں پھر ان کی مضطرب روح اور بے چین طبیعت نے اپنا جوہر دکھایا اور اس نے اپنے مرکز اصلی کی طرف پرواز کی، ۳۱-۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس لندن میں وہ شیر کی طرح گرجے اور بلبل کی طرح چہکے، انھوں نے اس وقت تک ہندوستان جانے سے انکار کر دیا، جب تک ان کو اس ملک کی آزادی کا مکمل پروانہ مل جائے، وہیں (۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو) ان کے طائر روح نے قفس عنصری سے پرواز کی، مفتیٔ اعظم فلسطین الحاج سید امین الحسینی کی دعوت وتحریک پر ان کی نعش فلسطین لے جائی گئی، اور ان کے جسم خاکی کو سرزمین انبیاء اور معراجِ نبوی کی پہلی منزل بیت المقدس کے ایک گوشہ میں جگہ ملی، اقبال نے خوب کہا ہے۔

خاک قدس اُورا بآغوش تمنا می گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

اور ان کا یہ کہنا بھی صحیح نکلا۔

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مجھے مولانا کی چند بار زیارت حاصل ہوئی، ایک مرتبہ میں نے ان کو ندوۃ العلماء کے جلسۂ کانپور منعقدہ ۱۹۲۶ء میں قریب سے دیکھا، ایک مرتبہ امین آباد پارک میں سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر ان کی تقریر سنی، ایک مرتبہ امین الدولہ پارک میں ان کو اپنے عربی لباس میں ایک غیر مسلم دوست سے انگریزی میں گفتگو کرتے ہوئے قریب سے سنا، وہ ہر طرح سے ملت کے سردار معلوم ہوتے تھے، بلند و بالا قد، پر گوشت و موزوں جسم، متناسب اعضاء، باوقار نورانی چہرہ، کھدر کے لباس پر عربی عبا، سر پر انور کیپ جس پر خنجر ہلال کا قومی نشان، ان کو تصویر میں تو ہزاروں بار دیکھا تھا، مجسم زندہ اور متحرک شکل میں بھی کئی بار دیکھا۔

ان کی والدہ مرحومہ بی اماں کے نام سے سارے ہندوستان میں مشہور تھیں، اپنے دورہ میں رائے بریلی بھی آئیں، ۱۹۲۳ء کا کوئی مہینہ تھا، فروری کے بعد کا اس لیے کہ ۲/فروری ۱۹۲۳ء میں میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کا انتقال ہوا تھا، اور بی اماں مرحومہ یہ سن کر والدہ صاحبہ سے ملنے جو عدت میں تھیں ہمارے گھر تشریف لائیں، وہ ایک چوکی پر بیٹھی ہوئی تھیں، اور خاندان کے بزرگ اس کو اٹھائے ہوئے تھے، یہ منظر ابھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

۳/جولائی ۱۹۵۱ء کو جب بیت المقدس میں پہلی بار حاضری ہوئی تو بڑی محبت وعقیدت کے ساتھ ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا جو مسجد اقصیٰ کے احاطہ میں نیچے کے حجروں میں سے ایک حجرہ میں تھی، وہاں ان کی قبر پر انھیں کا ایک شعر ہمارے ہندوستانی بزرگ دوست فاروقی صاحب مقیم قاہرہ کا لکھا ہوا آویزاں دیکھا، جو لسان الغیب سے نکلا ہوا واقعہ کی سچی تصویر تھا۔

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلائی بہار
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

دنیا میں حافظہ کی کوتاہی، حقائق سے چشم پوشی اور زود فراموشی کی ایسی مثالیں کم ملیں گی، جیسی ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ لکھنے والوں اور ہندوستانی عوام نے تحریک آزادی کے جانباز سپاہی اور اس کے ایک قافلہ سالار محمد علی کے معاملہ میں پیش کی

بعض مصنفین نے جن کو خوردبین اور دوربین نگاہوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات اور غیر اہم اشخاص کو بھی فراموش نہیں کیا یا تو مولانا محمد علی کو یکسر نظر انداز کر دیا یا ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے والوں کی بزم میں ان کو بادل نخواستہ اور کہیں کنارے پر جگہ دی، ان کے ساتھ اور ان کے ماتحت کام کرنے والوں اور ان کا ان کی زندگی میں ادب واحترام کرنے والوں نے بھی ان کے ساتھ فراخ دلی کا معاملہ نہیں کیا، خود ان کی ملت کا طرز عمل بھی ان کے ساتھ کچھ زیادہ جوہر شناسی اور منت پذیری کا نہیں رہا اور یہ ملت بھی اپنی زندگی فراموشی و "مردہ پرستی" میں بدنامی کی حد تک نامور ہونے کے باوجود ان کے نام کو زندہ اور تابندہ نہ رکھ سکی، غنیمت ہے کہ ان کی پیدائش پر سو برس گزرنے کے موقع پر اس کو اپنی کوتاہی کا احساس ہوا اور اس پورے تحتی براعظم میں جابجا ان کی صدی منانے اور ان کے کارناموں کو دہرانے اور ان کی یادگاریں قائم کرنے کی تحریک پیدا ہو گئی ہے، خدا کرے اس سے اس کوتاہی کی تلافی ہو سکے جو ان کے معاملہ میں اس وقت تک پیش آتی رہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد علی کو بہت کم لوگوں نے پہچانا اور اس میں بھی شبہ ہے کہ انھوں نے خود بھی پہچانا یا نہیں، اور یہ کوئی عیب نہیں، ایک ایسی مختلف الحیثیات اور جامع صفات ہستی کی تعریف ہے جس کا ہر پہلو مرکزی اور بنیادی معلوم ہوتا ہے، اور تماشائی محوِ حیرت بن کر کہتا ہے ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

یہ واقعہ بہت سے باکمالوں کے ساتھ پیش آیا ہے کہ ان کے کمالات کی کثرت وتنوع ان کے حقیقی کمالات کے لیے حجاب بن گیا اور بعض اوقات وہ بھی آخر تک فیصلہ نہ کر سکے کہ ان کا جوہر اصلی کیا ہے، اور ان کو اپنی توانائیوں اور خداداد صلاحیتوں کو کس نقطہ پر مرکوز کر دینا چاہیے، ان کی انگریزی زبان پر اہل زبان کی سی قدرت اور کسی انگریز ادیب کے بقول "برکلے کی زبان اور میکالے کا قلم" صحافت میں جو اپنی بے اصولی کے لیے بدنام ہے، اصول پسندی، راست گفتاری، اہم مجلسوں اور نازک موقعوں پر حاضر دماغی وحاضر

جوابی، جابر طاقتوں اور غالی معتقدوں دونوں کے سامنے کلمۂ حق کا اظہار، قوتِ ایمانی و عشق رسول، اسلام کے ساتھ وفاداری اور ملت کا درد اور سب سے بڑھ کر دینی حمیت اور اسلامی غیرت کس چیز کو سراہا جائے، اور کس کو ان کا امتیازی وصف قرار دیا جائے، بحیثیت شاعر کے بھی ان کا مقام بلند ہے، اور اس قابل کہ اس کو مستقل موضوع بنایا جائے، زبان کی سادگی، کلام کی تاثیر، جذبات کی گہرائی ان کا کلام بھی (اگر بے ادبی نہ ہو تو خواجہ میر درد کی طرح) سراپا انتخاب اور "پیغام سروش" ہے۔

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم کے ان اشعار میں جو انھوں نے ان کے مرثیہ کے طور پر کہے ہیں، بڑی حد تک اس حقیقت کی نقاب کشائی ہے، اور انھیں پر اس مختصر سے مقالہ کو ختم کیا جاتا ہے ؎

بدین مصطفیٰ دیوانہ بودی | فدائے ملت جانا نہ بودی
به بزم ما رئیس عشق بازاں | به رزم دشمناں فرزانہ بودی
بدل بودی فقیرے بے نوائے | به قالب پیکرِ شاہانہ بودی
سیاست را نقابِ چہرہ کردی | وگرنہ عاشق مستانہ بودی
سیاست تہمتی بر حسن پاکت | به آئیں خرد بیگانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم نہ سوزم | تو شمعِ دین را پروانہ بودی
بایمانہا زتو زورے وشورے | بجانہا ہمت مردانہ بودی
رمیدی از رہِ اغیار تا یار | عجب مستے! عجب دیوانہ بودی

□□□

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ

۱۹۲۵ء میں جب میری عمر دس سال کی تھی، مجھے ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں شرکت کا پہلی مرتبہ موقع ملا جو لکھنؤ میں ہو رہا تھا، دار العلوم کا ہال اپنی وسعت کے باوجود بھر چکا تھا، اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ایک بزرگ کے چہرہ پر میری توجہ مرکوز ہو کر رہ گئی جن کے حسن و جمال، وقار اور رکھ رکھاؤ، لباس کی پاکیزگی اور زیبائی کا نمونہ میری نظر سے اس وقت تک نہیں گزرا تھا۔

اس شخصیت میں علماء کی تمکنت اور قدیم رؤساء کی نستعلیقی اور وجاہت اس طرح جمع نظر آئی کہ گویا وہ کسی اسلامی مملکت کا کوئی فاضل بادشاہ اور سربراہ ہے، تھوڑی ہی دیر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ صدر جلسہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، علی گڑھ کے رئیس اور حیدر آباد دکن کے صدر الصدور امور مذہبی ہیں، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خود منصب صدارت کی ان سے عزت افزائی ہو رہی ہے۔

یہ میری پہلی سرسری زیارت تھی، بعد میں تو اس شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، وہ ہر سال دار العلوم ایک یا دو بار یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ آتے رہتے تھے، وہ اس کی مجلس انتظامی کے رکن رکین بلکہ صدر نشین اور اس کے بانیوں میں تھے، ان کی آمد کے موقع پر ان کے اعزاز میں دار العلوم کے طلبہ ضرور کوئی نہ کوئی نشست رکھتے تھے، جس سے وہ خطاب کرتے تھے۔

وہ ایک ایسے خطیب تھے، جن کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا تھا، ان میں خطابت کی بیشتر خصوصیات و شرائط جمع ہو گئی تھیں، اور ماہرین بلاغت نے خطیب و شیوا بیان مقرر کے جو اوصاف بتائے ہیں وہ ان میں سے بیشتر کے حامل تھے، وہ کشیدہ قامت، دلکش شخصیت، واضح اور صاف لہجہ و آواز، عالی نسبی، توازن و اعتدال، خودداری و خود اعتمادی کے

مالک تھے، اس لیے اپنی خطابت سے لوگوں کا دل جیت لیتے اور قلب ونظر میں سما جاتے۔

سن اور مطالعہ کے لحاظ سے جب کچھ آگے بڑھا تو ان کی کتاب ''علمائے سلف'' پڑھی جس نے میری دل ودماغ پر گہرا اثر چھوڑا، وہ میری محسن کتابوں میں ہے، اس نے میری اندر علم کا شوق اور طلب پیدا کی، میرے اس احساس میں مدارس عربیہ کے طلبہ وفضلاء کی بڑی تعداد شریک ہے، جو طلب علم کی راہ میں بلند ہمتی اور جد وجہد، شب بیداری، اور علوم وفنون سے استفادہ کے شغف کو اس کتاب کا احسان سمجھتی ہے۔

پھر ان کی کتاب ''سیرۃ الصدیق'' پڑھی جو ان کی ان کتابوں میں ہے، جو ان کے قلب ووجدان کے سرچشمہ سے سیراب ہو کر ان کی تراوش قلم بنی ہیں، اور یہی وہ صفت ہے، جو کسی کتاب کو حسن قبول اور تاثیر عطا کرتی ہے، وہ جب بھی سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا اپنے خطبات ومجالس میں ذکر کرتے تو بے اختیارانہ طور پر اور والہانہ انداز سے ان کے زہد وورع، خلافت اور بیت المال کے سلسلہ میں امانت ودیانت کے واقعات اور اپنی اہلیہ محترمہ کی شیرینی کے لیے بچائی ہوئی رقم کی بیت المال کو واپسی اور زائد از ضرورت کہہ کر اس رقم کو منسوخ کردینے کے واقعہ کو مؤثر اور گلوگیر آواز میں بیان کرتے اور بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پاتے تھے۔

آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ صف اول کے ادیبوں میں ہیں اور اردو کے ایک صاحب طرز انشاء پرداز ہیں، جن کے اسلوب کا جوہر، تھوڑے الفاظ میں بڑے بڑے مطالب ادا کرنا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی تاریخ نگاری میں بھی ایک ادبی شان ہے، پڑھنے والے کے سامنے اچانک کوئی بے ساختہ جملہ آجاتا ہے اور اس پر ایک کیفیت طاری ہوجاتی ہے، اور کبھی خوبصورت فارسی ترکیبیں نادر پیرایۂ بیان میں سامنے آجاتی ہیں، ادبی اور تاریخی کتابوں پر ان کے مقدمے، ندوۃ العلماء کے جلسوں کے خطبے، اردو کانفرنس لاہور، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریریں ادب عالی اور انشاء بلیغ کی بہترین مثال ہیں۔

ان کی ریاست وامارت نے ان کے عالمانہ پہلو کو دبالیا تھا، ورنہ وہ بلند پایہ علماء

میں شمار ہوتے، اس لیے کہ انھوں نے علوم عقلیہ ودینیہ اور شعروادب کی تعلیم ان فنون کے کامل اساتذہ سے حاصل کی تھی، اور مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے حلقۂ درس سے تکمیل کی تھی، جو اپنے عصر کے استاذ الکل تھے۔

اسی طرح ان کی ندوۃ العلماء کی تقریریں، قدیم مدارس کے مروجہ طریق تعلیم پر ان کے اصلاحی وتنقیدی مقالات اور خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد کی تنقید ان کے پختہ علم اور عمیق نظر کی گواہ ہیں۔

وہ ایک بڑے مؤرخ تھے، اور قدیم ماخذوں پر ان کی گہری نظر تھی، وہ علم وادب کی پیش رفت سے برابر تعلق قائم رکھتے تھے، اور اس کے رواں دواں قافلہ سے سن رسیدگی اور مشاغل کے باوجود بچھڑنے نہیں پاتے تھے، ان کو تازہ ترین مطبوعات کی برابر فکر رہتی تھی، جن سے اپنے قیمتی کتب خانہ کو آراستہ کرنے اور مطالعہ کرنے کے بعد ان پر اپنی رائے بھی ظاہر کرتے اور کبھی کبھی ہندوستان کے بلند پایہ ماہوار رسالہ ''معارف'' میں لکھتے جو مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ادارت ونگرانی میں دار المصنفین اعظم گڑھ سے نکلتا تھا، وہ اپنے عہد شباب میں ادیب کبیر ومورخ شہیر مولانا شبلی نعمانیؒ کے ساتھ رسالہ ''الندوہ'' کی ادارت میں شریک رہے تھے، جو اپنے وقت کا سب سے بلند پایہ علمی رسالہ تھا، جس میں مضمون کا چھپ جانا مضمون نگار کے لیے بڑی عزت وافتخار کی بات تھی۔

ان کا محبوب موضوع ہندی اسلامی ثقافت، اس کے اشخاص، رجال، علماء کے اخلاق ان کی قناعت وپاک نفسی، خودداری، علمی اشتغال اور درس ومطالعہ میں انہماک کا تذکرہ تھا، وہ جب اپنے استاذ مولانا لطف اللہ صاحب کا تذکرہ فرماتے تو اچانک ان کی نگاہ تصور میں ان کی مجالس درس اور ان کی شخصیت کی تصویر آجاتی پھر وہ اس تذکرہ میں ایسے محو ہو جاتے کہ جیسے ان کو دنیا ومافیہا کی خبر نہیں۔

ان کی کتاب ''استاذ العلماء'' جس میں انھوں نے اپنے محبوب استاذ کا حال لکھا اور قارئین سے ان کا تعارف کرایا ہے تاریخ وتراجم کی مثالی کتابوں میں سے ہے، اس کی

سطر سطر سے استاذ سے وابستگی و وفاداری اور شدت تعلق جھلکتی بلکہ چھلکتی ہے۔

وہ ہندوستان کے آخری فارسی داں ادیبوں میں تھے، اس لیے کہ ہندوستان میں فارسی کا ذوق اور فارسی زبان و ادب اپنی زندگی کے آخری منزل میں ہیں، وہ فارسی میں استادانہ اشعار بھی کہتے تھے، اور فارسی کے مشاہیر شعراء کے منتخب اشعار انھیں نوک زبان رہتے تھے، اساتذہ کی فارسی کی غزلیات وقصائد کے دلکش حصوں کے انتخاب میں ان کا ذوق بہت بلند اور ان کی نظر بڑی ناقدانہ و مبصرانہ تھی، فارسی ادب کے اس ذوق وکمال میں ان کے کم عمر دوست مولانا ابوالکلام آزاد کے سوا ان کا کوئی سہیم وشریک نہ تھا، جس کی گواہی ان دونوں حضرات کے مراسلات اور مخاطبات سے ملتی ہے جو ''کاروان خیال'' اور ''غبار خاطر'' میں شائع ہو چکے ہیں۔

انھیں کتابوں کے جمع کرنے اور علمی نوادر وقدیم تالیفات کو فراہم کرنے کا بھی بہت شوق تھا، انھیں اپنا یہ قیمتی کتب خانہ بہت عزیز تھا، جو قلمی کتابوں اور قدیم نوادر کے لحاظ سے ہندوستان کے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے، اہل علم دور دور سے اس کی زیارت اور اس سے استفادہ کے لیے آتے اور اپنی کتابوں کے مقدموں اور مقالات میں اس کا اعتراف کرتے تھے، انھیں اس کتب خانہ کا ہر وقت خیال رہتا تھا، اور وہ برابر اس سرمایہ میں اضافہ کرتے رہتے تھے، انھوں نے اپنے قلم سے ایک ضخیم اور مفصل فہرست بھی تیار کی تھی، جس میں کتابوں کی خصوصیات مصنفین اور دوسری ضروری باتوں کا تذکرہ تھا، اس فہرست سے ان کی وسعت معلومات اور مطالعہ کے انہماک کا پتہ چلتا ہے۔

انھوں نے صرف انھی علمی کمالات پر قناعت اور اکتفا نہیں کیا بلکہ علم وفن کے پہلو بہ پہلو ایمان واحسان کے ذریعہ اپنی باطنی دنیا بھی آباد کی، اپنے اوقات عزیز کو اللہ کے ذکر سے معمور کیا اور اس طرح دین ودنیا کی حسنات کو جمع کرنے کی بھی کوشش کی، اسی مقصد کی خاطر ایام جوانی ہی میں اویس زمانہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ سے تعلق پیدا کیا اور ان کی صحبت ومعرفت سے فیض پایا اور عمر بھر اس کا دم بھرتے رہے،

آپ نماز باجماعت اور نوافل تک کی پابندی کرتے تھے، سفر وحضر میں معمولات ووظائف میں کوئی فرق نہیں آتا تھا، اخیر عمر میں جب قویٰ کمزور پڑ گئے تھے، اور حافظہ نے کوتاہی کی اور لوگوں کو پہچاننا بھی مشکل ہو گیا تھا، مرتے دم تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام کا خاص معمول رہا۔

میں نے اپنے طویل سفروں اور لوگوں سے تعلقات میں ہر طرح کے اہل کمال دیکھے ہیں، میں نے اہل علم کو بھی دیکھا، اہل دین کو بھی دیکھا، ادیبوں اور شاعروں سے بھی ملا، لیکن میں نے ان جیسا متضاد صفات کا جامع اور متنوع شخصیت کا حامل نہیں دیکھا، وہ حلقۂ امراء میں امیر، دبستان ادباء میں ادیب، طبقۂ شعراء میں شاعر، مصنفین کی دنیا میں مصنف، ناقدوں کی صف میں ناقد ومبصر اور ماہرین تعلیم کی محفل میں ایک ماہر تعلیم تھے، اور جب کسی مجلس میں یہ سب جمع ہوتے تو وہ صدر محفل اور شمع انجمن ہوتے اور لوگ پروانہ وار انھیں گھیر لیتے، ان سے رجوع کرتے اور میر مجلس بناتے۔

اسی وجہ سے آپ انھیں حیدرآباد میں وزیر امور مذہبی کے منصب پر فائز پاتے ہیں، اور سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا مستقل سکریٹری بھی، وہ ایک طرف دارالمصنفین کے دائمی صدر بھی نظر آتے ہیں، اور بار بار ندوۃ العلماء کے اجلاس کے صدر بھی، بارہا اردو کانفرنسوں کی صدارت کے لیے منتخب ہوتے ہیں، مسلم یونیورسٹی انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دیتی ہے، اور شعبۂ دینیات کا اعزازی صدر بناتی ہے، کبھی آپ انھیں دیوبند کے قدیم دارالعلوم میں خطاب کرتے ہوئے پاتے ہیں اور ساتھ ہی کسی جدید یونیورسٹی جیسے جامعہ عثمانیہ، یا مسلم یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے سنتے ہیں، کبھی کسی ادبی محفل کی صدارت کرتے پاتے ہیں، اور کبھی کسی اورنٹیل کانفرنس کی، اس طرح ہم انھیں مختلف زبانوں اور ثقافتوں کا حامل بھی دیکھتے ہیں، وہ ایک طرف آگرہ کالج میں انگریزی کی تحصیل کرتے ہیں، اور دوسری طرف مولانا لطف اللہ صاحبؒ کے مدرسہ سے تکمیل بھی۔

افتادِ طبع کہیے یا خاندانی ماحول یا تعلیم وتربیت کا کرشمہ کہ انسانی کمالات میں سے

جس چیز نے ہر دور میں مجھے سب سے زیادہ گرویدہ کیا، وہ جامعیت اعتدال وتوازن اور وسیع ومتنوع ثقافت (کلچر) تھی، اور نواب صاحب مرحوم اس آخری دور میں (میرے محدود علم وتجربہ میں) اس کا مظہر کامل تھے، ان کے اس امتیاز کو محسوس کرنے اور سمجھنے کے لیے جیسے مواقع اس راقم کو میسر آئے، بلا کسی شائبۂ فخر وتعلی کے اس کے کہنے میں باک نہیں کہ وہ ہر ایک انسان کو آسانی سے میسر نہیں آتے، گھر میں اعیان ومشاہیر اہل کمال کے تذکرے اور حالات کا (نزہۃ الخواطر کی شکل میں) ایک وسیع ذخیرہ تھا، جس نے کم سے کم اس ملک کے عہد ماضی کی باکمال شخصیتوں سے متعارف ہونے کا موقع فراہم کیا، پھر ہندوستان سے باہر جانے اور ایسی مجلسوں میں بار بار شرکت کرنے کا اتفاق ہوا، اور ان میں سے بعض اداروں اور جماعتوں کی مستقل رکنیت کا شرف حاصل ہوا، جن میں عالم اسلام اور ممالک عربیہ کے چیدہ وبرگزیدہ اشخاص اور ممتاز اہل علم جمع ہوتے تھے، اور ان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، پھر بہت سے ایسے ملکوں میں قیام کا موقع ملا جو اسلامی علوم اور تہذیب وثقافت کا عرصۂ دراز سے مرکز چلے آرہے ہیں، اور ان کی مردم خیزی مسلم ہے، اس کے بعد امیر خسرو کے پراز اعتماد لہجہ ہی میں جس میں انھوں نے آفاق وانفس کی وسیع واقفیت کے بعد اپنے ممدوح ومحبوب کی انفرادیت کی شہادت دی ہے(۱) یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ نواب صاحب کی سی جامعیت اور وسیع ومتنوع ثقافت کا آدمی نظر نہیں پڑا۔

یہ جامعیت ان کی شخصیت کے لیے بڑا حجاب بن گئی، اور عہد ماضی میں بھی یہ سانحہ (جو کسی نقص نہیں کمال کا نتیجہ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کمال کا تاوان ہے) متعدد باکمال شخصیتوں کے ساتھ پیش آیا ہے، اور اس نے ان کے بہت سے کمالات پر پردہ ڈال دیا ہے، اور ان کے ساتھ اچھے اچھے صاحب نظر مؤرخ پورا انصاف نہیں کر سکے ہیں، معاصرین کی نگاہ اور مؤرخین کا قلم ہمیشہ سے اپنے ممدوح کو کسی ایک خانہ میں فٹ کرنے اور اہل کمال کی

---

(۱) امیر خسرو کا شعر ہے ۔

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام　　　بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

کسی ایک صف میں جگہ دینے کا عادی رہا ہے، لیکن جب ایک شخصیت مختلف خانوں میں جگہ پانے اور اہل کمال کی ہر صف کی زینت بننے کی اہلیت رکھتی ہے، تو بعض اوقات وہ حیرت کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں، اور اس کی صحیح جگہ اور مقام متعین کرنے سے قاصر رہتے ہیں، نواب صاحب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، ان کی امارت وریاست، ان کی عالمانہ حیثیت کے لیے حجاب بن گئی، اگر وہ خاندانی رئیس نہ ہوتے اور طبقہ امراء میں ان کا شمار نہ ہوتا تو ہندوستان کے نہایت ممتاز علماء، ادباء کی صف اول میں جگہ پاتے اسی طرح ان کی دینداری اور طبقۂ علماء میں ان کی شمولیت، ادب وشاعری کی بزم میں صدر نشینی سے ہمیشہ مانع رہی اور ادیبوں اور نقادوں اور نثر اردو کے اعلیٰ نمونوں کے انتخاب کرنے والوں نے ان کے اس قصور کو کبھی معاف نہیں کیا کہ وہ رندلا ابالی، پیشہ ور ادیب اور ایک فنی صاحب کمال اور صاحب قلم نہیں، اور ان کی دکان پر ایک ہی مال اور ایک ہی جنس نہیں پائی جاتی بلکہ ہر جوہر کمال کے طالب کو اپنی مراد ملتی ہے، بے ادبی کی ہزار بار معافی چاہتے ہوئے ادب کے ادنیٰ طالب علم اور شیدائی کی حیثیت سے یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ کسی ایک ملک کے ادب وزبان کا سوال نہیں، دنیا کی بہت سی زبانوں اور ادب کے علمبرداروں کی شروع سے یہ کمزوری رہی ہے کہ جو ادیبوں کی وردی پہن کر اور دین واخلاقیات سے رشتہ وناتہ توڑ کر ان کی بزم میں نہیں آیا اس کو انھوں نے یا تو محفل میں آنے کی اجازت نہیں دی یا بادل ناخواستہ جگہ دی، ادب جس کو تقلید وروایت پرستی سے سب سے زیادہ انکار اور لکیر کا فقیر بننے سے سب سے زیادہ عار ہونا چاہئے تھا، اور جس کے خمیر وسرشت میں جدت وجرأت، ذہانت، ذوق جمال اور ادب کی زبان میں ''حسن پرستی'' داخل ہے، اور جس کو بلبل کی طرح ہر گل کا شیدا اور ہر مظہر جمال وکمال کا شیفتہ وفریفتہ ہونا چاہئے، اکثر موقعوں پر روایت پرست، تعصب کا شکار اور رسم ورواج میں گرفتار نظر آتا ہے، ادب وانشا کی جو تعریف استاذ اول...... نے کر دی اور اس کے جو حدود وخطوط کھینچ دیئے بہت کم ادیبوں اور نقادوں کو اس سے سرتابی کرنے اور اس کے دائرہ سے باہر قدم رکھنے کی جرأت ہوتی ہے،

اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر بعد میں آنے والا اپنے پیشرو کے قدم پر قدم رکھتا ہوا اپنا سفر طے کرتا ہے، اورادبی نمونہ کے ذخیرہ میں کسی اضافہ، کسی تغیراور کسی ترمیم کی جرأت نہیں کرتا، ادب وانشا کی چند مثالی شخصیتیں منتخب کرلی جاتی ہیں، اور ہر آنے والا اسی سبق کو دہراتا ہے، اور اقبال کا یہ مصرعہ اس دبستان ادب پر پوری طرح صادق آتا ہے ع

کند مکتب رہ طے کردہ راطے

اگر نواب صاحب کا یہ گناہ ہوتا کہ وہ ایک عالم دین، صورتاً وسیرتاً متشرع ثقہ وسنجیدہ بزرگ تھے، اور اسی کے ساتھ یہ کہ انھوں نے اپنی دوکان کمال پر ادب اردو کا سائن بورڈ نہیں لگایا تو وہ ہندوستان کے صاحب طرز انشا پردازوں کی صف میں جگہ پاتے اور ان کے خطوط ومضامین کے بہت سے ٹکڑے اردو ادب کے اعلیٰ نمونوں میں شمار کیے جاتے، اور شاید بعض اہل نظر یہ کہنے کی جرأت کرتے کہ غالب کی ''عود ہندی'' اور ''اردوے معلیٰ'' کے بعد ان کی برجستگی وبے ساختگی کسی نے اپنے خطوط میں اس سے زیادہ نہیں دکھائی، لیکن اب اس ناانصافی پر مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کی زبان میں جن کے وہ بہت بڑے معتقد ومقلد تھے، ان الفاظ میں شکوہ سنج پائے جاتے ہیں۔

بہ لوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

یہی معاملہ ان کی فارسی ادب وزبان کی اداشناسی اور نقد سخن کا ہے کہ میرے محدود علم میں علامہ شبلی اور خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی کے بعد ان کا جیسا فارسی داں، صاحب ذوق ونقاد نہیں گزرا، لیکن اس وصف پر ان کے دوسرے کمالات نے پردہ ڈالا اور بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہونے پایا۔

پھر اس سب سے بڑھ کر وہ ایک دردآشنا، صاحب دل، روشن ضمیر اور صاحب باطن شخص تھے، جس کا ثبوت ان کی زندگی کی بے نظیر استقامت اور ان کے سفرنامۂ حجاز کی سطر سطر سے ملتا ہے، اور جس کی شہادت ان کے زمانہ کے بعض ممتاز ترین اہل نظر اور

اصحاب باطن نے دی(۱) لیکن ان کی یہی جامعیت، امارت وصدر الصدوری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے کاموں میں شرکت اردوادب وزبان کے جلسوں کی صدارت، ان کی انگریزی دانی اور جدید تعلیم یافتہ، آزاد خیال طبقہ میں مقبولیت واحترام ان کے اس صفت کے لیے ایسا حجاب بن گیا کہ بہت سے لوگ ان کو طبقۂ امراء ہی کا فرد سمجھتے رہے، اور عجب نہیں کہ بعض متشددین نے ان پر نیچریت کا فتویٰ لگادیا ہو، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کا عمل شیخ سعدی کی تعلیم ع

درویش صفت باش وکلاہ تتری دار

پر تھا، مولانا جامی نے اپنے زمانہ کے ایک ایسے ہی درویش سیرت، امیر صورت، وزیر مملکت خواجہ عماد الدین گیلانی معروف بہ محمود گاواں وزیر اعظم سلطنت بہمنیہ کے متعلق جو کہا تھا، نواب صاحب پر پورے طور سے صادق آتا ہے۔

ہم جہاں را خواجہ وہم فقر را دیباچہ اوست

آیت الفقر ولکن تحت أستار الغنا

پھر ان کی زندگی کا خاص جوہر ان کی وہ وسیع بوقلموں وگوناگوں ثقافت تھی، جس میں وہ فرد فرید تھے، ہندوستان میں اسلامی عقائد وتعلیمات کے فیض، تصوف کے پیدا کیے ہوئے درد ومحبت اور وسعت نظر، ہندوستان کے خمیر کی آشناپرستی اور وفاشعاری، رنگ وآہنگ سے اثر پذیری، ترکوں کی مہم جوئی وسپہ گیری، افغانوں کی شجاعت وشرافت، مغلوں کے ذوق جمال وقوتِ ارادی، عجم کے حسن طبیعت اور عرب کے سوز دروں سب سے مل کر ایک خاص تہذیب اور ایک خاص ثقافت وجود میں آئی جس کا نمونہ طبقۂ امراء میں عبدالرحیم خانِ خاناں، شعراء میں امیر خسرو اہل دل میں خواجہ نظام الدین اولیاء اور علماء میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نظر آتے ہیں، اس تہذیب وثقافت میں شکوہ بھی ہے، اور تواضع بھی، حلاوت بھی ہے، اور مروت بھی، گہرائی بھی اور گیرائی بھی، صلابت بھی ہے، اور رقت

(۱) میں نے خود زمانہ حاضر کے مشہور عارف وبزرگ مولانا محمد الیاس صاحبؒ دہلوی سے سنا کہ ''مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی اہل اللہ میں سے ہیں۔

بھی، استقامت بھی ہے، اور رواداری بھی، اس کی قلمرو میں علوم شریعت وحکمت بھی ہیں، اور ادب وشاعری بھی، فقر ودرویشی بھی ہے، اور نفاست وذوق لطیف بھی، اس کی دلچسپی کے میدان قلعے بھی ہیں، اور کتب خانے بھی، مدرسے بھی ہیں، اور خانقاہیں بھی، تحقیق وتصنیف کے حلقے بھی ہیں، اور مشاعرے بھی، اس میں ثقاہت بھی ہے، اور ظرافت بھی، سخت جانی بھی ہے، اور سبک روحی بھی، اس کے اظہار خیال اور اظہار کمال کا ذریعہ عربی بھی ہے اور فارسی بھی، اردو بھی ہے، اور ہندی بھی، یہ وہ تہذیب وثقافت ہے جس نے فاتحین اسلام کے داخلۂ ہند کے بعد سے اپنا کام کرنا شروع کیا، پھر شاہجہاں وعالمگیر کے عہد میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی، یہ وہ ہندوستانی تہذیب وثقافت ہے، جو نہ خالص ہندوستانی ہے، نہ خالص ایرانی، نہ عربی ہے نہ عجمی، بلکہ ان سب کے محاسن کا مجموعہ اور تہذیب وتمدن کے میدان میں ایک نیا تجربہ، یہی تہذیب وثقافت تھی جس کے آخری نمونوں سے ایک نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے، اور جو غالبًا اپنی پختگی توازن اور جامعیت کے لحاظ سے ان ہی پر ختم ہوگئی۔

نواب صاحب مشرقی روایات اور قدیم تہذیب ووضعداری کا نمونہ تھے، اس زمانہ کے بزرگ اور شرفاء جہاں ایک دو بار ٹھہر جاتے اور جس دوست یا عزیز کو میزبانی کا موقع دیتے، پھر شدید مجبوری یا اہم مصلحت کے ماسوا بالعموم اسی کے یہاں قیام کرتے، نواب صاحب کا معمول لکھنؤ میں منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری (فرزند منشی امتیاز علی صاحب وزیر بھوپال) کی کوٹھی واقع خیالی گنج میں قیام کا تھا، میرے علم میں اس معمول میں شاید کبھی فرق آیا ہو، منشی صاحب ان کے پیر بھائی بھی تھے، ندوۃ العلماء کی خدمت، رکنیت اور حمایت وتائید میں قدیم سے رفیق وشریک اور قدیم تہذیب ووضعداری کا نمونہ اور اودھ کے شرفاء ورؤساء کی بہترین خصوصیات کے نمائندہ تھے، اس طبعی مناسبت، ہم خیالی وہم مذاقی اور نسبت کے اتحاد نے اس انتخاب کو اور زیادہ موزوں اور اس قیام کو اور زیادہ خوشگوار بنادیا تھا، نواب صاحب نے منشی صاحب کی وفات پر جو مضمون لکھا ہے، اور جو "مقالات

شروانی'' کے مجموعہ میں شامل ہے، اس سے مذاق ومزاج کے اس اتحاد کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے، جوان...... دونوں دوستوں اور بزرگوں میں پایا جاتا تھا۔

لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں یہ معمول ہوگیا تھا کہ میرے برادر معظم (ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحبؒ) جو ندوۃ العلماء کے مجلس انتظامی کے رکن اور بعد میں ناظم بھی منتخب ہوئے، ایک بار ضرور مجھے اپنے ساتھ لے جاتے، میں سلام کرتا، نواب صاحب بڑی شفقت سے سر پر ہاتھ رکھتے، دعا دیتے، تعلیم کا حال پوچھتے اور میں کچھ دیر ٹھہر کر سلام کر کے رخصت ہوتا، اکثر تشریف آوری کے موقع پر کم سے کم ایک بار دارالعلوم تشریف لاتے، درجوں کا معائنہ کرتے اور اکثر طلباء کو خطاب بھی، تقریر کا موضوع اکثر علوم کی تحصیل میں بلند ہمتی، محنت وجفاکشی اور ''علمائے سلف'' کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب وتشویق ہوتا، جوان کا عزیز ولذیذ موضوع تھا، اور جس پر ان کی مستقل تصنیف شائع ہوکر طلبائے مدارس اور شائقین علم کے لیے مشعل راہ بنی ہوئی تھی، اس سے زیادہ مجھے ان کو قریب سے دیکھنے اوران کے صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

۱۹۳۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں جو شروع سے مسجد سے خالی تھا، مولانا مسعود علی صاحب ندوی کی سعی جمیل سے ایک حسین وجمیل مسجد پایۂ تکمیل کو پہنچی، شعبان کا مہینہ تھا، اور دارالعلوم میں تعطیل ہونے والی تھی، مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں ایک جشن مسرت منایا گیا، مسجد کا عملی افتتاح نواب صدر یار جنگ نے فرمایا، انھوں نے جمعہ کی نماز کی امامت فرمائی اور نماز کے بعد موثر اور دلپذیر وعظ کہا، اس مبارک تقریب کے سلسلہ میں ان کا کئی روز لکھنؤ قیام رہا، مجھے یاد ہے کہ ایک روز میں اتفاقاً مولانا مسعود علی صاحب کے اس خس پوش بنگلہ یا ''کٹیا'' کے سامنے سے گزرا جو انھوں نے مسجد کی تعمیر کی نگرانی اور اپنے قیام کے لیے مسجد کے صدر دروازے کے بالمقابل راستہ سے چند قدم پیچھے ہٹ کر ڈال رکھی تھی، اور جو اپنی خوشنمائی، صفائی اور مذاق سلیم میں امراء کے اچھے اچھے کاشانوں سے آنکھیں ملاتی تھی، میں نے دیکھا کہ نواب صدر یار جنگ، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن

گیلانی، مولانا عبدالباری ندوی اور غالباً مولانا عبدالماجد دریابادی بیٹھے ہوئے ہیں، شاید کسی جھونپڑے میں اقلیم علم وادب کی اتنی باوقار اور سرآمد روزگار شخصیتیں ایک وقت میں اس آسانی سے جمع ہوئی ہوں، اس وقت یہ ''کاشانہ'' کہکشاں بنا ہوا تھا، جس میں آسمان علم وادب کے کئی روشن ستارے جلوہ افروز تھے، نواب صاحب نے مجھے گزرتے ہوئے دیکھا تو آواز دے کر بلالیا اور بڑی شفقت سے اپنے پاس بٹھالیا، پھر فرمایا کہ میں نے جب ''گل رعنا'' میں نواب سید نورالحسن خاں مرحوم کا تذکرہ پڑھا، جو خواجہ میر درد کے تذکرہ کے-- ایک حاشیہ میں ہے، تو مولانا مرحوم (مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مصنف ''گل رعنا'') کے ان کے متعلق یہ الفاظ پڑھ کر بڑا رشک آیا کہ مجھے ان کی خدمت میں پندرہ سال سے نیاز حاصل ہے لیکن جب میں نے اپنا حال پڑھا اور اس میں دیکھا کہ میرے ان کے تعلق کی مدت تیس برس سے ہے تو رشک جاتا رہا، میری آنکھوں میں وہ نقشہ ابھی تک گھوم رہا ہے، اب اس پایہ کے فضلاء، اہل کمال ایک جگہ پر کہاں نظر آئیں گے۔

علی گڑھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جبلی کے موقع پر جو ۱۹۳۶ء میں ہوئی تھی، میں بھی دارالعلوم کے چند اساتذہ کے ساتھ شرکت کے لیے گیا تھا، نوعمری کا تقاضا کہیے یا شرم وحجاب کا نتیجہ کہ میں پہلے ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا اور نہ اپنی آمد کی اطلاع دی، اس وقت مولانا ابوبکر محمد شیث فاروقی صاحب مسلم یونیورسٹی کے ناظم دینیات تھے، ان سے ہمارے خاندان کے تین پشتوں کے تعلقات تھے، ان کے دادا مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری، حضرت سید احمد شہیدؒ کے مرید وخلیفہ تھے، ان کے صاحبزادے اور مولانا ابوبکر صاحب کے والد مولانا ابوالخیر محمد مکی صاحب میرے نانا حضرت سید شاہ ضیاء النبی صاحب کے محبوب مریدوں میں تھے، خود مولانا ابوبکر صاحب کا بھی میرے نانا صاحب سے بیعت کا تعلق تھا، انھیں قدیم تعلقات کی بنا پر میں نے ان کے یہاں قیام کیا، نواب صاحب کی مشغولیت کو دیکھتے ہوئے اس کی ہمت نہ ہوئی کہ ان سے ملاقات کروں، اتفاق سے ایک دن کسی ہال سے لکچر سن کر نکل رہا تھا، نواب صاحب کا سامنا ہوگیا، میں نے سلام عرض کیا

تو غالباً میری تنبیہ کے لیے تجاہل عارفانہ کے انداز میں فرمایا کہ کون؟ میں نے اپنا نام عرض کیا، فرمایا کہاں ٹھہرے ہو؟ عرض کیا مولانا ابوبکر صاحب کے یہاں، فرمایا کون مولانا ابوبکر؟ میں نے حیرت کے ساتھ جواب دیا کہ مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب ناظم دینیات، فرمایا کہ تم کو معلوم ہے کہ یہاں ایک شروانی بھی رہتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں، فرمایا کہ اس کے یہاں کیوں نہیں ٹھہرے؟ میں نے عرض کیا کہ غلطی ہوئی، فرمایا کہ مانتے ہو کہ غلطی ہوئی، میں نے کہا جی ہاں! فرمایا کب آؤ گے؟ میں نے عرض کیا کہ کل صبح ہی، اس دلچسپ مکالمہ پر یہ گفتگو ختم ہوئی، جس سے زیادہ مجھے اپنی غلطی محسوس کرانے کا اور کوئی شائستہ طریقہ نہ تھا، میں اگلے ہی روز اپنا سامان لے کر حبیب منزل پہنچ گیا، اور اس کوتاہی کی تلافی کی۔

۱۹۳۸ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا انچاسواں اجلاس پٹنہ میں ہوا، مولوی فضل الحق صاحب جو اس وقت بنگال کے چیف منسٹر تھے، اور شیر بنگال کے نام سے مشہور تھے، جلسہ کے صدر منتخب تھے، اس اجلاس میں ڈاکٹر ضیاء الدین...... مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا احمد سعید صاحب دہلوی اور بڑے بڑے عمائد و مشاہیر موجود تھے، اس وقت مسلمانوں کی تمام مجالس اور اجتماعات پر خواہ وہ علمی اور ادبی ہوں، سیاسی ذوق کی فضا چھائی ہوئی تھی، اور مسلمانوں کو حقیقتاً سیاست کے علاوہ کسی سنجیدہ موضوع اور تعمیری کام سے حقیقی دلچسپی نہ تھی، اس کانفرنس میں جو مناظر دیکھے ان کے تفصیل سے ذکر کرنے کا یہ محل نہیں، لیکن نواب صاحب کی موجودگی اور ان کا وقار اس ذوق کو اپنے حدود سے آگے بڑھنے اور ابتذال اور اشتعال کی سرحد میں داخل ہونے سے مانع تھا۔

اسی کانفرنس کے ایام میں میرے مخلص اور بزرگ دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے جو خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانہ بانکی پور کے ان دنوں کٹیلاگر (مرتب فہرست) تھے ایک دن مجھ سے کہا کہ آج نواب صدر یار جنگ کتب خانہ دیکھنے آئیں گے، کتب خانہ کی سیر کا اس سے بہتر موقع نہیں، ان کے سامنے کتب خانہ کا کلیجہ نکال کر رکھ دیا جائے گا، اور وہ نوادر و مخطوطات پیش کئے جائیں گے جو مشکل سے کسی زائر کے

سامنے لائے جاتے ہیں، میں نے اس موقع کو غنیمت بلکہ نعمت سمجھا اوران کی معیت میں وہاں کا رخ کیا، ظہر عصر کے درمیان کا وقت تھا، کتب خانہ کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ نواب صاحب کرسی پر تشریف رکھتے ہیں، ایک کرسی پر مولانا سید سلیمان ندوی، دوسری کرسی پر مولانا مناظر احسن گیلانی رونق افروز ہیں، دائیں بائیں کی دو کرسیاں خالی تھیں، نواب صاحب نے دائیں طرف کی کرسی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا، سید علی تم یہاں آؤ، وہ ہمیشہ مجھے اسی طرح خطاب کرتے تھے، بائیں طرف اشارہ کرکے مولانا مسعود عالم صاحب سے فرمایا، مسعود عالم یہاں بیٹھو، ولی الدین صاحب (بانی کتب خانہ کے فرزند) کتابیں انتخاب کرکے لارہے تھے، نواب صاحب ملاحظہ بھی فرماتے تھے، اور تبصرہ بھی، اور گراں قدر معلومات کا اضافہ بھی، اور کچھ زیادہ تو یاد نہیں ''دیوان حافظ'' کا ایک نسخہ لایا گیا جو جہانگیر کے مطالعہ میں رہا تھا، اور وہ اس میں فال دیکھتا تھا، ایک جگہ حاشیہ پر لکھا تھا کہ ''جہاں پناہ (اکبر) نے طلب فرمایا، میں نے فال دیکھی تو یہ شعر نکلا، یہ تاریخی موقع اب پھر کہاں نصیب ہوگا کہ ایک منتخب روزگار کتب خانہ تین منتخب روزگار فضلاء اور اہل نظر کی موجودگی میں دیکھنے کا موقع مل رہا تھا، جواہرات پیش ہورہے تھے، اور جوہری پرکھ پرکھ کر بتا رہا تھا کہ یہ کس معدن اور کس خزانہ شاہی کے ہیں، اور ان کی کیا قدر و قیمت ہے، کہنے والے نے سچ کہا ہے ع

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

تھوڑی دیر بعد نماز عصر کا وقت ہوگیا، باہر چمن میں جانمازیں بچھادی گئیں، آج تک اس واقعہ پر حیرت اور اس کو بزرگوں کی ایک ادا پر محمول نہ کیا جائے تو اور کیا کہ ان دونوں اساطین علم وفضل کی موجودگی میں مجھ بے ہنر کی طرف جو عمر و علم ہر چیز میں چھوٹا تھا، دیکھ کر فرمایا، سید علی نماز پڑھاؤ، تعمیل کے سوا چارہ ہی کیا تھا ''الأمر فوق الأدب''۔

تقسیم کے بعد جب نواب صاحب کو پے در پے ایسے حوادث پیش آئے کہ......

طبیعت کی شگفتگی اور صحت کی رعنائی رخصت ہوگئی......ایک بار علی گڑھ جانا ہوا، غالباً ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا، اور یونین میں میرا کوئی پروگرام، اس

کام سے فارغ ہوکر غالباً خود انھیں کے اشارہ سے حبیب منزل منتقل ہوگیا، خواہرزادہ عزیزی مولوی محمد رابع ندوی سلّمہٗ میرے ساتھ تھے، میں نے دیکھا کہ دل ودماغ دونوں پر حوادث روزگار اور انقلاب زمانہ کا گہرا اثر ہے، لیکن دو موضوع ایسے تھے، جن پر کوئی تغیر محسوس نہیں ہوتا تھا، وہی تازگی اور شگفتگی، وہی تفصیلات اور جزئیات، ایک پیرومرشد حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ اور محبوب استاد مولانا لطف اللہ صاحب کا تذکرہ، دوسرے کتب خانہ کا ذکر، یہ وہ زمانہ تھا جب مخدومی نواب مولوی عبید الرحمٰن خاں صاحب شروانی لاہور گئے ہوئے تھے، جہاں صاحبزادۂ گرامی جناب ڈاکٹر مولوی ریاض الرحمٰن خاں پہلے سے مقیم تھے، اوران کی آمد کا انتظار تھا، بار بار فرماتے تھے کہ مولوی عبید الرحمٰن خاں آجائیں تو تم کو حبیب گنج بھیجوں اور تم وہاں کتب خانہ دیکھو، لیکن افسوس ہے کہ اس کی نوبت نہ آئی، اس کے بعد ایک بار اوران کی زندگی میں علی گڑھ حاضری ہوئی، مجھے اور مولوی اکرام اللہ خاں صاحب کو کھانے پر مدعو فرمایا، اس صحبت میں بار بار ندوہ کے سالانہ جلسہ کا تذکرہ فرماتے رہے، اور اپنی اس تمنا کا اظہار کہ ایک باران کی زندگی میں پھر ندوہ کا جلسہ آب وتاب کے ساتھ ہوتا، اور وہ اس میں شرکت فرماتے، لیکن افسوس ہے کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی، جب ندوہ کا پچاسی سالہ تعلیمی جشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو نواب صاحب بے اختیار یاد آئے کہ وہ اپنے اور اپنے دوستوں کے اس لگائے ہوئے باغ کی بہار دیکھ کر کیسے شادماں ہوتے لیکن ع

یک حرف کاشکیست کہ صد جا نوشتہ ایم

مجھے ان کے مکتوب الیہ بننے کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب رسالہ ''الندوہ'' کا (جس کی لوح پر کبھی ان کے محبوب ومحترم بزرگ دوست علامہ شبلی نعمانی کے نام گرامی کے ساتھ ان کا نام ہوتا تھا) مولانا سید سلیمان ندوی کے حکم سے سہ بارہ اجراء ہوا اور اس کی ادارت وترتیب کا کام میرے اور صدیق محترم مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی کے سپرد ہوا، نواب صاحب نے اس سلسلہ میں مجھ نیاز مند کو کئی بار شرف مخاطبت بخشا، ان کے اس سلسلہ کے مکاتیب کو حرز جاں بنا کر رکھا ہے، ایک ادبی تبرک اور ایک عزیز وقابل فخر یادگار کے طور پر یہاں چند مکاتیب درج کیے جاتے ہیں:

۱۷ارمحرم الحرام ۱۳۵۹ھ

گرامی قدر سلمہٗ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عزیزی مولوی سید سلیمان ندوی صاحب نے ''الندوہ'' میں ندوۃ العلماء کی تاریخ کے پہلے صفحہ پر مضمون لکھ کر اگلی صحبتوں کی یاد تازہ کر دی ہے، وہ یاد جو اپنے اندر ایک عالم حسرت رکھتی ہے۔

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

(خواجہ حالی مرحوم)

اسی مضمون میں جتایا ہے کہ ''اس سلسلہ کا رابطہ ایک روحانی مرکز سے بندھا تھا جس کا نام نامی حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب مجددی گنج مرادآبادی تھا...... مشرق ومغرب کے یہی دونوں مطلع تھے، جن سے ندوۃ العلماء کا آفتاب طلوع ہوا''۔

مغربی مطلع کا ذکر مولوی صاحب کے مضمون میں بہت کچھ آچکا، مشرقی مطلع کا ذکر میں اپنی ایک پرانی تحریر کے ذریعہ سے سناتا ہوں جو آج سے ۵۴ برس پہلے لکھی گئی تھی، میں اس زمانہ میں آگرہ کالج میں پڑھ رہا تھا، وہیں سے گنج مرادآباد...... حاضر ہوا تھا، ۲۲ ر رجب المرجب کو حاضر خدمت بابرکت ہوا، ۲۵ ر رجب کو آگرہ واپس جا کر یہ یادداشت لکھی تھی۔

ایک اور بات کہنی تھی، جب میں نے اپنے یہاں کی قلمی کتابوں کی فہرست ختم کی تو اس کی خوشی میں ایک پرانا مضمون حاضری پانی پت پر نقل کر کے ''معارف'' میں شائع ہونے کے لیے بھیجا تھا، جو شائع ہوا اور موثر ٹھہرا۔

اب ''الندوہ'' کے دوبارہ اجراء کی خوشی میں یہ ایک قدیم تر تحریر آپ کو بھیج رہا ہوں، پسند ہو تو ''الندوہ'' میں شائع کیجیے، رسید آئے تو اطمینان ہو جائے گا۔

حبیب الرحمٰن

۲۱ر ستمبر ۱۹۴۰ء

گرامی قدر سلّمہٗ

السلام علیکم

کام کر رہا ہوں انشاء اللہ ختم ہونے پر پہنچے گا، اکتوبر سے سلسلہ شروع کر دینا، زود قلم نہیں ہوں، غور کرنا پڑتا ہے۔

حبیب الرحمٰن

گرامی قدر سلّمہٗ

السلام علیکم

مقدس مقام میں صیام مبارک

خط آیا، مقالہ پہنچ کر پسند ہوا، اس سے اطمینان ہے، مقالہ میں ان الفاظ کے بعد "میرے دادا صاحب محمد خاں زماں صاحب نے" یہ الفاظ بڑھا دیئے جائیں (جن کو شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیعت تھی)

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج، ۵ر رمضان المبارک ۱۳۵۹ھ

گرامی قدر سلّمہٗ

السلام علیکم

"الندوہ" کا خیال دل و دماغ دونوں میں ہے، موقع کا انتظار ہے، اس زمانہ میں دارالمصنفین کی خدمت جاری رہی، خطوط نج کے ہیں، کاتب سے اجازت کی ضرورت ہے، یہی میں نے مولوی سید سلیمان سے کہا ہے، الحمدللہ بخیریت ہوں، آپ سب کی خیریت کا آرزومند ہوں۔

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج، ۲ر شعبان ۱۳۶۰ھ

انھیں اپنے بچپن ہی سے جاننے میں اس بات کا بھی دخل ہے کہ وہ میرے والد ماجد

مولانا سید عبدالحیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء کے دوست اور دارالعلوم کی تاسیس میں ان کے شریک ورفیق تھے، پھراس کے ساتھ ہی اوپس زمانہ حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ گنج مرادآبادی سے تعلق میں بھی دونوں حضرات ساتھ تھے، مجھے جب دیکھتے تو سینہ سے لگا لیتے اور اولاد کا سا برتاؤ کرتے۔

"الندوہ" کی ادارت کے زمانہ میں ادارہ کی طرف سے ہندوستانی اہل علم وفکر سے ان کی محسن کتابوں کے بارے میں سوال نامہ جاری کیا گیا، جس میں ان سے ان کی کتابوں کے بارے میں پوچھا گیا تھا، جن کا ان کی ذہن سازی وثقافت اور تعمیر سیرت پر خاص اثر رہا ہے، چنانچہ سب سے پہلے مولانا شروانی سے درخواست کی کہ وہ اپنے مقالہ سے اس سلسلہ کا افتتاح کریں، آپ نے میری فرمائش کو شرف قبول بخشا اور ایک قیمتی مقالہ عنایت فرمایا جوان کے وسیع ومتنوع مطالعہ، کتابی دنیا کی طویل سیاحت، سلامت فکر وصفائے ذہن کا آئینہ دار تھا، یہ مقالات کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے ہیں۔(۱)

مولانا شروانی گزشتہ ثقافت وتہذیب کے کاروان کے آخری مسافر تھے، اور اللہ نے انھیں اپنے ساتھیوں سے اس لیے روکے رکھا تھا تاکہ عصر حاضر کے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھالیں اوران کے پیکر مثالی سے عہد ماضی کے باکمالوں جیسے صاحب بن عباد، امیر ابوالفضل میکالی، مسند عالی عبدالعزیز آصف خاں وزیر گجرات اور خواجہ عماد الدین محمود گاواں گیلانی کی شخصیتوں کا اندازہ کرلیں، اوران کے بارے میں تاریخ کی روایات کی تصدیق کرلیں، پھر جب ان کے اوران کے زمانے کے درمیان دوری بڑھنے لگی اوراس کے اجنبی اخلاق وثقافت سامنے آنے لگے، اورانھیں بھی یہ غریب الوطنی کھلنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں یوم جمعہ ۱۱ر اگست ۱۹۵۰ء کو اپنے پاس بلالیا اوراپنے قدیم دوستوں کے پاس پہنچا دیا جن کو وہ بکثرت یاد کرتے تھے، اور وہ علمی اور دینی زندگی میں ایسا خلا چھوڑ گئے جس کا پُر ہونا قریبی مدت میں نظر نہیں آتا۔

□□□

(۱) یہ مجموعہ "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" کے نام سے "مکتبہ دارالعلوم" کی طرف سے شائع ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد

میرے ذہنی شعور اور پڑھنے لکھنے کا آغاز کا زمانہ وہ ہے جب مولانا ابوالکلام آزاد کا ہندوستان میں طوطی بولتا تھا، اردو کا یہ پرانا محاورہ کسی اور مقرر، مصنف یا ادیب وشاعر کے متعلق اتنا صحیح اور حسب حال نہیں جتنا مولانا آزاد کے متعلق ہے، علمی وادبی ذوق رکھنے والوں میں شاید کوئی ایسا آدمی ہو جو ان کی خطابت وزورِ قلم کا قائل اور ''الہلال'' کے سحر حلال سے مسحور نہ ہوا ہو، میری جس ماحول میں پرورش ہوئی، وہ ان کے افکار وخیالات سے پورے طور سے ہم آہنگ تھا، اور ان میں ایسے متعدد اشخاص تھے، جنھوں نے مولانا کو آغاز شباب میں اس وقت دیکھا تھا، جب وہ رسالہ ''الندوہ'' کے معاون مدیر کی حیثیت سے پرانے ندوہ میں (جو گولہ گنج کی اس عمارت میں تھا، جس کو اب خاتون منزل کہتے ہیں، اور جو مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم لکھنؤ کی قیام گاہ رہی ہے) مقیم تھے، اور علامہ شبلی کی علمی صحبتوں سے استفادہ کرتے تھے۔

ہمارے یہ بزرگ عزیز مولانا کے کچھ ایسے معتقد نہ تھے، لیکن وہ مولانا کی غیر معمولی ذہانت، حاضر دماغی، انشاپردازی اور اس کے ساتھ ان کی خودداری اور ظرافت ولطافت کے قصے اس طرح مزے لے لے کر سناتے تھے کہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہم یونان کے حکماء وفلاسفہ اور الف لیلہ کی خیالی شخصیتوں کے قصے سن رہے ہیں، ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ وہ مولانا کو معیاری اور مثالی انسان سمجھتے ہیں، جو ہر طرح کے نقص یا تنقید سے بالاتر ہو بلکہ کچھ معاصرانہ تنقیدی اشارے بھی ہوتے تھے، لیکن ان سب کا ان کی غیر معمولی ذہانت، خداداد حافظہ اور خودداری وخوداعتمادی کے نمایاں وصف پر اتفاق تھا۔

بعد میں حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی متعدد مجلسوں میں غیر معمولی ذہانت، اخذ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت، پھر اس کو بہتر سے بہتر طریقہ پر پیش کرنے اور اپنے معلومات سے کام لینے کی غیر معمولی قابلیت کے واقعات سنے۔

بارہا ایسا ہوا کہ علامہ شبلی نے اپنے ارشد تلامذہ سے کسی موضوع پر لکھنے کی فرمائش کی اور انھوں نے مواد و معلومات کا ایک ذخیرہ رکھ دیا، ان کے بعض لائق ترین تلامذہ نے مضامین لکھ کر پیش کئے، لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئے، بعض مرتبہ کئی بار یہ کوشش کی گئی اور ناکام رہی، مولانا آزاد کسی گوشہ میں بیٹھے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے، قریب آئے اور پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ علامہ شبلی نے مختصر تقریر کی، وہ اسی وقت بیٹھ گئے، اور مضمون لکھ کر پیش کیا، مولانا نے فرمایا، بس میں یہی چاہتا تھا۔

یہ مضامین بعض اوقات بڑے نازک اور دقیق کلامی و فلسفیانہ مباحث پر ہوتے تھے، حاضرین مجلس کو یقین ہوتا تھا کہ اس موقع پر اس نوجوان انشاپرداز کا جس نے اپنی طاقت لسانی سے سب پر اپنے علم و مطالعہ کا سکہ بٹھا رکھا ہے، بھرم جاتا رہے گا، اور اس کی علمی کم مائیگی کا راز فاش ہو جائے گا، لیکن معاملہ الٹا ہوا، اور وہ ہر مرتبہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔

ندوہ کے تعلق نیز خاندانی تعارف کی بنا پر وہ میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ مرحوم سے ملنے مکان پر ضرور کئی بار آئے ہوں گے، مجھے ان کے قلمی ذخیرے اور کاغذات میں ایک ویزیٹنگ کارڈ ملا جس پر حذق الملک حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں کے دستخط ہیں، والد صاحب کے نام ان کے ایک سے زائد خط ہمارے خاندانی مرقع خطوط کی زینت ہیں، تعارف و تعلق کی ایک وجہ یہ تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی جوانی کے آغاز میں شمس العلماء مولانا محمد یوسف رنجور عظیم آبادی کی جو کلکتہ میں مقیم تھے، عرصہ تک صحبت میں رہے اور استفادہ کیا، وہ خاندان صادق پور کے چشم و چراغ تھے، جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے مخلص و صادق اور وفادار ترین معتقدوں میں تھا، اور جس کا ان قربانیوں میں سب سے بڑا حصہ ہے، جو سید صاحبؒ کی دعوت و تحریک کے

مجاہدوں کو انگریزی دور اقتدار میں دینی پڑیں۔

جب ان صادقین صادق پور کا پہلا تذکرہ اردو میں "الدر المنثور" یا تذکرہ صادقہ کے نام سے شائع ہوا، جو مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری اسیر انڈمان کے قلم سے تھا تو اس پر مقدمہ ایک نوجوان، گم نام اہل قلم محی الدین ابوالکلام احمد کے قلم سے تھا، جس میں قدیم طرز تحریر کا رنگ ہے، اور اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کا لکھنے والا کسی دن ہندوستان کے علمی وادبی مطلع پر ہلال عید بن کر اس طرح چمکے گا کہ سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جائیں گی۔

لیکن مجھے ان کا گھر پر آنا یاد نہیں، اس لیے کہ والد صاحب کا انتقال ۲ رفروری ۱۹۲۳ء کو ہوا، اس وقت میری عمر ساڑھے نو سال کی تھی، اس سے پہلے کا زمانہ جب وہ ندوہ کے قیام میں یا خلافت تحریک کے آغاز میں کبھی ملنے آئے ہوں گے میرے شعور سے پہلے کا زمانہ ہے۔

اس وقت جہاں تک یاد ہے میں نے ان کی سب سے پہلے گنگا پرشاد میموریل ہال کے ایک جلسہ میں زیارت کی، جلسہ کا مقصد ہندو مسلم اتحاد کی دعوت تھی، اور جہاں تک یاد آتا ہے، اس جلسہ میں مولانا محمد علی بھی موجود تھے، اور انھوں نے بھی خطاب کیا تھا، جلسہ کے دوران مغرب کا وقت آگیا، مولانا ہال کے شمالی گوشہ میں جہاں نماز کا انتظام تھا، تشریف لے گئے، ہم سب لوگوں نے ان کی اقتداء میں نماز پڑھی اور میں نے سب سے پہلے ان کو قریب سے دیکھا، بلند و بالا قد و قامت جس کو "سرو آزاد" کہنا ہر طرح موزوں ہوگا، کتابی چہرہ جس میں سرخی جھلکتی ہوئی، آنکھیں روشن و فراخ متبسم بلکہ متکلم، پیشانی سے خود اعتمادی اور بلند طالعی نمایاں، لباس خالص دہلی و لکھنؤ کے شرفاء بلکہ روساء کا سا سادہ لیکن حسن مذاق اور نستعلیقی ہر چیز سے عیاں، ٹوپی ذرا بلند جس میں ان کی انفرادیت جوان کی ذات کا جوہر بن گئی تھی، نمایاں، پاؤں میں سلیم شاہی جوتا، یہ تھے، مولانا ابوالکلام آزاد جن کو میں نے پہلی بار دیکھا، ان کی تقریر کا ایک حصہ ذہن میں محفوظ رہ گیا، انھوں نے انسانی مساوات و اخوت کا اسلامی نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے سنن ابوداؤد کی ایک حدیث کا حوالہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر شب میں اپنے رب سے جو سرگوشیاں اور دعا

ومناجات کرتے ہوئے سنا گیا اس میں ایک فقرہ یہ تھا "انا شھید أن العباد کلھم إخوۃ" میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سب بندے (انسان) بھائی بھائی ہیں۔

''الہلال'' کا فائل جواب ایک نایاب تحفہ ہے، اس وقت لکھنؤ میں بھی ہمارے گھر میں موجود تھا اور رائے بریلی میں دیہاتی مستقر پر بھی، جو بزرگ بڑی احتیاط سے چھوٹوں کو پڑھنے کو دیتے تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب میں قلم پکڑنے اور لکھنے کے قابل ہوا تھا، الہلال کے وہ مضامین جو طرابلس و بلقان اڈریانوپل سمرنا کی جنگوں، انور پاشا کے مجاہدانہ کارناموں و مسجد کانپور کے واقعہ پر لکھے گئے تھے، پڑھتا اور جھومتا اور اس کو خطابت و بلاغت کی معراج سمجھتا تھا اس زمانہ کا پڑھا ہوا وہ مضمون آج تک نہیں بھولتا جس میں [illegible] نے طرابلس کی ایک شہادت زار میں انور پاشا کی آمد، شہیدوں کے [illegible] کے معائنہ اور ان کے تأثر کی منظر کشی کی تھی، بلبلوں کی یہ مشہد مقدس، انور پاشا جیسے دردمند اور بلند حوصلہ مجاہد کی آمد، اور مولانا ابوالکلام کا قلم ان سب نے مل کر اس مضمون میں وہ اثر اور طاقت پیدا کر دی تھی کہ آنسوؤں کے سیل رواں کا تھامنا مشکل ہو جاتا تھا، اور رگ وپے میں چنگاریاں سلگتی نظر آتی تھیں۔

اس سے کچھ عرصہ بعد ان کی مشہور کتاب ''تذکرہ'' پڑھی جو اس وقت ان کی طرز تحریر کا شاہکار سمجھا جاتا تھا، اس میں آبشار کا زور وشور اور دریا کی سی روانی، اس میں جو عربی، فارسی کے الفاظ کے پورے پورے جملے آ گئے ہیں، اگر وہ اردو کے کسی اور انشا پرداز کے ہاں آئیں تو عیب سمجھے جائیں، لیکن ان کا زور خطابت، اور تحریر کی روانی بلکہ طغیانی ان کو اس خوش اسلوبی اور آسانی کے ساتھ نبھا لیتی ہے کہ وہ اس کے حسن میں اضافہ کر دیتے ہیں، اور اس کا زور و برجستگی، سوچنے والے کو اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ وہ ان الفاظ و جملوں کے اصل نسل اور حسب ونسب پر غور کر سکے، یہ ان کا وہ اسلوب ہے، جس کی تقلید لکھنے والوں کے لیے دشوار بھی ہے اور خطرناک بھی۔

بعد میں انھوں نے یہ اسلوب ترک کر دیا اور جوانی کے ساتھ الفاظ کی طغیانی وفراوانی کا یہ دریا بھی اتر گیا اور ان کے طرز تحریر میں سلاست وسادگی پیدا ہو گئی، جس کا

بہترین نمونہ ان کا انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس رام گڑھ (۱۹۴۰ء) کا خطبۂ صدارت ہے لیکن کبھی کبھی اس خاموش دریا میں لہر اٹھتی ہے جو ان کی جوانی اور دور "الہلال" کی سحر کاری اور رجز خوانی کو یاد دلا دیتی ہے، اور بڑھاپے میں جوانی کے تیور یاد آجاتے ہیں۔

۳۴-۱۹۳۳ء میں ان کی تفسیر و ترجمہ "ترجمان القرآن" کی پہلی پھر دوسری جلد چھپ کر نکلی، میں اس زمانہ میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کے فرائض انجام دیتا تھا، اور تفسیر میرا خاص مضمون تھا، میں نے یہ جلد بڑے ذوق سے پڑھی اور اس سے بہت فائدہ اٹھایا سورہ برأت کی تفسیر کے سلسلے میں انھوں نے غزوۂ تبوک سے پچھڑ جانے والے تین صحابیوں کی داستان ان کے ایک رفیق کعب بن مالکؓ کی زبان سے جس طرح سنائی ہے اس میں ترجمہ و روایت کی پوری احتیاط و دیانت کے ساتھ اپنے جادو نگار قلم سے جس طرح جان ڈال دی ہے، ان کی ذہنی کشمکش، نازک امتحان، اسلام سے سچی وفاداری اور عشق رسول کی جس طرح تصویر کھینچی ہے، ان کے دل کی دھڑکنوں کو جس طرح الفاظ میں منتقل کیا ہے، جس برجستگی و بے ساختگی کے ساتھ اردو اور فارسی کے آبدار شعروں کو جا بجا نگینہ کی طرح جڑا ہے، اس نے مضمون کو صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے کلاسیکی ادب میں شامل ہونے کا مستحق بنا دیا ہے۔

اس سے زیادہ ان کے سحر طراز قلم نے حضرت یوسفؑ و یعقوبؑ کی سیرت و کردار، جذبات و تاثرات، ان کے درد و غم، ان کے ثبات و استقامت کی تصویر کھینچنے میں کمال دکھایا ہے، یہ ایک تفسیری مضمون ہے، جس میں قرآن مجید کے تعلق کی وجہ سے قدم قدم پر "ہوشیار و نگاہ روبرو" کی صدا کانوں میں آتی ہے، لیکن پیدائشی ادیب اور غیر معمولی ذہین انسان اپنے ادبی جوہر دکھانے اور نئے نئے گل کھلانے سے باز نہیں رہ سکتا، پھر جب یوسف جیسے جمیل و جلیل انسان کا تذکرہ ہو؟ مولانا نے اس داستان میں بھی نیز اپنے تفسیری نوٹس میں بھی نفسیات انسانی، اخلاق اور علم الاجتماع کے بہت سے ایسے نکتے بیان کر دیئے ہیں جو تفسیر کے طالب علموں ہی کے لیے نہیں، ادب و اخلاق کے طالب علموں کے لیے بھی

قابل مطالعہ اور لائق استفادہ ہیں۔

پھر سورۂ کہف میں ذوالقرنین کی شخصیت، اس کی تاریخی حیثیت اور اس کے زمانہ کے تعین اور مصداق کے سلسلہ میں انھوں نے جو داد تحقیق دی ہے، اور جو قیمتی معلومات اور دستاویزی ثبوت فراہم کر دیئے ہیں، ان میں ابھی تک میری معلومات میں کوئی بڑا اضافہ نہیں ہوا ہے، اس سب کے ساتھ کتاب کے مقدمہ میں بھی ان کی ادبی اور ذہنی خصوصیات پورے طور پر نمایاں ہیں، اور میں نے ان سب چیزوں کو بار بار پڑھا اور ان سے پورا فائدہ اٹھایا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد مولانا جو کانگریس کی قائم شدہ وزارتوں کے نگراں بھی تھے، لکھنؤ آئے اور یوپی کے وزیر اعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنتھ کی کوٹھی پر ٹھہرے، میں دو تین رفیقوں کے ساتھ ملاقات کے لیے حاضر ہوا، اپنا تعارف کرایا تو پہچان لیا، اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے تعلق سے بعض کتابوں کا تذکرہ فرماتے رہے، جو ان کی سیرت میں لکھی گئی ہیں، میں اس زمانہ میں خود سیرت سید احمد شہیدؒ کی (جو میری پہلی تصنیف ہے) ترتیب میں مشغول تھا، اور جہاں تک یاد پڑتا ہے، اس کا کچھ مسودہ بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا، میری اس حاضری کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان سے اس کتاب پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کروں، مولانا نے میری درخواست قبول کی اور مقدمہ لکھنے کا وعدہ فرمالیا۔

دوران گفتگو میں نے ان کی تفسیر پر اپنے تاثرات اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اس کے بعض مقامات کو عربی میں منتقل کرنا چاہتا ہوں، مولانا نے اس کی اجازت دے دی۔

اسی دوران یوپی کی کابینہ کے بعض ارکان ملنے کے لیے آئے لیکن مولانا نے کسی بات سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا کہ اب ہم لوگ رخصت ہوں...... زیادہ اہم لوگ آگئے ہیں، یہ مولانا کی خاص ادا تھی جس کو ایک دو ملاقاتوں میں ہم سمجھ گئے، یہی نہیں بلکہ بعض اوقات انھوں نے طالب علموں اور طبقۂ علماء کے افراد کو یہ تاثر دیا کہ وہ ان کی صحبت میں زیادہ خوش اور بے تکلف ہیں، اور ان پر ان لوگوں کو ترجیح نہیں دیتے جو عام نگاہوں میں زیادہ اہم اور قابل احترام سمجھے جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایسا محسوس کرایا کہ یہ علمی طبقہ ہی

ان کی اصل برادری اوران کے ذوق کا حلقہ ہے۔

مولانا کی خدمت میں میری تیسری حاضری اس موقع پر ہوئی جب وہ کچھ عرصہ کے بعد کانگریسی وزارت کے دوران ہی میں لکھنؤ تشریف لائے غالباً ۱۹۳۹ء ہوگا، اس مرتبہ قیام حافظ محمد ابراہیم صاحب کی کوٹھی پر تھا، جو یوپی کے وزیر تعمیرات ومواصلات تھے، میں نے مولانا کی خدمت میں یاددہانی کا خط لکھا تھا، لیکن اس کا جواب نہیں ملا تھا، کچھ عرصہ انتظار کرنے کے بعد میں نے کتاب پر مولانا سید سلیمان ندویؒ سے مقدمہ لکھنے کی درخواست کی جو انھوں نے منظور کرلی، ۱۹۳۹ء میں یہ کتاب اس مقدمہ کے ساتھ جو سید صاحب کی تحریروں میں خاص شان رکھتی ہے، پریس سے چھپ کر باہر آ گئی میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کے سکریٹری پروفیسر محمد اجمل خاں نے مجھ سے کہا کہ مولانا بہت مشغول ہیں، اس وقت ملاقات نہیں ہوسکتی، میں چونکہ ندوہ سے سائیکل پر پنچ بنگلیا جہاں حافظ صاحب کی کوٹھی تھی گیا تھا، جس کی وجہ سے بہت تھک گیا تھا، دم لینے کے لیے بیٹھ گیا، اور اجمل خاں صاحب سے باتیں کرنے لگا۔

باتوں باتوں میں سیرت سید احمد شہید کا تذکرہ آیا، پروفیسر اجمل خاں کے دادا سید صاحب کے رفیقوں اور عقیدت مندوں میں تھے، اس وجہ سے پروفیسر صاحب کو بھی اپنے مخصوص خیالات وتحقیقات کے ساتھ سید صاحبؒ اوران کی جماعت سے گہری عقیدت تھی، ان کو جب معلوم ہوا کہ میں سیرت سید احمد شہید کا مصنف ہوں تو کہنے لگے، ذرا ٹھہریے، میں مولانا سے ذکر کردیتا ہوں، حقیقتاً صرف اس کی دیر تھی، مولاناؒ نے یاد فرمالیا، میں نے جب مقدمہ کا ذکر کیا تو فرمایا کہ مجھے اس سلسلہ میں تمھارا کوئی خط نہیں ملا، بہرحال مقدمہ اب بھی لکھا جاسکتا ہے، اس کا وقت اب بھی ہے، میں نے مناسب جواب دیا لیکن اصرار نہیں کیا، افسوس ہے کہ مولانا کی مصروفیت اوران کی ذمہ داریوں کی بنا پر، جو بڑھتی ہی گئیں اس کی نوبت نہیں آئی۔

مولانا اس مجلس میں دیر تک ندوہ کا، مولانا شبلی کا، اور ندوہ کی تحریک کی اہمیت اور افادیت کا ذکر کرتے رہے، یہ بھی فرمایا کہ اس تحریک کے پورے طور پر کامیاب نہ ہونے

کی وجہ یہ ہے کہ مولانا شبلی کے بعد پھر کوئی اس کے آستانہ پر آکر پاؤں توڑ کر بیٹھ نہیں گیا، تھوڑی دیر میں اجازت لے کر رخصت ہوا۔

چوتھی ملاقات ۱۹۴۶ء کارلٹن ہوٹل میں ہوئی جب وہ کسی وزارتی قضیہ کے سلسلہ میں تشریف لائے ہوئے تھے، ہم دوستوں کی ایک جماعت نے جس میں مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی، مولانا محمد اویس صاحب ندویؒ کے نام یاد ہیں، شاید مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی اور مولانا محمد ناظم صاحب ندوی بھی تھے، یہ طے کیا کہ مولاناؒ کی سحر خیزی مشہور و مسلم ہے، ہم لوگ بھی فجر کی نماز کارلٹن ہوٹل یا شاہ نجف کے سبزہ زار پر پڑھیں، اور اسی وقت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوں، چنانچہ ایسے ہی ہوا، نماز پڑھ کر مولانا کے کمرہ کے سامنے پہنچے تو حسب معمول پروفیسر اجمل خاں صاحب سے سابقہ پڑا، اس دن انھوں نے اطلاع کرنے میں کوئی تاخیر نہیں کی، ہم مولانا کے کمرہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ چائے سے (جو غالباً وہائٹ جیسمین تھی، جو انھی کے تذکرہ کرنے کے بعد مشہور و مقبول ہوئی) فارغ ہو گئے تھے، اور چائے کے برتن اس وقت تک رکھے تھے، اور مولانا غالباً ''کاروانِ خیال'' کے پروف دیکھ رہے تھے، اس مجلس میں زیادہ تر ان مضامین یا کتابوں کا تذکرہ رہا جو ندوہ میں پڑھائی جاتی ہیں، مولانا عربی انشا و تحریر پر بھی کچھ اظہار خیال فرماتے رہے، مجھ سے پوچھا کہ میں کن کن مضامین کی تعلیم دیتا ہوں، تھوڑی دیر میں ہم لوگ رخصت ہوئے، کوئی اور بات اس مجلس کی یاد نہیں۔

اسی زمانہ میں مولانا بار بار لکھنؤ تشریف لائے، ایک مرتبہ ندوہ کے طلباء ''دروغ مصلحت آمیز'' سے کام لے کر مولانا کو دارالعلوم میں لے آنے میں کامیاب ہوئے، اس ''دروغ مصلحت آمیز'' کی تشریح یہ ہے کہ مولانا اپنے معاصرین کے طبقے مقرر کر رکھے تھے، ایک وہ جس کا وہ کسی قدر احترام و لحاظ فرماتے تھے، اور ان کو اپنا مخاطب و مکتوب الیہ بنانا مناسب سمجھتے تھے، اس انجمن میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر نشین تھے، جن کو مولاناؒ نے عالم خیال میں اپنا مکتوب الیہ اور مخاطب بنایا اور احمد نگر جیل

کے لکھے ہوئے وہ خطوط جو بعد میں "غبارِ خاطر" کے نام سے شائع ہوئے اور جن کی ہندوستان کے ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی، انھی کو سامنے رکھ کر لکھے، اسی زمانہ میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم لکھنؤ آئے ہوئے تھے، اور دار العلوم کے مہمان خانہ میں مقیم تھے، ندوہ کے ذہین طلباء یہ سمجھتے تھے کہ "عنقا را بلند است آشیانہ" مولانا آزاد اگر کسی کے نام اور کشش سے ندوہ آسکتے ہیں تو وہ صرف مولانا شروانی تھے، جو اتفاق سے اس وقت اپنی ہمیشہ کی قیام گاہ کاکوری کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

طلباء نے جن کے درس میں ادب و بلاغت کی کتابیں بھی داخل تھیں، اور جس میں اشارے کنائے اور توریہ کی تعریف کی گئی تھی، اس انداز سے مولانا سے گفتگو کی کہ مولانا اپنی غیر معمولی ذہانت کے باوجود یہ محسوس نہیں کر سکے کہ مولانا شروانی لکھنؤ میں ہیں، لیکن اس وقت ندوہ میں نہیں ہیں، وہ ان کی ملاقات کے شوق میں ندوہ تشریف لے آئے، میں اس وقت درجہ میں پڑھا رہا تھا، معلوم ہوا کہ مولانا آزاد مہمان خانہ میں تشریف رکھتے ہیں، آیا تو دیکھا کہ مسجد کی محراب میں بیٹھے ہوئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی پہلو میں ہیں، طلباء سامنے جمع ہیں، مولانا کچھ خطاب فرما رہے ہیں، انھوں نے بڑے لطیف طریقہ پر اس "سازش" کا ذکر کیا جس کا وہ تمام احتیاطوں اور فراست و ذہانت کے باوجود شکار ہو گئے تھے، لیکن اس میں ناگواری و احتجاج کی تلخی نہ تھی، ایک بزرگانہ شکایت جس میں محبت و شفقت کی آمیزش تھی، ایک مرتبہ اور بھی طلباء کی دعوت پر مولانا طلباء کی انجمن "الاصلاح" میں تھوڑی دیر کے لیے تشریف لائے تھے، رات کا وقت تھا، مولانا کے ساتھ مولانا عبد القادر قصوری بھی تھے، یہ واقعہ اور پیشتر کا ہے، یہاں بلا ترتیب لکھ دیا گیا۔

مولانا ایک مرتبہ حکومت یوپی کی دعوت اور سمپورنانند جی کی وزارت تعلیم کے زمانہ میں عربی مدارس کے نصاب کی نئی ترتیب و ترقی کی تجویز کے موقع پر تشریف [illegible] ئے تھے، یہ فروری ۱۹۴۷ء کی بات ہے، اس موقع پر انھوں نے یوپی اسمبلی کے ایک [illegible] انی ہال میں مدارس عربیہ کے ذمہ داروں اور علماء و فضلاء کے سامنے نصاب درس کے ارتقاء [illegible]

کے عناصر ترکیبی پر ایک فاضلانہ تقریر فرمائی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مولانا کے سیاسی مشاغل نے ان کو علم کے اس قافلہ سے بچھڑنے نہیں دیا ہے، جس کے وہ اوائل عمر میں ہم سفر رہے، ان کے سامنے ایک مختصر سی یادداشت تھی جس میں انھوں نے دہلی سے لکھنؤ تک کے ہوائی سفر میں کچھ پوائنٹس لکھ لیے تھے، اس موقعہ پر مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا محمد قاری طیب صاحب اور دوسرے علمائے فرنگی محل واساتذہ مدارس موجود تھے، ان میں سب کو مولانا کا احترام اوران کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھا۔

اس کے علاوہ بھی کئی بار مولانا کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا، ایک بار جب مولانا احمد نگر جیل سے رہا ہو کر کچھ عرصہ کشمیر میں آرام کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے تو میں بھی اتفاق سے کشمیر گیا ہوا تھا، مولانا کا قیام نسیم باغ کے ایک ہاؤس بوٹ میں تھا، مسٹر آصف علی مولانا کے ساتھ تھے، رمضان کا زمانہ تھا، میں اور برادر عزیز سید مظفر حسین ندوی کشمیری میرے ساتھ تھے، ہم لوگ ایک دن مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسی ہاؤس بوٹ میں ملاقات ہوئی، مولانا کو اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی یہ یاد تھا کہ میں ندوہ میں کیا مضامین پڑھاتا ہوں، مجھ کو مولانا کی ایسی چھوٹی چھوٹی جزئیات یاد رکھنے پر حیرت ہوئی، میں اپنی تازہ تصنیف ''مولانا محمد الیاس اوران کی دینی دعوت'' لے گیا تھا، وہ ان کی خدمت میں پیش کی، اس مجلس کی کوئی اور قابل ذکر بات یاد نہیں۔

اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں مولانا سے قاہرہ کے ہوائی اڈہ پر اس وقت ملاقات ہوئی جب مولانا پہلی مرتبہ جمہوریہ ہند کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے یورپ کے سفر پر جارہے تھے، رات کو مولانا کا جہاز قاہرہ کے ہوائی اڈہ سے گزرنے والا تھا، بعض ہندو دوستوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا پہلی مرتبہ یہاں سے گزر رہے ہیں، ہم لوگ چاہتے ہیں قاہرہ کے ہوائی اڈہ پر ان کا استقبال کریں، اور ہندوستانیوں کی طرف سے جو یہاں مقیم ہیں، نذر عقیدت پیش کریں، وہ مولانا کے میرے تعلق وتعارف سے واقف نہیں تھے، ایک ہندوستانی کی حیثیت سے انھوں نے مجھے دعوت دی اور میں نے خوشی سے قبول کرلی، اسی زمانہ میں کسی کام سے

مجھے ہندوستانی سفارت خانہ میں جانا پڑا تھا، اور مجھے اجنبیت و بے اعتنائی کا احساس ہوا تھا۔

میں اور میرے ایک رفیق مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی ''المناظر'' کے ہوائی اڈہ پر پہنچے، دیر رات کو مولانا کا جہاز اترا اور ہم لوگ مولانا کو ایک جلوس کی شکل میں وہاں لائے جہاں چائے کی پارٹی کا انتظام تھا، مولانا بہت تھکے ہوئے نظر آرہے تھے، مصر کے ہوشیار اخباری نمائندے اس وقت موجود تھے، انھوں نے مولانا سے کبھی انگریزی اور کبھی عربی میں سوالات کرنے شروع کیے، بعض سوالات ہندوستان کے داخلی معاملات سے تعلق رکھتے تھے، اس وقت مولانا کی حاضر دماغی کا ایک نمونہ سامنے آیا، وہ بڑے اطمینان سے تفصیل میں پڑے بغیر جواب دیتے رہے۔

اس کے بعد ہم لوگ چائے کی میز پر آئے اس وقت تک انھوں نے مجھے پہچانا نہیں تھا، اور ان کو میرے یہاں ہونے کی توقع بھی نہیں تھی، ان کے ایک قدیم نیاز مند مولوی ابو النصر بھوپالی صاحب بھی اس موقع پر موجود تھے، وہ عرصہ سے قاہرہ میں مقیم تھے، اور انھوں نے ''ترجمان القرآن'' کے بعض حصوں کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، اور جو مجھ سے اس وجہ سے واقف تھے کہ مولانا نے ان کو میرے والد مرحوم کے پاس بھیجا تھا، اور وہ عرصہ تک ہمارے مکان پر مقیم رہے تھے، انھوں نے مولانا کو میری طرف متوجہ کیا اور کہا یہ مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب کے فرزند ابو الحسن علی ہیں، مولانا اس وقت میری طرف مخاطب ہوئے تو آخر تک ان کا روئے سخن میری طرف یا مولوی ابو النصر صاحب کی طرف رہا۔

گفتگو تمام تر علمی تھی، زیادہ تر تفسیر قرآن میں جدید نظریات و تحقیقات کے داخل کرنے کے متعلق، مولانا کا فرمانا تھا کہ ان جدید نظریات اور انکشافات کو قرآن مجید میں داخل کرنے میں اور قرآن مجید کی ان سے تطبیق کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اس لیے کہ علم ترقی پذیر اور تغیرات کو قبول کرنے والا ہے، اور اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ یہ نظریات و تحقیقات اسی طرح مقبول اور مسلم رہیں گی، جیسی اب ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے طنطاوی جوہری کی تفسیر پر بھی تنقید کی، جو اس طرز تفسیر کا خاص نمونہ ہے، اور اس میں

معلومات جدیدہ کو بڑی فیاضی کے ساتھ کتاب میں شامل کرلیا گیا ہے۔

مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم اس طرف آئے ہوئے ہو، تم نے کن کن ملکوں کی سیر کی، تم یمن بھی گئے تھے؟ پھر فرمایا تمھارے والد مرحوم فرماتے تھے کہ سید صاحب کی سیرت پر ٹونک میں بڑا مواد اور ذخیرہ ہے، کیا تم نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا؟

اسی اثنا میں سفارت خانہ کے ذمہ دار افسران مولانا کو بار بار متوجہ کرتے رہے، اور انھوں نے چاہا کہ مولانا سب سے بات کریں، وہ وقت کی کمی کی طرف بھی توجہ دلاتے رہے، لیکن مولانا ہمیں لوگوں کی طرف متوجہ رہے، یہ دیکھ کر ان کو غالباً اپنی اس غلطی کا احساس ہوا ہوگا کہ انھوں نے جس ہندوستانی کی طرف توجہ بھی نہیں کی تھی، اور نہایت بے التفاتی اور بے رخی کے ساتھ پیش آئے تھے، وہ مولانا کی نگاہ میں اس بے التفاتی کا مستحق نہیں ہے، تھوڑی دیر میں مولانا روانگی کے لیے تیار ہو گئے، ہم لوگوں نے الوداع کہا اور واپس آئے۔

اس کے بعد تین مرتبہ زمانہ وزارت میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا، ایک مرتبہ جب مولانا حسین احمد مدنیؒ کی دعوت پر دہلی اس لیے گیا، تاکہ وہ مولانا کو میری موجودگی میں والد صاحب کی کتاب "نزہۃ الخواطر" کی طرف توجہ دلائیں، جس کی چار یا پانچ جلدیں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد نے شائع کی تھیں، لیکن پولس ایکشن کے بعد اس کا سلسلہ رک گیا تھا، یہ ملاقات جمعیۃ العلماء کی ورکنگ کمیٹی کے ایک جلسہ میں ہوئی جو گلی قاسم جان میں ہو رہا تھا، مولانا آزاد تشریف لائے تو مولانا مدنیؒ نے میرا تعارف کرایا اور "نزہۃ الخواطر" کا ذکر کیا، مولانا نے اپنی واقفیت اور دلچسپی کا اظہار کیا اور فرمایا اس کتاب کو ضرور چھپنا چاہیے، میں نے عرض کیا کہ کیا یاددہانی کی ضرورت ہوگی؟ تو فرمایا نہیں، چنانچہ ایسے ہی ہوا دائرہ سے اس کے بقیہ حصے طلب کیے گئے، اور پوری کتاب چھپ کر شائع ہوئی۔

دوسری ملاقات پارلیمنٹ ہاؤس میں ان کے دفتر میں ہوئی، اس ملاقات میں میرے عزیز دوست ڈاکٹر سعید رمضان مصری ساتھ تھے، مولانا نے ان سے مختصراً عربی میں گفتگو کی اور انڈونیشیا کی "ماشومی" پارٹی کے متعلق دریافت کیا، تیسری ملاقات نئی دہلی

میں مولانا کی قیام گاہ پر ہوئی، جس میں مولانا عمران خاں صاحب ساتھ تھے، ہم لوگ ندوہ کے ایک کام کے لیے حاضر ہوئے تھے، مولانا نے اس سے بڑی دلچسپی لی اور مفید مشورے دیئے اور بہت جلد اس کام کی تکمیل ہوگئی، جس کے لیے ہم گئے تھے۔

اس کو ہندوستانی مسلمانوں کی بدقسمتی کہیے یا نااہلی یا مولانا آزاد کی بے چین طبیعت اور عبقری شخصیت کا فطری تقاضا کہ انھوں نے ''الہلال'' کے اجراء کے آغاز سے مسلمانوں میں فکری وسیاسی بیداری کا جو انقلابی کام شروع کیا تھا، اور جو ''حزب اللہ'' کی تربیت اور اس امارت شرعی اور امامت دینی کے احیاء پر منتج ہو رہا تھا، جو عرصہ سے مسلمانوں میں مردہ اور معطل ہو چکی تھی، مولانا آزاد کی اس صدائے اسرافیل سے اس میں جان پیدا ہونی شروع ہوگئی تھی، اور ہندوستان کے ایک بڑے باشعور وصاحب حمیت طبقہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے یا ان کی امارت تسلیم کر کے ان کو امام الہند بھی کہنا شروع کر دیا تھا، اس کو اسی جگہ روک دیا، تحریک خلافت کی ناکامی، ہندو مسلم اتحاد کی شکست، فرقہ وارانہ تحریکوں کی مقبولیت، اور ان کے خلاف مسلمانوں کے شدید ردعمل اور جذباتیت سے بددل ہو کر انھوں نے اپنی ساری دلچسپی وسرگرمی اور خداداد صلاحیتیں اور توانائیاں ایک فعال مستقل ومنظم ادارہ انڈین نیشنل کانگریس کے حوالہ کر دیں، جس میں عوامی وقومی زندگی کی طرح روز روز جوار بھاٹے نہیں آتے تھے، اور جس کے رہنما، ان کے خداداد کمالات، ان کی مستقل مزاجی وخودداری، ان کی وطن دوستی اور انگریزی دشمنی، ان کی غیر معمولی حاضر دماغی اور سیاسی بصیرت کے حد درجہ قائل تھے، اس فیصلہ کے ساتھ ان کا عوام سے بالعموم اور مسلم عوام سے خصوصیت کے ساتھ تعلق چھوٹتا بلکہ ٹوٹتا گیا، اور یہ ان کی افتادِ طبع اور فطرت کے عین مطابق تھا کہ وہ اصلاً عزلت پسند، کم آمیز اور ''خود مشغول'' آدمی تھے، وہ بیدل عظیم آبادی کے اس شعر پر عرصہ سے عقیدہ رکھتے تھے کہ۔

ستم ست گر ہوست کشد کہ بسیر سرو وسمن درا
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درا

عالم اسلام پر مصائب کی آندھی، ان کو اس گوشۂ عزلت سے نکال کر جو فطری بھی تھا، اور موروثی بھی ان کو اس رستخیز میں لے آیا تھا، جس کا سب سے بڑا میدان اس وقت ہندوستان بن رہا تھا، لیکن جب انھوں نے اپنی کوششوں کی ناکامی دیکھی، اور واقعات وحقائق کی سنگدلی و بے رحم منطق سامنے آئی تو ان کی فطرت نے پھر ان کو ان کے گوشۂ عزلت کی طرف واپس ہونے کا مشورہ دیا، ان کا مطالعہ ان کی بے چین طبیعت، اور ان کے ذہنی و علمی کمالات ان کو اس گوشۂ عزلت اور سجادگی پر قانع نہیں رکھ سکتے تھے، جو ان کو اپنے والد محترم سے وراثت میں ملی تھی، اس لیے انھوں نے کانگریس کی موقر مجلس کو اختیار کر کے جس کے وہ دوبار صدر بنے اور انھوں نے اس میں اپنے دماغی جوہر دکھائے، درمیانی راستہ اختیار کیا، اور پھر وزارت کو قبول کر کے جس کو وقار و کامیابی کے ساتھ انھوں نے نباہا ان امیدوں کو منقطع کر دیا، جو ان کے دور اول سے وابستہ ہوئی تھیں، اس موقع پر ان کو (اور اس کی جرأت کون کرسکتا تھا) وہ شاہکار تحریر یاد دلائی...... جاسکتی تھی جو تذکرہ کے صفحات پر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا ذکر کرتے ہوئے ان کے قلم سے نکلی تھی، جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اپنے زمانہ کا امام و مجدد کس طرح وسائل سے بے نیاز اور ماحول سے بے پروا ہوتا ہے، اور وہ کس طرح اپنے لیے وسائل مہیا کر لیتا ہے اور زمانہ کو اپنے لیے ساز گار بلکہ اپنا تابع فرمان بنا لیتا ہے، اور فصل خزاں سے موسم بہار اور فصل گل پیدا کر لیتا ہے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں
بلبل چہ گفت، وگل چہ شنید، وصبا چہ کرد

وہ لکھتے ہیں:۔

''بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سر وسامان واسباب کار فراہم نہیں، لیکن وقت کا عازم و فاتح اٹھتا ہے، اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا، اگر سر و سامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے طیار کر لوں گا، اگر زمین موافق نہیں، تو آسمان کو اترنا

چاہیئے، اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیئے، اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہوگئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیئے، اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ؟ درختوں کو دوڑنا چاہیئے! اگر دشمن بے شمار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں، اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہوگیا کہ راہ صاف نہیں کرتے، وہ زمانہ کا مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے، وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے، وہ زمانہ کے حکموں پر نہیں چلتا، بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبش لب کا انتظار کرے، وہ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے، جس سے دامن بھرلوں؟ وہ یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے، جس کو پورا کروں''۔(۱)

مولانا آزاد کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا، اور بہت کچھ لکھا جائے گا، ان کی سیرت اور ان کے کمالات کا ایک ایک گوشہ سامنے لایا جائے گا، ان کے سیاسی خیالات اور موقف کے متعلق بہت کچھ اظہار خیال کیا گیا ہے، اور کیا جاتا رہے گا، وہ ہندوستانی سیاست اور ہماری قدیم تہذیب وثقافت کا ایک ستون تھے، بے عیب ذات خدا کی ہے، اور سراپا عصمت زندگی خدا کے پیغمبر کی جس میں کہیں قیل وقال کی گنجائش نہیں، ان کی بشری لغزشوں اور کمزوریوں کے متعلق بھی ان کے معاصرین اور ناقدین کی نہ زبان کو روکا جاسکتا ہے، نہ قلم کو، ان کے سوانح نگاروں نے ان کے جن سفروں کا تذکرہ کیا ہے، ان کے تاریخی ثبوت اور ان کے زمانہ کے تعین کے بارے میں اختلاف اور بحث وتحقیق کی بڑی گنجائش ہے، لیکن ان کا حیرت انگیز حافظہ، ان کی غیر معمولی ذہانت، ان کی حاضر دماغی اور بیدار مغزی، ان کی ادبیت اور ان کی انشاء پردازی جو کسی وقت اور کسی جگہ ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی، ان کی اپنے مطالعہ اور معلومات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی عجیب

---

(۱) تذکرہ، ص: ۲۴۸

وغریب صلاحیت، ان کی سیاسی بصیرت اوردوربینی، ان کی اپنے خیالات میں پختگی اوراپنے مسلک پرثابت قدمی واستقامت اورلوگوں کی مدح وتنقید سے بے پرواہی، ان کی خودداری اورعزت نفس ہرشبہ سے بالاتراورہراختلاف سے بے نیاز ہے۔

میں لاہور میں تھا کہ ۲۲رفروری ۱۹۵۸ءکو پاکستان ریڈیو نے یہ صاعقۂ اثر خبر سنائی کہ مولانا آزاد اس جہانِ آب وگل اوراس کے طوق وسلاسل کے قید سے آزاد ہوکران باکمالوں سے جاملے جن کے اس جہان فانی سے سفر کا سلسلہ ابتدائے آفرینش سے جاری ہے ع

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

□□□

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

۵، ۶، ۷/ نومبر ۱۹۲۶ء میں ندوہ کا سالانہ جلسہ کانپور میں تھا، میری عمر ۱۲-۱۳ سال کی تھی، برادر معظم مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب جو اس وقت نائب ناظم تھے، مجھے اپنے ساتھ جلسہ میں لے گئے، اور وہیں مہمانوں کی قیام گاہ حلیم مسلم ہائی اسکول (۱) کی عمارت میں چھوڑ آئے، میں خلیل عرب صاحب سے عربی پڑھتا تھا، اور ان کی تعلیم و تربیت کے فیض سے عربی بولنے لگا تھا، کچھ میرا علماء اور زعماء کے اس بھرے مجمع میں ضرورت بے ضرورت عربی بولنا، اور میری زرق برق شیروانی جس کے پورے تانے بانے میں "ملبوس العافیۃ" کے خوبصورت نقوش چمکتے تھے (۲) اور نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے، اتفاق سے اس جلسہ میں ایک مدنی ادیب وشاعر شیخ سعدالدین برّادہ بھی آئے تھے، جو مشہور حجازی ادیب و محقق زبان شیخ عبدالجلیل برّادہ کے فرزند تھے، ان کو کبھی کبھی راستہ پوچھنے اور کسی سے بات کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی تو میں اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی سے ان کی مدد کرتا، غرض معزز مہمانوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ ۱۲-۱۳ سال کا ایک لڑکا یہاں آیا ہوا ہے جو بے تکلف عربی بولتا ہے، مہمانوں کے ایک ...... کمرہ میں میری طلبی ہوئی تا کہ اس کی تصدیق ہو جائے، وہاں ایک بلند و بالا قد کے خوش رو وجیہ جوان تھے، دوہرا بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ، چہرہ پر خوبصورت داڑھی، آنکھیں روشن جن سے ذہانت و بلند نگاہی عیاں، کشادہ پیشانی، سر سے پاؤں تک کھدّر میں ملبوس تھے، یہ تھے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جو نئے

---

(۱) حال حلیم مسلم ڈگری کالج

(۲) یہ کپڑا بغداد کا بنا ہوا تھا، اور والد صاحب کو کسی نے تحفہ میں دیا تھا۔

نئے جرمنی سے آئے تھے(۱) اور انھوں نے مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں کی خواہش پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پرنسپلی قبول کی تھی، یہ دونوں حضرات بھی جلسہ میں موجود تھے، حاذق الملک حکیم اجمل خاں بحیثیت صدر اور مولانا محمد علی بحیثیت مہمان خصوصی، ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اسی کمرہ میں عربی زبان کے ایک جید عالم اور محقق مولانا ابوعبداللہ محمد السورتی بھی ٹھہرے ہوئے تھے، دونوں کے سامنے میری پیشی ہوئی، ان حضرات نے مجھ سے کچھ سوالات کیے، میری تعلیم کے بارے میں پوچھا، میں نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا اور وہاں سے خوش خوش اور کامیاب واپس ہوا، یہ تھی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی پہلی زیارت، عربی کا ایک کمسن طالب علم عالمی شہرت رکھنے والے ایک ماہر تعلیم کے سامنے تھا، جو جلد جلد شہرت وعزت کی منزلیں طے کر کے ہندوستان کے صدر جمہوریہ کے منصب پر فائز ہونے والا تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کو ایک دوبار اور دیکھا جب وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے انگریزی نصاب کی ترتیب میں مدد دینے کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی کی دعوت پر ندوہ آئے، لیکن یہ محض دور سے جھلک دیکھنے سے زیادہ نہ تھا، قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع اس وقت ملا جب مارچ ۱۹۳۹ء میں سید صاحب نے کرنال پانی پت اور دہلی کے سفر میں معیت وخدمت کے لیے میرا انتخاب کیا اور مجھے ان کی رفاقت اور ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا، کرنال وپانی پت سے واپسی پر وہ دہلی ٹھہرے، اس وقت جامعہ ملیہ قرول باغ میں تھی، ان کا قیام تو مہمان خانہ میں ہوا، لیکن وہ اصلاً شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے مہمان تھے، کھانا ان ہی کے دولت خانہ پر کھاتے جوان کے منصب وشہرت کے لحاظ سے "دولت خانہ" کہلانے کا مستحق تھا، ورنہ اصلاً ایک معمولی استاد کا مکان، سادگی لیکن صفائی و نستعلیقی کا مظہر، ڈاکٹر صاحب کی شیریں گفتاری، فاضل ومعزز مہمان کی پذیرائی، ان کی ظرافت وشرافت کا نقش اس مختصر صحبت میں بھی دماغ پر مرتسم ہوگیا، اتفاق سے اس موقع پر خاں عبدالغفار خاں بھی جامعہ دیکھنے آئے، شیخ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم نے ان کو

---

(۱) ڈاکٹر صاحب فروری ۱۹۲۶ء میں جرمنی سے ہندوستان واپس آئے۔

تعلیم بالغان کا مرکز دکھایا، ڈاکٹر صاحب اور (غالباً) سید صاحب بھی ساتھ تھے۔

۱۹۴۲ء تھا کہ میرے استاد خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کا خط مجھے ملا، جس میں مجھے شعبۂ دینیات کی طرف سے طلبہ اور اساتذہ اور شہر کے اہل ذوق کے سامنے کسی دینی موضوع پر مضمون پڑھنے کی دعوت دی گئی تھی، یہ دعوت عمر، شہرت و مبلغ علم ہر اعتبار سے میری حیثیت سے زیادہ تھی، لیکن وہ میرے استاد تھے، اور میرے بڑے بھائی کے رفیق درس، میرا کوئی عذر مسموع نہیں ہوا اور مجھے اس دعوت کو قبول کرنا پڑا، میں نے اپنی عمر و علم کی کمی کی تلافی اپنی محنت و مطالعہ سے کرنے کی کوشش کی، فلسفہ کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا، عربی ماخذ تو برے بھلے میرے سامنے تھے، فلسفۂ جدید اور مغرب کے حکماء و فلاسفہ کے خیالات سے واقف ہونے کی اپنی بساط بھر کوشش کی، اور بڑی محنت سے "مذہب و تمدن" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جس میں بتایا کہ مذہب، فلسفہ اور تمدن کے مشترک سوالات کیا ہیں؟ پھر ان کے جوابات کے وسائل کی علمی تنقید کی، اور حواس، عقل، فلسفہ مذہبی فلسفہ اور اشراق کا علمی محاسبہ کیا، پھر ان کی بنیادوں پر جو اہم تمدن و نظام حیات دنیا کے مختلف دوروں میں قائم ہوئے ان کا تقابل و محاکمہ کر کے سوالات کے جوابات کی دوسری راہ، رسالت و نبوت پر روشنی ڈالی، اور انبیاء کرام کی تعلیمات، ان کے نتائج اور اسلامی زندگی کی خصوصیات کو پیش کیا، ۱۹۴۲ء کی کسی تاریخ میں جامعہ ملیہ میں یہ جلسہ ہوا، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، ایم اے نے جو اس وقت جارج اسٹیفن کالج دہلی کے استاد تھے جلسہ کی صدارت کی، اس جلسہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب وغیرہ سب موجود تھے، ڈاکٹر صاحب کی کریم النفسی اور بڑائی تھی کہ وہ اول سے آخر تک اس جلسہ میں موجود رہے، اور اس طویل مقالہ کو سنا اور نوجوان مقالہ نگار کی عزت افزائی کی۔

اب وہ وقت آیا کہ ڈاکٹر صاحب سے ربط و ضبط کے اور ان کو قریب سے دیکھنے کے زیادہ مواقع آنے لگے، ۱۹۴۰ء میں میرا حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں حاضری کا مستقل سلسلہ شروع ہوا، کوئی مہینہ جاتا کہ میں ان کی خدمت میں نظام الدین

حاضر نہ ہوتا، غالباً سنہ ۱۹۴۳ء یا اوائل سنہ ۱۹۴۴ء سے ڈاکٹر صاحب کی مولانا کی خدمت میں آمد ورفت بڑھی، وہ بڑے جہاندیدہ، مردم شناس اور ذہین آدمی تھے، تعلیم وتربیت، مردم گری وآدم سازی کے مختلف نظاموں اور مرکزوں اور کوششوں کو انھوں نے مشرق ومغرب میں دیکھا تھا، ان کے فلسفوں سے واقف تھے، اور ان کی طویل تاریخ کا انھوں نے مطالعہ کیا تھا، خود ایک ایسے بڑے آزاد تعلیمی اور تربیتی مرکز کے وہ سربراہ اور روح رواں تھے، جس کی بنیاد تقلید کے بجائے اجتہاد، اور تعلیم سے زیادہ تربیت پر رکھی گئی تھی، ان کو معلوم تھا کہ سیرت سازی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مشکل کام نہیں، یہ کوششیں مشرق ومغرب میں کتنی ناکام ہوچکی ہیں، اور یونیورسٹیوں میں اس کوشش کا نتیجہ کیا نکلا، یہ سب ان کے سامنے تھا، وہ جانتے تھے کہ کس طرح یہ سعی ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' کا مصداق ہوکر رہ گئی ہے، انھوں نے خود مجھ سے ایک مرتبہ کہا کہ ''تعلیم کا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں محنت بہت زیادہ اور نتیجہ بہت کم ہے، سوانڈے بٹھایئے ایک صحیح نکلتا ہے، باقی سب گندے نکل جاتے ہیں'' انھوں نے جب یہ دیکھا کہ خدا کے ایک بندے نے جو وجاہت، شہرت، خطابت، مدرسہ وکتب خانہ غرض ان تمام وسائل وذرائع سے مستغنی ہے جو تعلیم وتربیت اور اثر ونفوذ کے لیے شرط اول سمجھے جاتے ہیں، محض اپنے خلوص، دلی لگن، یقین کی قوت، اور حسن عمل سے کتنے انسانوں کی زندگی میں انقلاب برپا کردیا اور ایسے خطہ کو جو علم کی روشنی سے محروم، تہذیب وتمدن سے دور اور جدید اصلاح وتنظیم کے سارے وسائل سے ناآشنا تھا، کس طرح خداترس، امانت شعار، خدمت گزار، جفاکش اور ایثار پیشہ بنادیا، اور وہاں کے لیل ونہار کس طرح تبدیل ہوگئے، ایک ماہر تعلیم ونفسیات اور ایک حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے انھوں نے (ایک مربی ومصلح کے طور پر) مولانا کی بڑائی اور کامیابی تسلیم کرلی، اور وہ ان کی عظمت کے معترف ہوگئے۔

اتفاق سے جامعہ کے مالی معاونوں کی حیثیت سے ان کے دہلی کے دو تاجروں ملک دین محمد صاحب اور محمد شفیع قریشی صاحب سے دوستانہ روابط تھے، یہ دونوں مولانا کے

خاص نیازمندوں اور معتقدوں میں تھے، ان کی تحریک کو بھی ڈاکٹر صاحب کی حاضری میں دخل تھا، ڈاکٹر صاحب نے ہر جمعہ کو فجر کی نماز مولانا کے پیچھے پڑھنے اور ان کی تقریر سننے کو معمول بنالیا، میوات کے اہم جلسوں میں بھی جانا شروع کردیا، مولانا ان کی اہمیت وقابلیت سے واقف تھے، ان کی آمد کا بڑا اہتمام کرتے اور میوات تک جانے کا خصوصی انتظام، اس کی پوری کوشش فرماتے کہ ان کی دل بستگی کا زیادہ سے زیادہ سامان ہو، ہم مذاق ومانوس لوگ رفیق سفر ہوں، میوات کا قیام آرام دہ اور آئندہ کے سفر کے لیے ہمت افزا ہو، میں اگر اس موقع پر حاضر ہوتا تو مجھے ان کی رفاقت اور اسی کار میں سفر کرنے کے لیے ضرور منتخب کیا جاتا جس میں ڈاکٹر صاحب سفر کرتے، ڈاکٹر صاحب میں اپنی اعلیٰ مغربی تعلیم اور یگانہ ذہنی وعلمی کمالات کے ساتھ یہ کمال تھا کہ وہ ہر ماحول میں اپنے کو فٹ کرلیتے، اپنی انفرادیت اور بلند خیالی اور علمی دنیا میں رہنے کا ذرا تاثر قائم نہ ہونے دیتے، وہ بھی ان جلسوں میں بڑے بے تکلف اور گھلے ملے رہتے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب ایثار وقربانی کی وہ زندگی گزار رہے تھے جس کی مثال یونیورسٹیوں میں تو درکنا معمولی درجہ کی تعلیم گاہوں میں بھی ملنی مشکل تھی، وہ جامعہ سے "قوت مالا یموت" کے طور پر کچھ لیتے تھے، جو ان کی متوسط درجہ کی گزر اوقات کے لیے بھی کافی نہیں تھا، مجھے اس کا ایک مرتبہ عملی تجربہ ہوا، میری واپسی ان کے ساتھ ایک علیحدہ کار میں میوات کے ایک سفر سے ایسے وقت میں ہوئی کہ راستہ ہی میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا، راستہ میں جامعہ پڑتی تھی، اور اخلاقاً واصولاً ان کو مجھے اپنے گھر اتار کر کھانا کھلانا چاہیے تھا، جامعہ پہنچے تو انھوں نے مجھے ڈاکٹر سعید انصاری صاحب کے حوالہ کیا، اور یہ خدمت ان کے سپرد کی کہ مجھے کھانے سے فارغ کرادیں، مجھے اس وقت اندازہ ہوا کہ ان کے گھر میں کھانے کا کوئی انتظام نہیں اور وہ مجھ پر یہ راز منکشف نہیں ہونے دینا چاہتے، یہی قربانی کا وہ جذبہ تھا جس نے جامعہ میں زندگی کی ایک روح پھونک دی تھی، اور ان کی شخصیت کو نہ صرف جامعہ کے حلقہ میں بلکہ پورے تعلیمی حلقہ میں ایک

بلند کردار اور روشنی کے مینار کی حیثیت سے پیش کر کے دکھایا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو اپنے وسیع تعلیمی تجربہ اور مختلف ممالک کے طویل قیام کی بنا پر اسی زمانہ میں شدت سے اس ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا تھا کہ کسی ایسے مقام پر جہاں تعلیم وتربیت کا موثر کام ہو چکا ہو اور لوگوں میں بات ماننے کی وہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہو جو اس زمانہ میں عنقا ہے، ایسے نمونہ کی ایک اسلامی بستی کی ضرورت ہے، جہاں عقائد وعبادات کے ساتھ اسلامی اخلاق ومعاملات بھی پائے جاتے ہوں، وہاں اسلام کی تعلیمات کا زندہ اور چلتا پھرتا نمونہ دیکھنے والوں کو نظر آئے اور جہاں اس طرز زندگی کی بنیاد پڑے جس کو ڈاکٹر صاحب اکثر "فیشن" کے نام سے تعبیر کرتے تھے، جوان حدود سے نکل کر ملک کے دوسرے حصوں تک وسیع اور عام کیا جا سکے، ان کے نزدیک ملکوں اور معاشروں میں اس طرز زندگی "فیشن" کی کارفرمائی اور فرماں روائی ہوتی ہے، جو کوئی مثالی جماعت یا معیاری بستی پیش کر دیتی ہے، اور پھر لوگ آنکھ بند کر کے اسی کو اختیار کرتے اور اسی کو عزت اور کامیابی کی علامت سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک بانی وموجد ہمیشہ ایک قلیل جماعت ہوتی ہے، جس کی نقل وتقلید کثیر جماعت نے کی ہے، ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اس زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت اور اس ملک میں اسلام کی خدمت یہ تھی کہ مسلمان اس میں پہل کریں، اور ایک اعلیٰ انسانی، اخلاقی طرز زندگی جو اسلامی تعلیمات کی گہرائیوں سے ابھر کر نکلا ہو، عام انسانی معاشرہ اور اس ملک کو پیش کریں جو خود تو اخلاقی انتشار کا شکار ہے، لیکن اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کوئی بلند تصور نہیں رکھتا اور اس کو عرصہ سے ان کی افادیت کا کوئی ٹھوس تجربہ نہیں ہوا ہے۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے ڈاکٹر صاحب کی نظر انتخاب قصبۂ نوح ضلع گوڑگاواں (میوات) پر پڑی، جہاں وہ مولانا الیاس صاحب اور ان کے کارکنوں کے ساتھ بار بار جا چکے تھے، اور وہاں تبلیغی جدوجہد کے اثرات کا انھوں نے بچشم خود مشاہدہ کیا تھا، (اور جہاں عربی کا ایک مدرسہ معین الاسلام کے نام سے قائم تھا) ڈاکٹر صاحب

نے معلوم نہیں کس حسن ظن یا غلط فہمی کی بنا پر اس عظیم کام کو شروع کرنے اور اس کی نگرانی کے لیے میرا انتخاب کیا، شاید ان کو اس وجہ سے خیال پیدا ہوا ہو کہ میں ایک طرف قدیم تعلیم کے ساتھ ندوہ کے تخیل و تربیت اور جدید چیزوں کے مطالعہ کی بنا پر کسی قدر عصری تقاضوں سے واقف ہوں، دوسری طرف مجھے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب سے خصوصی قرب اور ان کا اعتماد حاصل ہے، بہرحال ڈاکٹر صاحب نے اپنی یہ تجویز حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کے معاون خصوصی مولانا احتشام الحسن کاندھلوی اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی خدمت میں پیش کی اور ان حضرات نے اس کو تقریباً منظور کرلیا، ڈاکٹر صاحب کا ۱۰رمئی ۱۹۴۴ء کا ایک خط اس وقت پیش نظر ہے، جس میں انھوں نے مجھے اس کی اطلاع دی ہے، اور اس کام کے لیے تیار رہنے کا مشورہ دیا ہے، یہ خط یہاں بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔

دفتر شیخ الجامعہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ

جامعہ نگر، ۱۰رمئی ۱۹۴۴ء

محب محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رخصت ہوتے وقت جو گفتگو میوات میں ایک مرکز کے قیام کے متعلق ہوئی تھی، اس کا سلسلہ جاری رہا، شیخ الحدیث اور مولوی احتشام الحسن صاحب سے گفتگو ہوئی پھر اتوار کے دن قریشی صاحب اور ملک وزیر علی صاحب کے ہمراہ نظام الدین حاضر ہوا، اور مفصل گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ اب تو یہ کام اللہ کا نام لے کر شروع کر ہی دیا جائے، بس بسم اللہ کیجیے، ضروری یہ ہے کہ آپ چند روز کے لیے تشریف لے آئیں، اور ہم چند لوگ میوات چل کر بعض مقامات دیکھ لیں، اور فیصلہ کریں کہ مرکز کہاں آسکیں، اس کے بعد کارروائی شروع کردی جائے، قریشی صاحب نے دو سال کے جملہ مصارف اٹھانے کا وعدہ فرمایا ہے۔

غالباً مولوی احتشام الحسن صاحب نے بھی آپ کو خط لکھا ہوگا، اولین فرصت میں اس باب میں کچھ کر ڈالیے، اس نیک کام کو انجام دینے کی سعادت آپ ہی سے مخصوص معلوم ہوتی ہے، مبارک ہو۔

والسلام
مخلص، ذاکر حسین

لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر یا شاید اس وجہ سے کہ یہ تحریک کے اصل مزاج اور روح ''حرکت ودعوت'' کے دائرہ سے باہر کی چیز ہے، اس تجویز کو ملتوی کر دیا گیا، اور ڈاکٹر صاحب نے افسوس اور کسی قدر شرمندگی کے ساتھ مجھے اس کی اطلاع دی غالباً کسی ملاقات کے موقع پر زبانی، اس لیے کہ اس سلسلہ کا کوئی خط میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔

غالباً ۱۹۴۵ء میں سیرت کمیٹی پٹی کے صدر اور اخبار ''ایمان'' کے ایڈیٹر عبدالمجید قریشی صاحب کی تحریک وترغیب سے نواب صولت علی خاں صاحب آف کوروائی نے ایک تبلیغی یونیورسٹی کے کوروائی میں قیام کا ارادہ کیا، ان کے پاس اس سلسلہ میں ایک رقم عرصہ سے محفوظ تھی، اس یونیورسٹی کا نقشہ اور نصاب ونظام مرتب کرنے کے لیے انھوں نے مختلف اہل الرائے، اور تجربہ کار مسلمان فضلاء کو مدعو کیا، ان میں قدرۃً ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم سرفہرست تھے، شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب لکھنوی مرحوم کے مشورہ سے جو کبھی کبھی نواب صاحب کے یہاں بحیثیت معالج کے جاتے تھے، انھوں نے ندوہ سے مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی مہتمم دارالعلوم اور مجھے مدعو کیا، ڈاکٹر صاحب سے کوروائی میں ملاقات ہوئی، اسی شفقت ومحبت سے ملے جیسے وہ ہمیشہ ملا کرتے تھے، طریقۂ کار طے کرنے کے لیے تین آدمیوں کی کمیٹی بنا دی گئی، اس میں ذاکر صاحب، پروفیسر سلیم چشتی اور یہ راقم الحروف تھا، ڈاکٹر صاحب ہی کے ایماء پر میں نے ہی اس کا مسودہ تیار کیا، لیکن بات اس سے آگے نہ بڑھ سکی اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا، واپسی میں بھوپال تک ڈاکٹر صاحب کا ساتھ رہا، خوش قسمتی سے مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھی نواب

صاحب کی دعوت پر بھوپال سے تشریف لائے ہوئے تھے، ہم سب لوگ ایک اسٹیشن پر کوروائی سے بھوپال کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں ایک دریا کے کنارے یہ قافلہ ٹھہرا شاہ صاحب آگے کی سیٹ پر تشریف فرما تھے، ہم لوگ سب پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، سامنے کا حصہ کھلا ہوا تھا، جس سے گرد اندر آرہی تھی، ہر ایک کے چہرہ پر گرد کی ایسی تہ بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا نام لکھا جاسکتا تھا، انھی گرد آلود لوگوں میں ڈاکٹر صاحب بھی تھے، شاہ صاحب جو اپنی بلند مقامی کے ساتھ بڑے زندہ دل اور خوش مذاق بزرگ تھے، ہم لوگوں کی پرسش احوال کے لیے پیچھے آئے دیکھا تو چہروں پر گرد اٹی ہوئی تھی، مسکرا کر یہ شعر پڑھا۔

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر
توچہ دانی کہ درین گرد سوارے باشد

اس ''گروہ خاکساراں'' میں ڈاکٹر صاحب کی موجودگی نے اس شعر میں خاص معنویت ولطف پیدا کردیا، بھیلسہ جو اب بدیشا کہلاتا ہے، اور بھوپال، جھانسی کے درمیان کا ایک اہم اسٹیشن ہے، پہنچ کر یہ اسٹیشن ویگن فیل ہوگیا، اور ہم لوگوں کو اسٹیشن کے ایک شیڈ کے نیچے پناہ لینی پڑی، کوروائی موٹر کے لیے اطلاع دی گئی، بتایا گیا کہ دوسری گاڑی آرہی ہے، تقریباً ۱۲ گھنٹے اسی شیڈ کے نیچے گزارنے پڑے، کوئی میلہ چل رہا تھا، اس وجہ سے کسی گاڑی میں جگہ نہ تھی، اور ہم لوگ انتظار کے لیے مجبور تھے، ایسی یکجائی کہاں نصیب ہوتی، میدان عرفات ومنیٰ ہی میں ہوسکتی تھی، لیکن اس کی بھی کیا ضمانت تھی کہ ہم لوگ ساتھ ہی حج کریں، اور ایک جگہ ہوں، حضرت کو تو ان کے معتقدین اصرار کرکے وہاں سے لے گئے، اور کسی گھر میں ٹھہرایا، اب ڈاکٹر صاحب اور مولانا عمران خاں صاحب یہاں تنہا تھے، کام کچھ نہ تھا، اور ہو بھی نہیں سکتا تھا، وہاں پر نمازیں پڑھ لینا، کھانا کھانا اور تفریحی گفتگو، اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کی اپنے کو ماحول سے سازگار بنالینے کی خداداد صلاحیت کا اظہار ہوا، کسی طرح سے نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ عالمی شہرت کے ماہر تعلیم ایک نامور جامعہ کے شیخ (وائس چانسلر) اور ماہر اقتصادیات وفلسفہ ہیں، نہ ان کی کسی بات سے اظہار ہوتا تھا کہ

وہ اس تضیع اوقات سے منغّص اور پریشان ہیں، لطائف کے سنانے میں ان کا نمبر سب سے آگے تھا، اور اس اضطراری کیفیت کو خوشگوار اور اختیاری تفریح اور راحت میں تبدیل کرنے میں وہ سب سے زیادہ نمایاں تھے، اللہ اللہ کر کے کوروائی سے موٹر آئی اور ہم سب لوگ بھوپال کے لیے روانہ ہوئے، ڈاکٹر صاحب کچھ دیر خانقاہ میں ٹھہر کر اپنے کسی پرانے دوست علی گڑھ کے اولڈ بوائے کے ہاں جو ریاست کے خاص عہدہ داروں میں تھے، تشریف لے گئے اور اس طرح یہ صحبت ختم ہوئی۔

نومبر ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ کی ڈاکٹر صاحب نے جشن سیمیں (سلور جبلی) منانے کا انتظام کیا، یہ جبلی ان کی ہر دلعزیزی، ان کے وسیع و یکساں تعلقات اور ان کی شخصیت کی کشش و دلآویزی کا نقطۂ عروج تھا، ۱۵ تا ۱۸ نومبر ۱۹۴۶ء اس تاریخی جشن کا سلسلہ جاری رہا، ۱۷ نومبر یکشنبہ جبلی کا خاص جلسہ تھا، لوگوں نے عرصہ سے ایک اسٹیج پر اتنی بڑی تعداد میں سیاسی، تعلیمی، علمی، ادبی میدان کی سربرآوردہ شخصیتوں اور اتنے متضاد عناصر کو پہلو بہ پہلو بیٹھا ہوا نہیں دیکھا ہوگا؛ ہز ہائنس نواب سر حمید اللہ خاں (نواب صاحب بھوپال) جلسہ کے صدر تھے، سامنے کی قطار میں ایک طرف پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، سید آصف علی، اور مسٹر راج گوپال اچاریہ بیٹھے ہوئے تھے، تو ان ہی کے برابر سامنے کی صف میں مسٹر جناح، مسز فاطمہ جناح، نواب زادہ لیاقت علی خاں، سردار عبد الرب نشتر اور نواب غضنفر علی خاں موجود تھے، ڈائس کی پچھلی صفوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، سر شیخ عبد القادر، ڈاکٹر عبد الحق، حفیظ جالندھری، محمد اسد صاحب (سابق لیوپولڈ ویس) اور کتنے نامور اور اہل کمال تشریف فرما تھے، ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر جو خطبۂ استقبالیہ پڑھا، وہ نہ صرف ان کی تحریروں میں خاص امتیاز رکھتا تھا، بلکہ اس کو اردو ادب و انشا کے اچھے نمونوں میں جگہ دی جا سکتی ہے، تعلیم کا موضوع، جامعہ کی ضرورت اور اس کا تعارف ہر ایک سے ان کو وہ تعلق تھا، جو قیس کو لیلیٰ سے اور فرہاد کو شیریں سے تھا، ان کی ادبی صلاحیت (جس پر ان کے دوسرے کمالات نے ہمیشہ پردہ ڈالا) اس موقع پر بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی

تھی، اس سے بہتر موقع اوراس سے موزوں مجمع اس عزیز داستان کے سنانے کے لیے اور کہاں اور کب مل سکتا تھا؟

قسمت سے انھیں دنوں دہلی میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا تھا، اور چاقوزنی کی کچھ وارادتیں پیش آئی تھیں، پانچ بجے شام سے صبح کے ۷ بجے تک شہر میں کرفیو تھا، باہر سے آنے والے مہمان بھی بڑی احتیاط وحفاظت کے ساتھ اپنی قیام گاہ پہنچائے گئے تھے، اس صورت حال کی فریاد بھی ان لوگوں کے سامنے کرنی تھی، جو ہندوستان کی قسمت کے مالک تھے، امن وامان کے ذمہ دار اور جنگ آزادی کے پرانے سپاہی ورہنما تھے، انھوں نے فرمایا:۔

''آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں، لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لیے جگہ ہے، آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں، آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے، یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ اس کے لیے خدمت گزار کیسے پیدا کرسکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں، لیکن ان حالات کے لیے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں، اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے، ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے، جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں، شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ''ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے، اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس

نہیں ہوا'' مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھایئے، یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی۔ آگ لگی ہوئی ہے، اسے بجھایئے، یہ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے، خدا کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجیے''۔

جس وقت انھوں نے اپنے خطبہ کا یہ دلدوز حصہ پڑھا، دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سامنے بیٹھنے والے قائدین میں متعدد حضرات اور (غالباً مولانا آزاد) کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

اپنی تعلیمی جدوجہد، جامعہ کے مقاصد وعزائم اور قربانیوں کی داستان سنا کر فارسی کے مؤثر و بلیغ اس شعر پر اپنے خطبہ کو ختم کیا ۔

آغشتہ ایم ہر سرخارے بخونِ دل
قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

مجھے خوب یاد ہے کہ اسی جلسہ میں میرے اندر یہ ارمان پیدا ہوا کہ ہندوستان کی دینی تعلیم کے نمائندوں کی طرف سے بھی ایک ایسا نمائندہ اور مؤثر اجتماع ہو جس میں دینیات وعلوم اسلامیہ کی تعلیم اور اس کی ترقی کی تجاویز پر غور کیا جائے، ماضی کا جائزہ لیا جائے، مستقبل کا نقشہ بنایا جائے، اس کے لیے قدرۃً میرے سامنے ندوۃ العلماء ہی کا مرکز اور اسٹیج تھا، یہ خیال برابر دل میں موجزن رہا، اور حقیقت میں ۱۹۷۵ء کا ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی اسی خواب کی تعبیر اور اس آرزو کی تکمیل تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی خورد نوازی اور عزت افزائی تھی کہ انھوں نے مجھے بھی اس جبلی کے لیے کوئی مضمون تیار کرنے اور اس میں پیش کرنے کی دعوت دی میں نے ''عہد نبوی کا نظام تعلیم'' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا، جس میں مولانا محمد الیاس صاحب کی صحبت

اوران کے علوم ومعارف کا عکس تھا، زبان ادبی اور عصری رکھی گئی تھی، اور جدید معلومات اور تعلیمی نظریوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا تھا، یہ ۱۵/نومبر جمعہ کورات کے اس جلسہ میں پڑھا گیا جس کی صدارت مولانا سید سلیمان ندوی نے کی، اس نشست میں مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تقریر اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی کا مقالہ بھی تھا، میں نے یہ مقالہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا، اوران سے درخواست کی کہ وہ اس پر پیش لفظ کے طور پر کچھ لکھ دیں، ڈاکٹر صاحب نے ازراہ شفقت اس کو منظور کرلیا، غالباً میری یاددہانی پرانھوں نے حسب ذیل خط لکھا جو یہاں درج ہے، اس کی سطر سطر سے ان کی طبیعت کی شرافت اور عالی ظرفی نمایاں ہے۔

صدر دفتر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ نگر، ۳/دسمبر ۱۹۴۶ء

محب محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ ملا، یادفرمائی کا شکریہ، میں نادم ہوں کہ جبلی کے زمانہ میں مصروفیت کے باعث حاضری کا وقت نہ نکال سکا، اورآپ نے جوزحمت جامعہ کی خاطر گوارافرمائی اس کا شکریہ بھی ادانہ کرپایا، لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ بھی آپ ہی کا کام ہے، اس لیے امید ہے کہ آپ اس کوتاہی کو معاف فرمائیں گے۔

آپ کا مقالہ بہت ہی اچھا تھا، اس پر کسی پیش لفظ کی ضرورت سچ پوچھیے توہے ہی نہیں، آپ میری عزت افزائی چاہتے ہیں تو میں ضرور پیش لفظ لکھ دوں گا، اس لیے نہیں کہ اس سے لوگ مقالہ کی طرف زیادہ متوجہ ہوں گے بلکہ اس لیے کہ مجھے آپ کے ساتھ شریک ہونے کا شرف حاصل ہوجائے گا۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

والسلام

مخلص ذاکرحسین

لیکن افسوس ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئی، ۱۹۴۷ء کے عین فسادات کے زمانہ میں ڈاکٹر صاحب تبدیلی آب وہوا کے لیے کشمیر جارہے تھے، مقالہ، دوسرے مسودات اور ضروری کاغذات کے ساتھ ان کے سوٹ کیس میں تھا، جالندھر کے اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو ان کو اتار لیا گیا، قریب تھا کہ وہ اس وحشیانہ حملہ کے نذر ہو جائیں کہ اسٹیشن ماسٹر کی جوان کی شخصیت سے واقف تھے، ان پر نظر پڑی، وہ بڑی مشکل سے ان کو فسادیوں کے نرغہ سے نکال کر محفوظ مقام پر پہنچانے میں کامیاب ہوئے، اس افراتفری میں ان کا سامان ضائع ہو گیا، اس سامان میں وہ مقالہ بھی تھا، ڈاکٹر صاحب نے بڑے افسوس و شرمندگی کے ساتھ اس کی مجھے اطلاع دی، میرے پاس اس کا ایک ابتدائی مسودہ تھا، میں نے اس پر نظر ثانی کر کے اس کو ''الفرقان'' میں شائع کرا دیا، اس طرح اس مقدمہ کی نوبت نہیں آئی۔

۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بہی خواہوں کے اصرار اور غالباً مولانا آزاد کی شدید خواہش پر مسلم یونیورسٹی کی جو اس وقت ایک بڑے پرآشوب دور سے گزر رہی تھی، وائس چانسلری قبول کر لی، علی گڑھ کے معاملہ میں وہ ہمیشہ سے (معذرت کے ساتھ) کمزور واقع ہوئے تھے، پوری تعلیم وہیں حاصل کی تھی، وہیں ان کے جوہر فطری نے پر و بال نکالے تھے، سارے ذوقی وسیاسی اختلافات کے باوجود جن کی بنا پر انھوں نے جامعہ سے وابستگی اختیار کی تھی، مسلم یونیورسٹی ان کی ہمیشہ عزیز رہی، اسی لیے وہ اس تحریک کی مقاومت نہیں کر سکے، اور انھوں نے (غالباً وقتی طور پر) نومبر ۱۹۴۸ء میں جامعہ کی ذمہ داری اپنے رفیق کار پروفیسر محمد مجیب صاحب کے سپرد کر کے علی گڑھ کی راہ اختیار کی، ان کے بہت سے قدردانوں اور نیازمندوں کو یہ بات بہت کھلی اور انھوں نے اس کو ڈاکٹر صاحب کی ضرورت سے زیادہ مروت اور نرمی اور علی گڑھ سے وفاداری پر محمول کیا، میں ہوتا تو میں بھی عرض کرتا کہ آپ کی کوششوں اور صلاحیتوں اور توانائیوں کا اصل میدان جامعہ ہی ہے، جس کے درخت کو آپ نے خون جگر سے سینچا ہے، میں اقبال کا مصرعہ ان کو سناتا کہ ؎

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

لیکن انسانوں کے فیصلوں کے اندرونی محرکات اور انسان کی مجبوریوں کا اندازہ ہر ایک نہیں لگا سکتا، بہر حال جامعہ کو بڑا دھکا لگا، اور وہ اس وقت سے اپنے اس راستہ سے ہٹتی چلی گئی، جس پر مولانا محمد علی نے اس کو قائم واستوار کیا تھا، اور افسوس ہے کہ مسلم یونیورسٹی کو بھی ان کی ذات سے فائدہ نہیں پہنچا، جس کی توقع تھی، اور جوان کی شخصیت، سابقہ زندگی اور روایات کے ہر طرح شایان شان تھا، بلکہ بعض فیصلے اور اقدامات ان سے ایسے منسوب اور ان کی ذات سے وابستہ ہو گئے کہ جنھوں نے خود مسلم یونیورسٹی کو اس کے اس قدیم راستہ سے ہٹا دیا جس پر وہ عرصہ سے چلی آ رہی تھی، اور بعض ایسے لوگ وہاں آ گئے، جنھوں نے اس کے اسلامی کیرکٹر کو نقصان پہنچایا، اس کی توجیہ بھی ڈاکٹر صاحب کی بڑھی ہوئی مروت اور سیکولرزم پر ضرورت سے زائد یقین رکھنے کے سوا نہیں کی جا سکتی، ان کے بعض رفقائے کار اور مخلصین کا خیال ہے کہ یہ یونیورسٹی کو بعض خطروں سے بچانے کے لیے کیا گیا تھا، جہاں تک مسلم یونیورسٹی کی مسلم شخصیت (Personality) اور اقلیتی کردار کے بقاو تحفظ کا تعلق ہے، یہ کام ان کے چھوٹے بھائی فاضل گرامی ڈاکٹر یوسف حسین خاں (۱) نے زیادہ جرأت وعزم اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا، وہ ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر منتخب ہوئے، میں ان کے دور میں دو تین بار علی گڑھ گیا میں نے دیکھا کہ ان کی شخصیت وہاں بڑی باوقار اور اسلام پسند حلقوں میں زیادہ مقبول ومحبوب ہے، اس کو توفیق الٰہی کے سوا اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے "ذلك فضل اللّٰه يؤتيه من يشاء".

ڈاکٹر صاحب کی وائس چانسلری کے زمانہ میں بھی دو تین بار علی گڑھ جانا ہوا، ہر مرتبہ وہ ناشتہ پر ضرور مدعو کرتے، اس کا عنوان بھی بہت لطیف اختیار کرتے، فرماتے کہ "کھچڑی کی دعوت ہے، اور کھچڑی گھی کھانے کا بہانہ ہے، قائم گنج سے اصلی گھی آیا ہوا ہے" اس دعوت میں دو ایک بار مولانا منظور صاحب نعمانی بھی تھے، علی گڑھ جانے کی تقریب، یونین میں تقریر

(۱) افسوس ہے کہ ان سطور کے لکھنے کے بعد انھوں نے بھی سفر آخرت اختیار کیا۔

یا کسی دینی موضوع پر اسٹریچی حال میں خطاب ہوتا، اس زمانہ میں ڈاکٹر ظفر احمد صاحب بدایونی صدر شعبہ فلسفہ کی طرف سے دینی خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا تھا، جس کا مقصد اسلامی عقائد و دینی حقائق کو شعبۂ فلسفہ و نفسیات کے طلبہ اور یونیورسٹی کے اساتذہ و نوجوانوں کے سامنے شگفتہ علمی انداز میں پیش کرنا تھا، ڈاکٹر صاحب بھی ان لکچروں میں شریک ہوتے، اور یادش بخیر ڈپٹی حبیب اللہ صاحب مرحوم بھی (جو یونیورسٹی کے قدیم ترین اولڈ بوائز میں تھے، اور بڑے راسخ العقیدہ، خوش اوقات اور اسلام کے شیدائی مسلمان تھے) بڑے اہتمام سے شریک ہوتے اور بڑی محبت کا اظہار فرماتے۔

پھر وہ وقت آیا کہ ڈاکٹر صاحب کی اسی خوبی یا کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کہ وہ اپنے دوستوں کی کسی بات کو بختی سے ٹال نہیں سکتے، جواہر لال صاحب نے ان کو بہار کی گورنری پر آمادہ کرلیا، اندرونی و خاندانی طور پر اس کے دواعی و محرکات کیا تھے، اس کو وہی لوگ بتا سکتے ہیں، جو ڈاکٹر صاحب کی ذاتی و خانگی زندگی سے گہری واقفیت رکھتے ہوں، خود ڈاکٹر صاحب نے اس سے ملک وملت کی خدمت کی کیا توقعات وابستہ کی تھیں اس کا حال بھی عالم الغیب کے سوا کوئی نہیں جانتا، بہر حال ان کے شاگردوں اور نیازمندوں کے لیے یہ ایک حادثہ تھا، اور ان کے مرتبہ شناسوں کے لیے ایک ذہنی صدمہ، کسی ملک و معاشرہ کے باضمیر نوجوانوں کی استقامت، ایثار و قربانی کی روایات کے تسلسل، علم و انسانیت کی بے لوث خدمت کے دوام کے لیے جہاں اور بہت سی باتوں کی ضرورت ہے، وہاں اس کی بھی ضرورت ہے کہ معاشرہ میں کچھ لوگ ایسے ہوں جو کسی حال اور کسی قیمت پر اس میدان کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوں جو انھوں نے شروع میں اپنی خدمت و اپنی صلاحیتوں کے استعمال کے لیے انتخاب کیا تھا، اگر ایک ایک کرکے یہ سب ستون منہدم ہوجائیں اور سب عنقا صفت اور شاہین و شہباز شکار ہو جائیں تو نوجوانوں کی ہمت بڑھانے والی اور ان کو ایثار و قربانی کے جادۂ دشوار و نازک پر قائم رکھنے والی کوئی چیز نہیں ہوسکتی، بہر حال ڈاکٹر صاحب کی جائے قیام اب مئی ۱۹۵۷ء سے مئی ۱۹۶۲ء تک اپنے منصب و عہدہ کی

بنیاد پر (جوان کے لیے اتنا باعث زینت نہ تھا، جتنا وہ اس کے لیے باعث زینت تھے) شیخ الجامعہ کی قیام گاہ کے بجائے پٹنہ کا گورنمنٹ ہاؤس تھا۔

اس دور میں بھی ایک مرتبہ ان کا نیاز حاصل ہوا، میں ایک دینی انجمن کی ایک دعوت پر پٹنہ گیا تھا، خیال ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو کہیں نہ کہیں سے معلوم ہو جائے گا کہ میں آیا تھا، اور بے ملے چلا گیا، میں نے ملاقات کے لیے وقت لیا فوراً اپائنٹمنٹ ہو گیا، میں اور رفیق سفر مولوی معین اللہ صاحب ندوی (حال نائب ناظم ندوۃ العلماء) گورنمنٹ ہاؤس کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں ریلوے کراسنگ بند ہو جانے کی وجہ سے پہنچنے میں خاصی دیر ہو گئی، گورنر کے پرسنل سکریٹری نے اس پر بڑی شکایت اور تنقید کی کہ آپ گورنر صاحب سے ملنے آئے ہیں، اتنی تاخیر سے پہنچے، وہ بڑی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، لیکن جب ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں پہنچے تو وہ اسی پرتپاک اور مشفقانہ طور پر ملے جیسے ہمیشہ ملتے تھے، ان کے پاس بیٹھ کر ایسا محسوس ہوا کہ ایک شہباز کو قفس زریں میں محبوس کر دیا گیا ہے، ڈاکٹر صاحب گفتگو میں کئی مرتبہ آبدیدہ ہو گئے، ان کی آواز گلوگیر ہو گئی، علی گڑھ کا تذکرہ اب بھی وہ اسی محبت اور تعلق خاطر کے ساتھ کرتے تھے، اور وہاں کے حالات سے پریشان تھے۔

اسی زمانہ میں میں نے اپنی نئی تصنیف ''تذکرہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن'' بھیجا، انھوں نے اس کے مطالعہ پر اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا، وہ بلند و روشن دماغ کے ساتھ ایک محبت آشنا اور دردمند دل بھی رکھتے تھے، اہل دل اور اہل درد سے ان کو ہمیشہ عقیدت رہی جس کی غمازی ان کی وہ تقریریں کرتی ہیں، جو انھوں نے خواجہ فریدالدین گنج شکر اور بعض اور صوفیوں پر کیں، یہ خط پڑھنے کے قابل ہے، آپ بھی پڑھتے چلیے۔

راج بھون پٹنہ

۱۷/اکتوبر ۱۹۵۹ء

محب محترم علی میاں السلام علیکم

حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کا تذکرہ جو غالباً آپ ہی

نے ازراہ کرم مجھے بھجوایا ہے ملا، یادفرمائی کا شکریہ کیسے ادا کروں، تذکرہ جس وقت ملا اسی وقت پڑھنا شروع کردیا، اور جب تک ختم نہ کردیا اسے ہاتھ سے الگ نہ کیا، عشق ومستی اور اتباع سنت کا ایسا مجموعہ کہاں دیکھنے کو ملتا ہے، اس مختصر رسالہ کو پڑھ کر ایسا لگا کہ مجھے حضرت کی خدمت میں شرف باریابی حاصل ہوگیا ہو، آپ اس سے زیادہ اور کیا کرسکتے تھے، آگے اپنی قسمت، کتاب چھپی بھی بہت اچھی ہے، اور غلطی بھی کوئی نظر سے نہیں گزری۔

ہاں آپ نے صفحہ ۸۳ پر لکھا ہے کہ ''قرآن مجید کی کچھ سورتوں اور حصوں کا ترجمہ فرمایا تھا، جو ایک بار گلشن ابراہیمی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، اور اب نایاب ہے'' اس کا نسخہ کہیں سے حاصل ہوسکتا تو بہت اچھا تھا، اس لیے کہ ترجمہ کے جو نمونے آپ نے دیئے ہیں، ان میں بڑی مٹھاس ہے، مجھے خیال ہوتا ہے کہ ایک بار بعض حصوں کا ترجمہ صدریار جنگ (۱) مرحوم کے کتب خانہ میں دیکھا تھا، یہ خیال نہیں کہ کہاں کا چھپا ہوا تھا، شاید کچھ ترجمہ بمبئی میں دسنوی (۲) صاحب نے ہندی رسم خط میں چھپوایا تھا، ایسا یاد ہوتا ہے کہ اس کا پروف انھوں نے مجھے دکھایا تھا، مگر مجھے اپنے حافظہ پر پورا بھروسہ نہیں رہا، پتہ چلایئے۔

خدا کرے آپ اچھی طرح ہوں، اور آپ کے قلم کے فیضان اور آپ کے زندگی کے نمونہ سے ایک پراگندہ حال امت کو ذہنی وروحانی جمعیت خاطر نصیب ہو، میں اندھا ہوں، ان چیزوں کو کیا دیکھ سکتا ہوں، مگر اٹکل سے ایسا لگتا ہے کہ مشیت کو آپ سے یہ کام لینا منظور ہے۔

والسلام

مخلص، ذاکر حسین

---

(۱) نواب صدریار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی۔

(۲) سید شہاب الدین صاحب دسنوی سابق پرنسپل صابو صدیق پالی ٹکنک بمبئی۔

اس کے بعد میرا معمول ہوگیا کہ میری کوئی اہم چیز شائع ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ضرور بھیجتا، ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا تیسرا حصہ جو سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء، مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہاری کے تذکرہ پر مشتمل ہے، شائع ہوا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجا، ڈاکٹر صاحب ۱۳رمئی ۱۹۶۲ء سے نائب صدر جمہوریہ تھے، اور دہلی میں مقیم تھے، کتاب کی رسید میں انھوں نے حسب ذیل خط لکھا۔

وائس پریسیڈنٹ، نئی دہلی

مورخہ ۱۵رجولائی ۱۹۶۳ء

محب محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''تاریخ دعوت وعزیمت'' کے تیسرے حصہ کا ایک نسخہ مجھے کئی روز ہوئے ملا تھا، گمان یہی ہے کہ آپ نے ازراہ کرم بھیجا یا بھجوایا ہوگا، کن کا ذکر ہے، اور کس کے قلم سے؟ اچھوں کا حال سن کر اپنی برائیاں کس وضاحت سے سامنے آتی ہیں، اور کیسا کیسا رُلاتی ہیں، آپ کی کتاب نے بہت رُلایا لیکن پھر تسکین بھی تو دی، خدا آپ کو جزائے خیر دے۔

والسلام

مخلص ذاکر حسین

اس طرح کا تأثر انھوں نے ''سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ'' کے متعلق ظاہر کیا، وہ حضرت سے کئی بار ملے تھے، جبلی کے اختتام پر غالباً جامعہ کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے انھوں نے مولانا کو جو اس وقت نظام الدین دہلی میں مقیم تھے، زحمت دی تھی، اس موقع پر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب بھی تشریف لے گئے تھے، اور راقم سطور بھی ہم رکاب تھا، ڈاکٹر صاحب ۱۵رجنوری ۱۹۶۴ء کو ایک خط میں اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''سوانح حضرت عبدالقادر رائے پوری'' کا جو نسخہ آپ نے ازراہ

ذاکرنوازی بھیجا تھا، وہ ابھی کل پڑھ کر ختم کیا، حضرت رائے پوری کا ذکراور آپ کے قلم سے، اس کتاب کا مطالعہ ایک گرانقدر تعلیمی اور تربیتی تجربہ ہے، جس سے ایمان تازہ ہوتا ہے، اور صالح زندگی کا ولولہ دل میں پیدا ہوتا ہے، آپ کے قلم سے اس زمانہ میں جو تحریریں نکلی ہیں، ان سب کا یہی حال ہے، خدا آپ کے مساعی میں برکت دے اور اپنے بندوں کی ہدایت کا دیر تک آپ سے کام لے"۔

والسلام

مخلص ذاکر حسین

ڈاکٹر صاحب جب سے گورنر سے وائس پریسیڈنٹ ہوئے تھے حاضری کی نوبت بہت کم آئی تھی، ایک بار گورنری کے زمانہ میں ملنا اور ایک بار وائس پریسیڈنسی کے زمانہ میں دوسری ملاقات اس تقریب میں پیش آئی کہ رابطہ عالم اسلامی کا جلسہ اور غالباً اس کی کانفرنس ہونے والی تھی، سن غالباً ۱۹۶۵ء تھا، مجھے اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کو...... مالک رام صاحب کے ذریعہ جو اس وقت فارن منسٹری میں سکریٹری تھے، یہ پیغام ملا کہ عالی جناب نائب صدر جمہوریہ کی یہ خواہش ہے کہ آپ مکہ جاتے ہوئے دہلی میں ان سے مل لیں، مجھے تردد ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بزرگ ہیں اور شروع سے میرا ان کا خوردی بزرگی کا تعلق ہے وہ کوئی ایسی بات نہ فرمائیں جو میرے لیے قابل قبول یا قابل سکوت نہ ہو، ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے کوئی ایسی بات نہیں فرمائی جس سے ہم لوگوں پر کوئی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہو، ساری گفتگو دوستانہ اور مساویانہ فضا میں ہوئی اور ہم لوگ ان کی متانت وشرافت کی تعریف کرتے ہوئے واپس ہوئے۔

وہ نائب صدر جمہوریہ ہی تھے کہ مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم دارالمصنفین اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے دارالمصنفین کا جشن طلائی (گولڈن جبلی) منانے کا فیصلہ کیا، ۲۰، ۲۱ رفروری ۱۹۶۵ء کو یہ جبلی ہوئی اس جشن علمی وادبی

کی صدارت کے لیے ڈاکٹر صاحب سے زیادہ موزوں کون ہوسکتا تھا؟ وہ عہدہ اور اعزاز کے اعتبار سے بھی، اور بانی دارالمصنفین علامہ شبلی کے فضل وکمال کے معترف وعقیدت مند اور مولانا سید سلیمان ندوی کے دوست اور نیاز مند کی حیثیت سے بھی ہر طرح موزوں تھے، خود صاحب ذوق ادیب اور صاحب قلم تھے، یہ انتخاب محض خانہ پُری نہ تھا، ہر طرح سے حق بجانب بلکہ خوش مذاقی پر دال تھا، ڈاکٹر صاحب نے بھی اس کو بخوشی منظور کیا، وہ بڑی خوشی سے آئے، اور جب تک رہے، بہت منشرح، مسرور اور بے تکلف رہے، انھوں نے اس موقع پر جو خطبہ دیا وہ ہر طرح ان کے بھی شایان شان تھا اور دارالمصنفین کے بھی، اس میں مطالعہ بھی تھا، ثقاہت بھی، ادبیت بھی، فکر کی گہرائی بھی، اور سن وسال کی پختگی بھی، اس موقع پر ملک کے ادیب ودانشور، مصنف ومحقق، یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور ملک کے سربرآوردہ اشخاص، نیز ممتاز علماء اور مدارس عربیہ کے فضلاء بڑی تعداد میں جمع تھے، سعودی سفیر ہزاکسلنسی شیخ محمد حمد الشبیلی بھی تشریف لائے تھے، ڈاکٹر صاحب سب سے پہلے کتب خانہ کے ہال میں آئے، لوگ استقبال کے لیے موجود تھے، میں ایک طرف دبکا ہوا کھڑا تھا کہ پروانوں کے اس ہجوم میں میری کیا حیثیت ہوگی؟ ڈاکٹر صاحب کی نظر پڑ گئی، آواز دے کر بلایا اور کہا کہ آپ کہاں چھپ رہے ہیں؟ آیئے! پھر خود ہی مصافحہ ومعانقہ کیا، مولانا مسعود علی صاحب ندوی جو کبھی ان کے ساتھ جامعہ کے لیے برما، ملایا کا سفر کر چکے تھے، اور اب معذور اور خانہ نشین تھے، ڈاکٹر صاحب ان کے مکان پر ملنے گئے، ڈاکٹر صاحب کا خیمہ شبلی منزل کے احاطہ سے باہر شبلی کالج کے میدان میں تھا، مگر دارالمصنفین مسجد میں نماز پڑھنے آتے اور جہاں جگہ ملتی وہاں کھڑے ہوجاتے۔

آخر میں وہ وقت بھی آگیا کہ وہ صدر جمہوریہ منتخب ہوئے، ۹رمئی ۱۹۶۷ء کو مقابلہ میں ان کی کامیابی کا اعلان ہوا، اور ۱۳رمئی ۱۹۶۷ء کو انھوں نے حلف وفاداری اٹھایا، یہ حکومت ہند کے اعزاز واکرام اور وثوق اعتماد کے ترکش کا آخری تیر تھا، اس کے بعد جو واقعات پیش آئے، جن پر ان کے نیاز مندوں کو کبھی تعجب اور کبھی افسوس ہوا، وہ سب اس

راستہ کی منزلیں تھیں، اوراس منصب کے تقاضے (یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ناگزیر) بہرحال ان سے خلوص رکھنے والے ان لوگوں کو جن کے سامنے ان کی سابقہ ایثار پیشہ زندگی اور شاندار تاریخ تھی، اور جو ڈاکٹر صاحب کو ان باتوں سے بلند سمجھتے تھے، ایک دھکا لگا، لیکن جو لوگ انسانی نفسیات اور سیاسی وحکومتی روایات سے واقف تھے، انھوں نے غالب کا یہ مصرعہ پڑھ کر دل کو تسکین دی ع

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس منصب کے لیے کوئی آدمی ڈاکٹر صاحب سے زیادہ سجا نہیں، ان کی خوش قسمتی ہو نہ ہو لیکن ہندوستان کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو ایک ایسا سجنے والا صدر جمہوریہ ملا جو علمی، دماغی، بیانی اور جسمانی ہر لحاظ سے اس کے لیے نہ صرف موزوں بلکہ اس کا وقار بڑھانے والا تھا۔

بالآخر ۳ر مئی ۱۹۶۹ء سنیچر کے دن صبح کے سوا گیارہ بجے وہ ساعت آ گئی، جس کو نہ کسی غریب کے جھونپڑے میں در آنے سے تکلف ہے، نہ کسی صدر کے ایوان حکومت میں داخل ہونے سے خوف "اَيْنَـمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِىْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ" البتہ دنیا نے یہ دیکھا کہ یہ ایوان حکومت پہلی مرتبہ اس کلمہ گو مسلمان کی وفات پر قرآن کی تلاوت سے گونجتا رہا اور ہزاروں مسلمانوں نے جن میں بڑے صاحب ایمان اور صاحب علم تھے، اس کی نماز جنازہ پڑھی۔

غفر اللّٰہ لہ و تجاوز عنہ۔

□□□

چند بزرگ شخصیتیں

- الحاج مفتی امین الحسینی
- مولانا مسعود علی ندوی
- مولانا عبدالباری ندوی
- مولانا محمد سلیم مکی

الحاج مفتی امین الحسینی

میں جب مفتی صاحب کی نورانی صورت دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک فرشتہ آسمان سے نازل ہوا ہے، ان کے اندر محبوبیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، شرافت خاندانی پیشانی سے جھلکتی بلکہ ابلتی تھی، جذبۂ جہاد کا نور ان کی ہر ادا سے اور ہر پہلو سے ظاہر ہوتا تھا، وہ عمر کے اس مرحلہ میں تھے، جس میں یہ بات ہر طرح قرین قیاس تھی کہ عالم اسلام بہت جلد ان کی ذات سے محروم ہو جائے گا، جب اس حادثہ کا علم ہوا تو وہ ساری باتیں کتاب کی طرح کھل کر سامنے آگئیں، اکتالیس برس کی رفاقت تو نہیں کہتا کہ ایک خورد بزرگ کی رفاقت ہی کیا؟ مگر اکتالیس سال کی نیازمندی اور چالیس اکتالیس سال کی محبت اور واقفیت ایک کھلے ہوئے صحیفہ کی طرح سامنے آگئی، اس کا ہر صفحہ نورانی اور ہر ورق زرّیں ہے۔

آج سے اکتالیس برس پہلے کی بات ہے، ۱۹۳۳ء تھا، میں اپنی طالب علمی کے آخری دور میں تھا، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی اور کئی رفقاء...... مفتی صاحب کا ذکر اس طرح سنتے اور عربی اور اسلامی اخبارات میں پڑھتے تھے جیسے کوئی آدمی گزشتہ صدی کے بزرگوں کے متعلق سنتا اور پڑھتا ہے، جو دنیا سے بڑے بڑے کارنامے انجام دے کر رخصت ہو گئے، یا افق پر کوئی بڑا اور درخشاں ستارہ دور سے دیکھتا ہے، مگر وہ اس کو پا نہیں سکتا، لیکن وہ اس کو چمکتا ہوا نظر آتا ہے، وہ عمر بھر مسلمانوں کی ایک محبوب و مقدس سرزمین فلسطین اور ان کے قبلۂ اول بیت المقدس کے لیے سینہ سپر رہے، ایک ایسی سرزمین جس کی خدمت کے لیے تقدیر الٰہی نے ہمیشہ اولوالعزم سلاطین اور جانباز اور جانفروش مجاہدین کا انتخاب کیا، وہ فہرست فاروق اعظمؓ سے شروع ہو کر، صلاح الدین ایوبیؒ سے لے کر خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید پر ختم

ہوتی ہے، اس فہرست میں ناموں کا اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ آخری دور میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ مفتی امین الحسینیؒ پر ختم ہوئی، اس وقت اردو اخبارات سے زیادہ عربی اخبارات کا مطالعہ رہتا تھا، اس زمانہ میں "الجامعۃ الاسلامیہ" کے نام سے یافہ سے ایک عربی اخبار نکلتا تھا، جس کے آتشیں افتتاحیے شعلے برساتے تھے، "الجامعة الاسلامية" "سماحة المفتي الأكبر السيد الحاج أمين الحسيني" کے نام سے ایک ایسی شخصیت کا بار بار ذکر کرتا تھا جس سے محبت اور عظمت ٹپکتی تھی، اس کا شاید ہی کوئی شمارہ ہو جس میں مفتی صاحب کا نام نہ آتا ہو، پھر اس کے بعد ہم نے سنا کہ انھوں نے فلسطین میں ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد کی، جس میں ہمارے ہندوستان سے علامہ اقبالؒ اور مولانا شوکت علیؒ نے اس میں شرکت کی، یہ سب واقعات ہم سنتے تھے، مسئلہ فلسطین اس وقت اپنی پوری تابانی اور اہمیت کے ساتھ زندہ تھا، فلسطین عرب برطانوی انتداب (Mandate) سے پنجہ آزمائی کر رہے تھے، اور مفتی صاحب اس گروہ مجاہدین کے سرخیل تھے۔

اس وقت یہ خیال بھی نہیں تھا کہ ہماری آنکھیں مفتی صاحب کے دیدار سے منور ہوں گی کہ اچانک ہندوستان کے اخبارات میں پڑھا کہ مصر و فلسطین کا ایک وفد ہندوستان کا دورہ کر رہا ہے، جس کے ایک رکن مفتی اعظم فلسطین اور دوسرے رکن محمد علی علوبہ پاشا سابق وزیر اوقاف حکومت مصر اور مصر کی مشہور پارٹی "حزب الأحرار الدستوريين" کے صدر ہیں، پھر ایک دن ہم نے سنا کہ وہ وفد لکھنؤ آیا، میرے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم جو اس وقت ناظم ندوۃ العلماء تھے، انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں ان سے ملوں، برلنگٹن ہوٹل میں میں اور میرے ساتھ غالباً مولانا مسعود عالم صاحب ندوی ان سے ملے اور انھیں دارالعلوم آنے کی دعوت دی، انھوں نے بغیر کسی توقف کے اور بڑی کشادہ پیشانی کے ساتھ اسے قبول فرمایا ع

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

مفتی صاحب کو دیکھنا ہی بڑے فخر کی بات تھی ہم لوگ خوشی خوشی واپس آئے،

یہاں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا، اس وقت اتفاق سے مولانا سید سلیمان ندویؒ تشریف نہیں رکھتے تھے، ورنہ مفتی صاحب بھی بہت خوش ہوتے اور سید صاحب کو بھی بڑی مسرت ہوتی، غرض مفتی صاحب اور محمد علی علوبہ پاشا دار العلوم آئے، ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا، تقریر کی گئی، اس کے بعد مفتی صاحب نے جوابی تقریر کی مجھے خوب یاد ہے کہ انھوں نے تقریر میں کچھ تمہید کے بعد فرمایا کہ ندوۃ العلماء کا ذکر خیر بہت زمانہ سے سنتا تھا، غالباً سید صاحب کا بھی انھوں نے ذکر کیا کہ وہ ہمارے دوست ہیں آج مجھے دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی اور یہ شعر پڑھا ؎

كانت محادثة الركبان تخبرنا عن جعفر بن فلاح اطيب الخبر

حتى التقينا فلا والله ماسمعت اذني بأحسن مما قدر أى بصرى

(ترجمہ): واپس ہونے والے قافلوں کے ہم سفر جعفر بن فلاح کی تعریف کرتے تھے، اور ہم ان کی تعریفیں سن سن کر نادیدہ ان کے عاشق بن گئے تھے، یہاں تک کہ جب ہم ان سے ملے تو قسم خدا کی میرے کانوں نے اس سے بہتر نہیں سنا تھا، جو میری آنکھوں نے دیکھا۔

مفتی صاحب نے ندوۃ العلماء اور دار العلوم کے متعلق یہ شعر خلوص سے پڑھے اور واقعی ان کو مسرت حاصل ہوئی ہوگی لیکن حقیقۃً وہ ہمارے حسب حال تھے کہ واقعی ہم جس جعفر بن فلاح کے متعلق سنتے تھے، ہماری اس سے ملاقات ہوئی تو ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ جو کچھ سنا تھا اس سے زیادہ پایا، ان کی تقریر کے بعد محمد علی علوبہ پاشا کی تقریر ہوئی پھر جب وہ یہاں سے نکلے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ بچے عربی سمجھتے ہیں، تو میں نے کہا کہ سمجھتے ہیں، اتفاق سے ایک بچہ ان کے سامنے آ گیا، اس نے اس زمانہ میں غالباً عربی سنی بھی نہیں تھی، اس سے انھوں نے پوچھا ما اسمک؟ میں ڈرا کہ یہ بچہ کیا جواب دے گا، لیکن اس نے برجستہ جواب دیا کہ اسمي محمد الثاني، وہ ہمارے بڑے بھانجے محمد ثانی حسنی مدیر ''رضوان'' ہیں، مفتی صاحب بہت خوش ہوئے اور جاتے ہوئے بھی انھوں نے اس کا ذکر کیا

اور ۱۹۵۱ء میں مصر میں جب ان سے ملاقات ہوئی تو ان کو یہ واقعہ یاد تھا۔

یہ تھی ہماری پہلی ملاقات مفتی صاحب سے، اس کے بعد پھر ان کے مجاہدانہ کارناموں کی گونج اسلامی دنیا میں سنی جاتی رہی، یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم آگئی، اس موقع پر انھوں نے انگریزی حکومت کا بڑی دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا، اس وقت قضیۂ فلسطین کے علمبردار سب سے بڑے وکیل اور اس کے قائد مفتی صاحب ہی تھے، دوسری جنگ کے دوران قریب تھا کہ وہ گرفتار ہو جائیں، یا ان کو موت کی سزا دے دی جائے لیکن وہ بڑی جانبازی اور پھرتیلے پن کے ساتھ فلسطین سے نکل گئے، وہ ایران اور وہاں سے جرمنی گئے، جرمنی میں عرصہ تک اتحادیوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے رہے، جب اس کا سقوط ہوا تو انھوں نے فرانس میں پناہ لی، ابھی ان کے ایک مضمون سے معلوم ہوا کہ حکومت برطانیہ نے کئی بار مطالبہ کیا کہ ان کو حوالہ کیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کی جان بچانی مقصود تھی، اور ان سے اور بھی کام لینا تھا، حکومت فرانس نے ہر مرتبہ انکار کیا، اور کہا کہ ہم اس کے پابند نہیں ہیں، چنانچہ مفتی صاحب زندہ سلامت پھر واپس آئے، اب حالت یہ تھی کہ خود ان کا وطن ان کے لیے تنگ ہو گیا تھا، حالات بہت بدل گئے تھے، فلسطین ملک عبد اللہ کے سپرد کیا گیا تھا، ان کے اور ملک عبد اللہ مرحوم کے مسلک و مقصد میں اختلاف تھا، جو لوگ واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ اور خاص طور پر حرمین شریفین میں ایک آندھی چلی تھی، سرخ آندھی، یہ ترکوں کے خلاف وہ بغاوت تھی جو اتحادیوں نے برپا کروائی تھی، وہ دن عربوں کی تاریخ کا بڑا منحوس دن تھا، اگر عربوں کی تاریخ کبھی صداقت و دیانت کے ساتھ لکھی جائے گی، تو یہ لکھا جائے گا کہ عربوں کی تاریخ کا سب سے تاریک دن یا منحوس گھڑی وہ تھی، جب عربوں نے خلافت اسلامیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، جو مقامات مقدسہ کی محافظ اور امین تھی، اس سے بڑھ کر مہلک غلطی عربوں نے آج تک نہیں کی، اس زمانہ میں ایک چھوٹی سی جماعت عربوں کے رجحان کے خلاف تھی، اس کا عقیدہ تھا کہ عرب خودکشی کا ارتکاب کر رہے ہیں، وہ خلیفۃ المسلمین کے خلاف بغاوت کر کے اپنے

سب سے بڑے دشمن انگریز کا آلہ کار بن گئے ہیں، اس چھوٹی سی جماعت میں جو لوگ بہت نمایاں تھے، ان میں امیر شکیب ارسلان اور مفتی امین الحسینی ہیں۔

ان حضرات کی عرب قوم پرستی کے خلاف بغاوت کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی نگاہ دوربیں اور ان کا تاریخی مطالعہ وسیع اور عمیق تھا، وہ جانتے تھے کہ اس زمانہ میں اس کی مخالفت کرنا اپنے کو خطرے میں ڈالنا تھا، بے عزتی اور یہاں تک بعض اوقات ہلاکت کا سامان مہیا کرنا تھا، شکیب ارسلان اور مفتی امین الحسینی دونوں ترکوں سے اور ان کی خدمات سے واقف تھے، مفتی امین الحسینی صاحب نے فوجی تربیت بھی حاصل کی تھی، اور ترکوں کے ساتھ غالباً جنگ میں شریک بھی رہے تھے، وہ اس رجحان کا ساتھ نہ دے سکے، جب جنگ ختم ہوئی اور اس کے نتیجہ میں شام کو بجائے ایک ملک کے چار ملکوں میں تقسیم کردیا گیا، سوریا، فلسطین، شرق اردن اور لبنان، شرق اردن کا جو حصہ تھا وہ ملک عبداللہ کے حصہ میں آگیا، اور ان کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ اگر حرم شریف کی تولیت سے وہ محروم ہو گئے ہیں تو کچھ غم نہیں بیت المقدس ان کے سپرد کر دیا جائے گا، مفتی امین الحسینی صاحب وہاں ٹھہر نہ سکے، مصر آگئے، مصر میں ان کا پورا اعزاز واکرام ہوا، اور حکومت مصر نے جیسا کہ ایک مخلص اور جانباز مجاہد کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے، ان کے شایانِ شان معاملہ کیا، اور ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا۔

۱۹۵۱ء میں جب ہم لوگ قاہرہ گئے تو ایک دعوت میں مفتی صاحب سے اچانک ملاقات ہوئی، بڑی گرمجوشی اور محبت سے ملے، ندوۃ العلماء کے حالات پوچھتے رہے، لکھنؤ کی آمد کا ذکر کرتے رہے، اس جلسہ کا ذکر کیا، اس کی بہت سی خصوصیات کا ذکر کیا، اس کے بعد انھوں نے اپنے دولت خانہ پر بھی مدعو کیا اور بہت جلد ان کے اور ہمارے درمیان ایسا رابطہ قائم ہو گیا جو ایک خورد اور بزرگ کے درمیان ہوتا ہے، انھوں نے اس کو کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنی عمر، اپنے مجاہدانہ کارناموں اور اپنی دینی خدمات میں اتنے فائق ہیں، اور ان کی مجاہدانہ تاریخ نصف صدی سے زائد کی مدت رکھتی ہے، وہ قاہرہ میں رہ کر فلسطین اور اسلام کی جو کچھ خدمات انجام دے سکتے تھے، دیتے رہے، پھر اس کے بعد وہ

وقت آیا جب جمال عبدالناصر کے دور میں قاہرہ میں بھی ان کا رہنا دشوار ہوگیا، وہ قاہرہ چھوڑ کر بیروت چلے آئے، بیروت میں وہ ایک پناہ گزیں کی طرح زندگی گزارتے تھے، مگر پورے اعزاز واکرام کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ وہ جہاں رہتے تھے، اپنی شان اور اپنے مقام کے ساتھ رہتے تھے، بیروت میں بھی میری متعدد ملاقاتیں ہوئیں، میں کوشش کرتا تھا کہ کوئی سفر ان کی ملاقات سے خالی نہ ہو، میں نے دیکھا کہ وہاں ان کا پورا دفتر اور پورا عملہ ان کے ساتھ ہے، اور فلسطین کے مسئلہ کی ان کو دھن لگی ہوئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ فلسطین کا مسئلہ ان کے لیے محض ملی مسئلہ نہیں تھا، خاندانی، انفرادی اور ذاتی مسئلہ تھا، اور جسے ایک آدھ مرتبہ میں نے ان کے سامنے بھی کہا کہ آپ "ابو القضية الفلسطينية" ہیں، وہ مسکراتے اور تواضع کا اظہار فرماتے، لیکن واقعہ یہی تھا کہ مسئلۂ فلسطین ان کے لیے اولاد کی حیثیت رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو جس خاص خصوصیت سے نوازا تھا، وہ یہ کہ مسئلہ فلسطین کے کئی پہلو ہیں اس کا ایک پہلو سیاسی ہے، اس کا ایک قومی پہلو ہے، اس کا ایک جغرافیائی پہلو ہے، اس کا ایک اقتصادی پہلو ہے، وہ سب پہلو اپنی جگہ پر اہم ہیں، اور ہمارے لیے سب پہلو قابل لحاظ ہیں، اس لیے کہ اس کا تعلق ایک خاص سرزمین سے ہے، سرزمین انبیاء سے ہے، لیکن مفتی صاحب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ شروع سے آخر تک مسئلہ فلسطین کو بیت المقدس کے زاویہ سے دیکھتے تھے، یعنی ان کے لیے مسئلہ فلسطین کی اہمیت اور قیمت یہ تھی کہ اس سرزمین میں بیت المقدس ہے، جو مسلمانوں کا قبلۂ اولیٰ اور معراج نبوی کی پہلی منزل تھی، اور اسے ہمیشہ ہر تقریر اور ہر مضمون میں دہرانے کی کوشش کرتے تھے، اتنے بار انھوں نے یہ بات کہی اور یہ بات لکھی کہ سنتے سنتے اور پڑھتے پڑھتے لوگ اکتا گئے، وہ چاہتے تھے کہ یہ پہلو سب سے زیادہ نمایاں رہے، بعض ایسے بے توقیر عرب رہنما گزرے ہیں، جن کے نزدیک مسئلہ فلسطین کی یہ اہمیت نہیں تھی کہ وہاں بیت المقدس واقع ہے، اور شاید ان کو کبھی اس کی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ وہ کسی تقریر میں بیت المقدس کا نام لیں اور شاید یہی مصداق ہے، اس حدیث کا جس میں آتا ہے کہ

''ایک عرب سردار ایسا ہوگا جس کے ہاتھوں عربوں کی ہلاکت ہوگی، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے بیت المقدس میں قدم رکھنا نصیب نہیں ہوگا'' تو ان لوگوں کی تقریروں کو دیکھ کر اس حدیث کی تصدیق ہوتی ہے کہ واقعی ایسے عرب لیڈر ہیں کہ ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ بیت المقدس فلسطین میں ہے، لیکن مفتی صاحب کا معاملہ ہی بالکل دوسرا تھا، وہ کسی وقت اسے بھول نہیں سکتے تھے، وہ بیت المقدس جس کو حضرت عمرؓ نے فتح کیا اس کی چابی لینے کے لیے مدینہ منورہ مرکز خلافت سے سفر کر کے آئے تھے، وہ بیت المقدس جس پر نوے اکانوے سال صلیبیوں کا قبضہ رہا تو عالم اسلام کا کوئی مسلمان میٹھی نیند نہیں سو سکا۔

مفتی صاحب کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ رہ رہ کر یہی خیال ان کے دل میں چٹکی لیتا رہتا تھا، اور اسی خلش نے ان کو کبھی آرام سے رہنے نہیں دیا کہ بیت المقدس اغیار کے ہاتھ میں ہے۔

سنہ ۱۹۵۳ء میں جب پاکستان میں قادیانیوں کے خلاف ملک گیر تحریک شروع ہوئی اور مارشل لاء نافذ ہوا اور ہندوستان اور بیرون ہند کے انگریزی اخبارات نے اس تحریک کو اس رنگ میں پیش کرنا شروع کیا کہ ایک بڑی اکثریت نے ایک مٹھی بھر جماعت کو جو اس سے جزوی مذہبی اختلاف رکھتی ہے، محض مذہبی تعصب کی بنا پر اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنالیا ہے، اور بیرونی دنیا کے لیے جس میں عرب ممالک بھی شامل تھے، معلومات کا یہی تنہا ذریعہ تھا، تو مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ میں عربی میں ایک مضمون لکھ کر حقیقت حال کا اظہار کروں، جس میں اس اختلاف کی حقیقت کی بھی پردہ کشائی ہو جو جمہور مسلمین اور قادیانی فرقہ کے درمیان پایا جاتا ہے، نیز اس کی مختصر تاریخ، عقائد اور عامۂ مسلمین کے ساتھ اس کا رویہ اور ان کے بارے میں اس کا عقیدہ بھی آجائے، میں نے اس مضمون کو ایک خط کی شکل میں لکھا اور اپنے چند دوستوں کو جو مختلف عرب ممالک کے نامور اور سربرآوردہ اشخاص تھے بھیجا، ان میں مفتی صاحب بھی تھے، مفتی صاحب نے اس کو بڑی اہمیت دی اور الگ رسالہ کی شکل میں طبع کرا کے اس کی مصر اور عرب ممالک میں اشاعت کی، یہ رسالہ بعد میں ''القادیانیۃ ثورۃ علی النبوۃ المحمدیۃ والاسلام'' (قادیانیت نبوت محمدی اور

اسلام کے خلاف ایک بغاوت) کے نام سے چھپا، رابطہ عالم اسلامی نے اس کو دنیا کی گیارہ زبانوں میں بہت بڑی تعداد میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ خضر حسین مصری کے مضامین کے ساتھ شائع کیا، میرا ایک اور عربی رسالہ جس میں میں نے ثابت کیا تھا کہ یہودیوں کے پاس دنیا اور انسانیت کے لیے کوئی پیغام اور ہمدردی اور خلوص کا کوئی جذبہ نہیں، اس لیے ان کو عارضی طور پر خواہ کتنی کامیابی ہو جائے وہ اس جوہر اور افادیت سے محروم ہیں، جن کی بنا پر خدا کے ہاں سے دوام وبقا اور غلبہ وعزت کا فیصلہ ہوا کرتا ہے، اس کے برخلاف عرب اس ابدی پیغام اور صفات کے حامل ہیں، جن پر اللہ کی طرف سے نصرت کا وعدہ اور سنت اللہ میں دوام وبقا کا فیصلہ ہوتا ہے، اس لیے ان کی شکست وناکامی عارضی ہے، اور بالآخر ان کو فتح ہوگی، میں نے ہندوستان میں یہ رسالہ "الفتح للعرب المسلمين" کے عنوان سے شائع کیا تھا، مفتی صاحب نے اس کو قرآنی زبان میں تبدیل کر کے "العاقبة للمتقين" کے نام سے بہت خوبصورت اور بڑی تعداد میں چھپوایا اور تقسیم کیا۔

اس کے بعد وہ زمانہ آیا کہ "رابطہ عالم اسلامی" اور جامعہ اسلامیہ کی کمیٹی میں مجھے ان کے ساتھ بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا، وہ اسی شفقت کے ساتھ پیش آتے اور ہمیشہ اس طرح ملتے تھے، گویا وہ اپنے کسی رفیق سے تبادلہ خیال کر رہے ہوں، اس وقت ان کو اور زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اندازہ ہوا کہ عالم اسلام کے مسائل سے شاید ہی کسی عرب رہنما کو اتنی گہری دلچسپی اور اتنی مستند واقفیت ہو جتنی مفتی صاحب کو تھی، چاہے وہ افغانستان وپاکستان کے تعلقات ہوں، یا وہ ہندوستانی مسلمانوں کا مسئلہ، قبرص کا مسئلہ ہو یا فلپائن کا، انڈونیشیاء میں عیسائیت کا فروغ اور اس کی اشاعت کا مسئلہ ہو، مفتی صاحب کو سب سے دلچسپی تھی، اور معلومات کا ایک دفتر ان کے پاس تھا، ذرا چھیڑیئے وہ دفتر معلومات کھل جاتا تھا، پھر میں نے دیکھا کہ وہ کسی وقت بھی اشتعال میں نہیں آتے تھے، بلکہ مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی تھی کہ نہایت اشتعال انگیز موقع پر بھی، نہایت دھیمے انداز میں بالکل ٹھنڈے طریقہ پر اس کی تردید کرتے تھے، اس میں جھنجھلاہٹ، تلخی اور ناگواری نہیں

ہوتی تھی، یہ ان کی بزرگانہ ادا تھی کہ وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ ملاقات میں پیش قدمی کریں، میری قیام گاہ خواہ ان کے لائق ہو یا نہ ہو، میں خواہ کسی دوست یا عزیز کے یہاں ٹھہرا ہوں، لیکن وہ ہمیشہ خود ہی تشریف لاتے تھے، میں محجوب ہوتا بہت معذرت کرتا کہ آپ تو ہمارے بزرگوں کی صف میں ہیں، مجھے آنا چاہیے لیکن وہ کبھی اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

بعض اوقات ایسا معلوم ہوا کہ کوئی مضمون پڑھا گیا، خود مجھے بھی ایک مرتبہ اتفاق ہوا کہ رابطہ میں ایک ایسا مضمون پڑھا کہ جس کی سب سے زیادہ شکایت مفتی صاحب کو ہونا چاہیے تھی، مسئلہ فلسطین کے بارے میں اس وقت جو خط دفاع تھا (Line of Action) تھی، اس سے میں نے اختلاف ظاہر کیا کہ جس طرح سے مسئلہ فلسطین کو حل کرنے کی ابھی تک کوشش کی گئی ہے، وہ طریقہ بے نتیجہ اور ناکام تھا، جب وہ مضمون پڑھا گیا تو بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہوا کہ مفتی صاحب شاید کھڑے ہوکر اس کی تردید نہیں تو کم از کم وضاحت ضرور فرمائیں گے لیکن جہاں تک مجھے خیال آتا ہے، سب سے پہلے انھوں نے وقت مانگا اس پر گفتگو کرنے کے لیے اور انھوں نے غیر مشروط طریقہ پر اور بغیر کسی تحفظ کے اس کی تائید کی اور کہا کہ استاذ ندوی نے جو کچھ مضمون میں کہا ہے، اس سے مجھے سو فی صد اتفاق ہے، اور واقعہ یہی ہے کہ مسلمانوں کی اس وقت کی نکبت اور جوان کو سزا ملی ہے اس کے اسباب، غیبی، اخلاقی، دینی اور روحانی ہیں، اور ان کا علاج بھی یہی ہے، جو تجویز کیا گیا ہے، مجھے ان کی فراخدلی اور عالی ظرفی پر تعجب ہوا کہ بظاہر اس سے ان کے مسئلہ پر چوٹ پڑتی تھی۔

پھر اس کے بعد ہمیشہ ان کی یہ خصوصیت رہی کہ جب بھی ملاقات ہوتی، وہ ہندوستانی مسلمانوں کا حال پوچھتے، مسلمانوں کے اداروں کو پوچھتے اور خاص طور پر ندوۃ العلماء اور دار العلوم کی خیریت اور اس کے مسائل اور مشکلات دریافت فرماتے، اور ''البعث'' اور ''الرائد'' کا ذکر فرماتے، ان کی اشاعت اور ترقی سے دلچسپی کا اظہار فرماتے۔

ان میں سادات کے اخلاق کا پرتو بھی تھا، مجھے کئی بار اس کا ذاتی تجربہ ہوا، وہ عالی حوصلہ، فراخ چشم، فیاض، متحمل و بردبار، متواضع، کریم النفس تھے، ان کے ساتھ کام کرنے

والوں کی شہادت ہے کہ مالیات اور سیاسی معاملات میں عفیف ونزیہ اور دیانتدار وامین تھے۔

مفتی امین الحسینی رحمۃ اللہ علیہ ان خوش قسمت مجاہدین میں تھے، جن کے لیے جہاد کا اجر اللہ تعالیٰ نے قیامت میں دینے کے لیے رکھا ہے، انھوں نے یہاں کوئی خوشی نہ دیکھی، ان کو آرزو تھی کہ وہ بیت المقدس میں داخل ہوں جب فلسطین مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا ہو اور وہاں دوگانۂ شکر ادا کریں، اس میں کوئی شبہ نہیں، وہ وہاں دوگانہ ادا کرنے کے سب سے بڑے مستحق تھے، اور شاید ان کے سوا کوئی ایسے خشوع وخضوع اور حمد وشکر کی نماز ادا نہ کرسکتا، اس لیے کہ ان کو اس خاک کے ذرہ ذرہ سے محبت تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں تھا، صدمہ پر صدمہ سہتے رہے، ناکامیوں پر ناکامیاں دیکھتے رہے، ان کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے، انھوں نے جو مشورے دیئے ان کو وہی کہنے کا حق ہے، جو ایک شکستہ دل پیغمبر نے اپنی قوم سے کہا تھا ''وَلٰکِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِیۡنَ'' آخر میں سب سے بڑا داغ جوان کو لگا وہ تصفیہ ہے، جو مسئلہ فلسطین کا کیا گیا، پہلے سے میرا اندازہ تھا کہ مفتی صاحب کے دل پر کیا گزری ہوگی، اور مفتی صاحب کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا ہوگا کہ ابھی عزیزوں نے اسی رسالہ کے بعض مضامین دکھائے جوان کا ترجمان تھا، جس میں انھوں نے صاف صاف اس کا اظہار کیا ہے کہ اس حل کو عرب سلطنتوں کو ہرگز قبول نہیں کرنا چاہیئے، اگر وہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتیں تو کم از کم ان کو یہ اونے پونے سودا نہیں کرنا چاہیئے، انھوں نے یہ ناشدنی بھی دیکھ لی کہ خود عربوں نے موت کی اس دستاویز پر مہر لگادی، کم از کم اسرائیل سے جنگ ختم ہوگئی، اور اسرائیل کے تسلیم کرلینے کی طرف گویا ایک قدم اٹھالیا گیا، میں سمجھتا ہوں کہ مفتی صاحب اپنے سینہ پر ایک بہت بڑا داغ لے کر گئے۔

جہاں تک مسئلہ فلسطین اور بیت المقدس کی بازیابی کے لیے جدوجہد کا سوال ہے، ان کو یہ کہنے کا حق ہے کہ ؎

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

❑❑❑

مولانا مسعود علی ندوی

مولانا مسعود علی ندوی کی سب سے پہلی زیارت غالباً ۲۶-۱۹۲۷ء میں اپنے استاذ مولانا خلیل عرب صاحب کے مکان پر ہوئی، میانہ قد، گداز بدن، کھدر یا گاڑھے کا لباس جو اس دور کے خلافتیوں کا شعار تھا، لیکن نہایت اجلا اور صاف جس پر کہیں دھبہ یا سلوٹ نہیں، ہر ادا سے تہذیب و شائستگی، خود اعتمادی و خودداری نمایاں اور ہر چیز سے نستعلیقیت و نفاست عیاں، بھاری بھر کم لیکن نہایت سبک روح، زندہ دل بلکہ پُر مذاق، لیکن ظرافت پوری لطافت لیے ہوئے، اودھ کے شرفاء اور تعلیم یافتہ زمینداروں کی تہذیب و معاشرت کا نمونہ، عرب صاحب کو کسی کا اتنا اہتمام کرتے ہوئے اور اتنے فرحت و انبساط سے ملتے ہوئے کم دیکھا تھا، پرتکلف ناشتہ کا اہتمام کیا گیا، گفتگو سے اندازہ ہوا کہ دونوں میں پُرانا دوستانہ (تعلق) اور بے تکلفی ہے، یہ غالباً دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رفاقت و یکجائی کا نتیجہ تھا۔

اب وہ وقت آیا کہ مولانا کی آمد و رفت برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے ہاں جلد جلد اور بار بار ہونے لگی، بھائی صاحب کا پرانا مکان عرب صاحب کے مکان سے چند گز کے فاصلہ پر اسی گلی میں تھا، مولانا مسعود علی صاحب سید صاحب ہی کی طرح بھائی صاحب سے برادرانہ اور عزیزانہ طریقہ پر ملتے تھے، پھر جب میرے دارالعلوم میں باقاعدہ قیام اور استفادہ کا سلسلہ شروع ہوا تو مولانا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور وہ بھی والد صاحب کے ساتھ قدیم تعلق کی بنا پر بزرگانہ شفقت فرمانے لگے، کبھی ایسا ہوتا کہ وہ سید صاحب، ماجد میاں (مولانا عبدالماجد دریابادی) اور مولانا عبدالباری ندوی جمع ہو جاتے، پھر تو لطف مجلس کا کیا پوچھنا، مولانا مسعود علی صاحب بلبل کی طرح چہکتے اور اپنے لطائف

سے مجلس کو زعفران زار بنا دیتے، میں نے ان سے بہتر اور دلچسپ مجلسی گفتگو کرتے ہوئے کم کسی کو پایا، ان کے سامنے کسی کی پیش نہ جاتی، جس مجلس میں ہوتے انھیں کا رنگ جمتا، صرف مولانا شروانی اور کسی قدر مولانا آزاد کا وہ لحاظ کرتے تھے، اور کوئی ان سے قیل وقال کرنے کی مشکل ہی سے جرأت کرتا، ان کی عملی صلاحیتوں اور ترکتازیوں کی بنا پر ماجد میاں ان کو غازی مسعود کہتے، اس نام کا لطف وہی لے گا جو اودھ کے حضرت سید سالار مسعود غازی کے مقام اور کام سے واقف ہو، مولانا نے تحریک خلافت میں قائدانہ حصہ لیا تھا، وہ مولانا محمد علی، شوکت علی کے معتمد خاص اور تحریک خلافت کے بڑے متحرک وفعال اور سرگرم کارکنوں میں تھے، تنہا ضلع اعظم گڑھ سے جہاں وہ دارالمصنفین کے ناظم کی حیثیت سے مقیم تھے، انھوں نے نوے ہزار سے اوپر چندہ جمع کر کے بھیجا تھا، پنڈت موتی لال نہرو سے بھی ان کے دوستانہ تعلقات تھے، وہ اعظم گڑھ آتے تو انھیں کے مہمان ہوتے، منھ کا ذائقہ خراب ہونے کی (وجہ سے) فریاد اور مغلئی کھانوں کی فرمائش کرتے، مولانا ان کے قیام گاہ اعظم گڑھ و دارالمصنفین کے لطائف مزے لے لے کر سناتے، بعد میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس قدیم وضع اور اپنے باپ کے تعلقات کو نبھاتے رہے، اور مولانا ہی ان کی آمد پر بڑے جلسوں کا انتظام فرماتے۔

میرا اس وقت تک دارالمصنفین جانا نہیں ہوا تھا، ۱۹۳۲ء کا دسمبر یا جنوری کا مہینہ تھا اور رمضان کے دن کہ میرے محترم استاذ شیخ تقی لدین الہلالی المراکشی نے جو اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادب عربی کے استاد اعلیٰ تھے، اور اب مکناس (مراکش) میں مقیم اور ڈاکٹر تقی الدین الہلالی کے نام سے علمی دنیا میں مشہور ومعروف ہیں، یوپی کے مشرقی اضلاع کے دورہ کا پروگرام بنایا، جہاں ان کے متعدد احباب اور بزرگ تھے، اپنی رفاقت اور ترجمانی کے لیے انھوں نے میرا انتخاب کیا، اس سفر کی ایک منزل اور اہم منزل اعظم گڑھ تھی، کئی دن قیام رہا، وہاں مولانا مسعود علی صاحب کو اپنی اصل شان میں دیکھا، رمضان کی اس خاموش اور زاہدانہ فضا میں بھی ان کی طبیعت باغ و بہار پائی، خشکی اور یبوست کا کہیں

نام نہ تھا، لطائف کے پھول اب بھی ان کے منھ سے جھڑتے تھے، ایک دن ہم لوگ میدان میں دھوپ میں کھڑے ہوئے تھے، ہلالی صاحب بھی رونق افروز تھے، برادر محترم مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے جو مولانا سے کبھی کبھی اودھ کے مہذب ولطیف انداز میں چھیڑ چھاڑ کر لیتے، ولانا سے کہا کہ مولانا آپ بھی تو ندوہ کے فاضل ہیں، اور تکمیل کے طالب علم بھی رہے ہیں، اور وظیفہ پایا ہے، ہلالی صاحب سے عربی میں کچھ بات چیت کیجئے، مولانا کو عربی میں بولنے کا پہلے بھی کم ہی اتفاق ہوا ہوگا، اور اب تو برسوں سے اس دنیا سے الگ نظم وانتظام میں مصروف تھے، مولانا نے بہت سنجیدگی سے فرمایا کہ میں جتنی محنت سے ان سے عربی میں بات کروں گا، اس سے کم محنت سے دو رکعت نماز پڑھ لوں گا، جس کا ثواب بھی ملے گا، دارالمصنفین کے عملہ میں ایک صاحب تھے جن کا پائجامہ ٹخنے سے خاصا اونچا رہتا تھا، مولانا نے فرمایا کہ ان کے پاجامے مولانا ثناء اللہ صاحب اپنی نگرانی میں بنوا کر امرتسر سے بھیجتے ہیں، لحاظ وشفقت کے باوجود اپنے لاابالی پن کی وجہ سے میں بھی بعض اوقات ان کے فقروں سے بچ نہیں سکا۔

اس وقت تک مولانا کا تعلق حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے نہیں ہوا تھا، طبیعت میں مذاق کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، لیکن اس کا اظہار ثقاہت اور اودھ کے معیار کے مطابق یک گونہ لطافت کے ساتھ ہوتا تھا، مولانا مشکل سے کسی کو بخشتے، بعض مشائخ وقت کے خلفاء سے جو اپنے کو بہت لیے دیئے رہتے علمی وادبی نوک جھونک بھی کر لیتے، اس کے لیے مولانا کو اپنی پرانی پڑھی ہوئی باتیں بھی یاد تھیں، ایک بزرگ جو سرکاری خطاب یافتہ بھی تھے، اور پیر بھی، علماء میں ان کا شمار تھا، لیکن اعزازی طور پر، باقاعدہ کسی مدرسہ میں ان کی تعلیم نہیں ہوئی تھی، جمعہ کی نماز پڑھانے کا ان کو بہت شوق تھا، بلاتحریک وفرمائش کے بھی وہ مصلیٰ پر چلے جاتے، ایک مرتبہ وہ دارالمصنفین آئے، جمعہ کا دن تھا، مولانا ان کی اس کمزوری سے واقف تھے اور ان کو سبق دینا چاہتے تھے، ان کو معلوم تھا کہ وہ خطبہ کی کتاب کے بغیر خطبہ نہیں دے سکتے حکم دیا کہ خطبہ کی کتاب مسجد سے اٹھالی جائے، اور آس پاس کہیں خطبہ کی کوئی

کتاب موجود نہ ہو جو منگوائی جا سکے، یہ سب انتظام کرنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے، اور لوگ منتظر رہے کہ آج کیا پیش آتا ہے، نماز کا وقت ہوا، وہ صاحب حسب معمول منبر پر چلے گئے، خطبہ کی کتاب لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس کا آس پاس کہیں وجود نہ تھا، باہر تلاش کی گئی تو وہاں بھی نہ ملی، اب لوگ منتظر تھے کہ کیا ہوگا؟ مولانا کو اپنی اس پیش بندی پر اطمینان تھا، اور یہ خیال تھا کہ اب وہ صاحب ہار مان لیں گے اور منبر سے اتر آئیں گے، لیکن سب لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ان صاحب نے اپنی عبا کے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک خطبہ نکالا جو ایسے ہی آڑے وقت (ایمرجنسی) کے لیے رکھا گیا تھا اور وہ سارا منصوبہ فیل ہو گیا۔

تحریک خلافت کے آخری دنوں میں مسلمانوں میں یہ مرض پیدا ہو گیا تھا کہ بلا تحقیق اپنے زعماء اور کارکنوں کی دیانت پر شبہ کرتے، اور چلی ہوئی روایات اور افواہیں مجلسوں میں بیان کرتے، یہ اس گرانمایہ نبوی ہدایت کی سراسر خلاف ورزی تھی، جس میں کہا گیا ہے کہ "انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ جو سنے اس کا چرچا کرنا شروع کر دے" مولانا مسعود علی بھی اس سرگوشی اور افواہ بازی کا شکار ہو گئے، مگر وہ آسانی سے شکست ماننے والے نہ تھے، ان کو معلوم ہوا کہ فلاں صاحب مجلسوں میں یہ کہتے ہیں کہ مولانا نے خلافت کے نام پر جو رقم جمع کی تھی، وہ کھا گئے، وہ ان کے گھر پہنچے اور ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ نے یہ کہا ہے؟ انھوں نے بڑی سادگی سے کہا کہ نہیں میں نے تو فلاں صاحب کی بات نقل کر دی، کہنے لگے کہ ذرا میرے ساتھ ان کے پاس چلئے وہ شرما حضوری ساتھ ہو لیے، وہاں پہنچے اور ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ حاشا وکلا میری کیا مجال؟ میں نے تو فلاں صاحب سے سنا تھا کہنے لگے، ذرا تکلیف کیجئے میں اس کی تصدیق چاہتا ہوں، وہ بھی کچھ کہہ نہ سکے، اور ساتھ ہو لیے، وہ اس طرح سے باری باری لوگوں کو اپنے ساتھ لیتے رہے، یہاں تک کہ ایک جلوس بن گیا، اب جس کے گھر جاتے وہ پریشان ہو جاتا کہ کیا قصہ ہے؟ آخر میں سب کو شرمندگی ہوئی، اس بات کی کوئی اصل نہ نکلی اور لوگوں کے منھ بند ہو گئے اور اس طرح کم سے کم ایک محدود حلقہ میں اس متعدی مرض کا

استیصال ہوگیا، جس نے اس دور میں وبائے عام کی شکل اختیار کرلی تھی۔

مولانا کا جب حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم ہوا اور یوماً فیوماً اس میں ترقی ہوتی تو قدرۃً ''ایسی شوخیوں'' اور ستم ظریفیوں کا سلسلہ اگر کلیۃً مسدود نہیں تو بہت محدود ہوگیا، مولانا کی آمد ورفت تھانہ بھون کی شروع ہوئی، اگست ۱۹۳۸ء میں جب حکیم الامت لکھنؤ تشریف لائے اور پورا چلہ قیام فرمایا تو مولانا نے بھی حاضری دی اور کئی روز لکھنؤ قیام فرمایا، اگلے سال اگست ۱۹۳۹ء میں مولانا کی دوبارہ تشریف آوری ہوئی اور پھر ایک مہینہ سے زیادہ قیام فرمایا، مولانا نے پھر اس سے فائدہ اٹھایا، میں نے ان کو ندوہ کے مہمان خانہ میں پچھلے پہر ذکر کرتے ہوئے بھی سنا ہے، نہایت مؤثر اور دردناک آواز میں لیکن خاص ترنم کے ساتھ۔

میرا اصل نیازمندی کا تعلق ۱۹۳۳ء سے شروع ہوا، جب مولانا دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعمیر کے سلسلہ میں صحیح معنی میں جھونپڑا ڈال کر دارالعلوم میں ہوگئے، یہ جھونپڑا جو باہر سے ایک فقیر کی کٹیا معلوم ہوتی تھی، اندر سے کسی خوش مذاق، نفاست پسند امیر کی فرودگاہ سے کم نہ تھا، تخت اور چارپائیوں پر دودھ کی طرح صاف چادریں، آرام دہ اور مکلف نشست گاہ، غسل خانہ میں سنگ مرمر کا فرش، مولانا فن تعمیر میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور پیدائشی انجینیر تھے، اعظم گڑھ کی جامع مسجد، شبلی منزل کی چھوٹی سی خوبصورت مسجد، ان کے لطافت ذوق اور دینی جذبہ کی بہترین یادگاریں ہیں، دارالمصنفین کی سب عمارتیں بھی انھیں کے دماغ اور تعمیری قابلیت کا نمونہ ہیں، دارالعلوم اپنے ابتدائی قیام سے لے کر مسجد سے محروم تھا، اس کے وسیع ہال میں نماز باجماعت ہوتی تھی، برادر محترم مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی نظامت کے زمانہ میں مسجد کی تعمیر کا فیصلہ ہوا، مولانا مسعود علی صاحب سے زیادہ کوئی اس کام کے لیے موزوں نہیں تھا، تعمیر کی نگرانی کا بھی مسئلہ تھا، اور مالیات کی فراہمی کا بھی، وہ دونوں کے مرد میدان تھے، وہ اپنے کو سب کاموں سے یکسو کرکے وہاں آکر بیٹھ گئے، خود ہی نقشہ بنایا، معمار و مزدور فراہم کیے اور اپنی نگرانی میں

کھڑے ہوکر اس کا کام شروع کرایا، چندہ ختم ہوجاتا اور اگلے دن کا حساب چکانے کے لیے پیسے نہ ہوتے تو وہ بھائی صاحب اور جس کو مناسب سمجھتے اس کو ساتھ لے کر شہر کا ایک گشت کر لیتے اور چند دنوں کا سامان ہوجاتا، ان کی وجاہت اور شیریں گفتاری ایسی تھی کہ جہاں جاتے خالی ہاتھ واپس نہ آتے، فنی طور پر مددگار کی حیثیت سے ان کو ایک دیندار مسلمان اوورسیر عبدالمجید خاں صاحب مل گئے تھے، تھوڑے عرصہ میں مسجد بن کر تیار ہوگئی اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اس دن جمعہ کی نماز پڑھا کر اور جمعہ کے بعد ایک مؤثر وعظ کہہ کر اس کا افتتاح کیا، آج اس مسجد کے بام و در درجۂ حفظ کے کثیر التعداد طلبہ کی تلاوت سے گونجتے رہتے ہیں، اور علوم دینیہ کے طلبہ جو ملک و بیرون ملک سے آئے ہوئے ہیں، اور علماء و فضلاء و اساتذہ دارالعلوم کی ایک جماعت کثیر اس مسجد کو آباد رکھے ہوئے ہے، اور وہ اس وقت لکھنؤ کی (جامع مسجد نہ ہونے کی وجہ سے) سب سے بڑی مسجد ہے، اپنے خصوصی طرز تعمیر کے لحاظ سے جس میں ہر طرف سے ہوا آنے کی خاص رعایت رکھی گئی ہے، اور خوبصورت وسبک و نازک عمارت کی بنا پر اس کی طرف نظریں اٹھتی ہیں، اور اس کے خوش مذاق و با اخلاص بانی کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، ایک مرتبہ خواجہ حسن نظامی لکھنؤ آئے، خاموشی کے ساتھ وہ یہاں بھی آئے اور مسجد دیکھی، کسی کو ان کی آمد کی خبر نہیں ہوئی، اپنے رسالہ ''منادی'' میں انھوں نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''خانۂ خدا تو بہت دیکھے تھے لکھنؤ میں ایک بنگلۂ خدا دیکھا''۔

مولانا کا یہ خس خانہ جو مسجد کے موجودہ پھاٹک کے بالکل بالمقابل سڑک کی دوسری طرف بنا ہوا تھا، مرجع خاص و عام تھا، میری آنکھوں نے بڑی بڑی شخصیتوں کو وہاں دیکھا ہے، دینی و علمی شخصیتوں میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شروانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی تشریف لاتے رہتے تھے، سیاسی وقومی رہنماؤں میں ڈاکٹر سید محمود، رفیع احمد قدوائی وغیرہ بارہا آئے، آموں کا زمانہ ہوتا تو ان آنے والوں کی بہترین آموں سے تواضع ہوتی

لیکن مولانا کی شیریں گفتاری وخوش نوائی، آموں کی حلاوت ولطافت کو بھی مات دیتی، آموں پر لطیفہ یاد آ گیا، ہمارے ایک دوست ورفیق کار کو جو عربی کے ادیب ہیں، اردو محاورات بولنے کا بہت شوق تھا، آموں کی فصل بہار پر تھی، وہ کہنے لگے کہ میں آم خریدنے سبزی منڈی گیا تھا، وہاں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی، مولانا نے منھ خشک کر کے بڑی سنجیدگی سے فرمایا "کیا آپ کوئی تل رکھنے کے لیے لے گئے تھے" ان کے کہتے ہی آنکھوں کے سامنے تصویر سی پھر گئی کہ ایک آدمی بڑے اہتمام سے وہاں رکھنے کے لیے تل لیے جا رہا ہے، اور سب ہنس پڑے۔

یہیں اسی زمانہ قیام میں ان کا دارالعلوم کے اساتذہ وطلبہ سے ربط بڑھا اور انھوں نے دارالعلوم کے مسائل وانتظامات میں گہری دلچسپی لینی شروع کی، ناظم ندوۃ العلماء ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے جن کو ان سے پورا خلوص ویگانگت تھی، ان کی اس موجودگی کو غنیمت سمجھا، وہ تمام اہم معاملات میں ان سے مشورہ لیتے اور مشکل کاموں میں ان کی مدد حاصل کرتے، اسی زمانۂ قیام میں مولانا نے ان نوجوان فضلاء فرزندان ندوہ کو بھانپ اور چھانٹ لیا جو ان کے نزدیک ہونہار اور ترقی کرنے والے تھے، اور جو دارالعلوم کی تدریسی وانتظامی ذمہ داریوں کو سنبھال لینے کی صلاحیت رکھتے تھے، سچ پوچھیے تو دارالعلوم کا بعد کا دور جس میں دارالعلوم نے بہت سے میدانوں میں ترقی کی اور اپنے قیام کے بہت سے مقاصد پورے کیے، اسی قیام اور مولانا کی اسی فراست کا رہین منت ہے، انھیں نے مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی کو دفتر اہتمام وانصرام کے لیے مولانا مسعود عالم ندوی مدیر "الضیاء" مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی اور راقم سطور کو تدریسی خدمات انجام دینے کے لیے انتخاب کیا، محب محترم مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ذاتی تعلق اور مشترک انتظامی، فطری صلاحیت کی بنا پر ان کو خاص مناسبت تھی، اور ان کو مردم شناس نگاہ نے ان کو پہلے سے انتخاب کر لیا تھا کہ یہ جوہر قابل ہے، لیکن میرا تقرر بھی سراسر انھیں کی تحریک وتجویز کا نتیجہ تھا، اس طرح صرف مسجد ہی نہیں، دارالعلوم کے نئے دور کے تعمیر میں بھی ان کا ناقابل فراموش حصہ اور کارنامہ ہے۔

ندوۃ العلماء کی تاریخ میں بعض ایسے نازک مرحلے بھی آئے جب ان ہی کی

ذہانت، حاضر جوابی اور موثر شخصیت نے عقدہ کشائی کی، مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی وزارت تعلیم کے زمانہ میں ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا ہندوستان میں ایک نمونہ کی عربی درسگاہ قائم کرنا چاہتی ہے، جو ماڈل عربک کالج کے طور پر عربی مدارس کی رہنمائی اور قیادت کرے اور جس میں عربی زبان وادب اور مشرقی علوم وفنون کی معیاری اور جدید اصولوں اور تجربات کے مطابق عصری تعلیم دی جائے، مولانا آزاد کے نزدیک (سابقہ تعلقات اور اپنی ذاتی واقفیت اور رجحان کی بنا پر) اس کے لیے دارالعلوم سے زیادہ کوئی مدرسہ موزوں نہ تھا، انھوں نے فرمایا کہ اگر ندوۃ العلماء کے ذمہ دار اس تجویز کو قبول کرلیں گے تو حکومت عمارتوں کی تکمیل کرادے گی، یہ تجویز آئی تو ندوۃ العلماء کے ذمہ دار بڑی کشمکش میں پڑ گئے، ایک طرف دارالعلوم کے (ایک خاص مقصد کا وسیلہ ہونے کے لحاظ سے) موت وحیات کا مسئلہ تھا، دوسری طرف مولانا کی تجویز کو یکسر رد کردینا بھی مشکل تھا، جو ایک بزرگ خاندان کی حیثیت رکھتے تھے، ندوۃ العلماء کی تحریک کے زبردست مؤیدین میں تھے، مستقل رکن انتظامی چلے آرہے تھے، اور بیشتر ارکانِ ندوہ کے بزرگ ومحترم تھے، ندوہ کے خادم وامین اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس تجویز کو قبول کرنے کے بعد ندوہ، ندوہ نہیں رہے گا، ایک عربک کالج بن جائے گا، اور ملت کے ہاتھ سے نکل جائے گا، آج مولانا آزاد وزیر تعلیم اور حکومت میں دخیل ومؤثر ہیں، وہ ندوہ کے مقاصد سے واقف بھی ہیں، اور ان کے ہمدرد بھی، کل ان کی جگہ پر کوئی اور آئے گا، اور اس وقت زمام اختیار بالکل ہاتھ سے نکل چکی ہوگی، اس لیے اس تجویز کو منظور کرنا تحریک ندوۃ العلماء کے محضر قتل پر دستخط کرنے کے مرادف ہے، لیکن مولانا آزاد سے اس مسئلہ پر کون بات کرے اور مخمصہ سے نکلنے کی سبیل کیسے نکالی جائے؟

آخر قرعۂ فال مولانا مسعود علی صاحب کے نام نکلا اور یہ مشکل کام ان کے سپرد ہوا کہ وہ دہلی جائیں، اور مولانا آزاد سے اس مسئلہ میں ایسی گفتگو کریں کہ ان کے اس جذبہ کی ناقدری بھی نہ ہو اور معذرت بھی ہو جائے، آگے کی سرگزشت مولانا نے خود سنائی، فرماتے تھے کہ میں گیا تو پہلا واسطہ مولانا کے پرسنل سکریٹری پروفیسر اجمل خاں سے پڑا،

وہ ان کے مولانا کے تعلقات سے واقف نہ تھے، مولانا نے مُلاقات کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے کہا کہ ''مولانا اس وقت بہت مصروف ہیں'' وہ آسانی سے ہار ماننے والے نہ تھے، وہیں انھوں نے چہل قدمی...... شروع کردی، اجمل خاں نے پوچھا کہ آپ تشریف کیوں نہیں لے جاتے؟ کہنے لگے کہ میرے اور مولانا کے تعلقات کو نصف صدی کے قریب مدت ہورہی ہے، میں اس کی جبلی منانا چاہتا ہوں، اس لیے مولانا سے تاریخ لینے آیا ہوں، اب وہ سمجھے کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے، اندر گئے اور مولانا کو اطلاع دی، مولانا نے فوراً بلالیا اور اپنے معمول کے مطابق کہا کہ مولانا ئے مسعود کیسے آئے؟ کہنے لگے کہ کچھ بزرگوں کے لوح مزار کی عبارت کے بارے میں غور وخوض ہورہا ہے، مولانا محمد علی مونگیریؒ کے لوح مزار پر بانی ندوۃ العلماء لکھنا تجویز ہوا ہے، اسی طرح مولانا شبلی کے لوح مزار کی کوئی عبارت بتائی جس سے ان کی ندوۃ العلماء کی تحریک کو ترقی دینے کا اظہار ہوتا تھا، کہنے لگے کہ اندیشہ ہے کہ ہمارے اور آپ کے لوح مزار پر قاتل ندوۃ العلماء لکھا جائے، مولانا نے بڑے استعجاب سے پوچھا کہ کیوں؟ معاملہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ آپ نے جو تجویز پیش کی ہے، اس کا مآل تو یہی ہے کہ ندوۃ العلماء ختم ہوجائے، اور ہم آپ اس کے قاتل ٹھہریں، آج تو آپ منصب وزارت پر ہیں، اور آپ کی موجودگی میں اس کا خطرہ نہیں، لیکن کون آتا ہے اور کیا ہوتا ہے، مولانا کی شہرۂ آفاق ذہانت کے لیے اتنا اشارہ کافی تھا، وہ دور تک بات کو سمجھ گئے اور فرمایا کہ آپ لوگوں کا فیصلہ صحیح ہے، اور اس تجویز پر کوئی اصرار نہیں، مولانا مسعود علی صاحب کے پورے الفاظ تو یاد نہیں، اس قصہ کا خلاصہ یہی تھا، وہ وہاں سے کامیاب واپس آئے اور یہ بات آئی گئی ہوگئی۔

مولانا مسعود علی صاحب پنڈت جواہر لال نہرو سے بڑے بے تکلف تھے، پنڈت جی بھی اس بنا پر کہ ان کے تعلقات ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو سے براہ راست تھے، اور پنڈت جی میں یہ وضعداری وشرافت تھی کہ وہ ان قدیم تعلقات کا احترام کرتے تھے، ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرتے تھے، جنگ آزادی میں بھی جب لوگ پنڈت جواہر لال نہرو

کوٹھیرانے اور ان سے ربط وضبط رکھنے میں احتیاط برتتے تھے، مولانا اعظم گڑھ میں ان کی آمد پر ان سے بے تکلف ملتے تھے، اور کھلے طریقہ پر تعلق کا اظہار کرتے تھے، پنڈت جی بھی شبلی منزل آتے اور پرانے تعلقات کی یاد تازہ کرتے، مولانا کبھی دارالمصنفین کی کسی ضرورت سے دہلی جاتے تو پنڈت جی سے ضرور ملتے، وہ اس وقت ہندوستان کے وزیراعظم تھے، اور نہایت مصروف لیکن ان کو وقت دیتے اور کھانے پر بلاتے، اس کے کئی لطیفے مولانا نے ہم لوگوں کی مجلس میں سنائے، کہنے لگے کہ ایک مرتبہ زینہ پر ہم دونوں چڑھ رہے تھے، پنڈت جی ایک ایک زینہ چھوڑ چھوڑ کر دوسرے زینہ پر قدم رکھتے، مولانا سے بھی کہا کہ مولوی مسعود! تم کیوں میری طرح نہیں چڑھتے؟ کہنے لگے، پنڈت جی اگر میں بھی ہندوستان کا وزیراعظم ہوتا تو اسی طرح ایک ایک زینہ چھوڑ کر چڑھتا، گویا یہ اس منصب کی طاقت اور اس مسرت کی کارفرمائی ہے، کہ آپ اس بڑھاپے میں جوان ہیں، کہنے لگے کہ ایک مرتبہ کھانے پر انھوں نے کہا کہ وہ سردہ لاؤ جو غلام محمد صاحب (گورنر جنرل پاکستان) نے بھیجا ہے، مولانا نے کہا کہ پنڈت جی آپ کو تو گورنر جنرل پاکستان وہاں سے سردہ بھیجیں اور کوئی کچھ نہ بولے، ہمارے پاس پاکستان سے ایک خط آجائے، ایک ہنگامہ ہو اور ہفتوں تحقیقات سے چھٹی نہ ملے، یہ مولانا ہی کی بے تکلفی و تعلق تھا کہ انھوں نے جواہر لال صاحب کو بھی دارالمصنفین کا لائف ممبر بنالیا، انھوں نے قسطوں میں رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا کہ پوری قیمت میں یکمشت نہیں ادا کرسکتا کہنے لگے کہ آپ کے والد تو مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے جواہر لال کے لیے کمپنیوں میں شیئرز خرید لیے ہیں، پھر آپ کو کیا دقت؟ جواہر لال صاحب نے اندرا جی کی طرف اشارہ کیا، کہا کہ ان کو بینک کی کاپی لا کر دکھا دو دیکھا تو واقعی کوئی بڑی رقم جمع نہ تھی۔

مولانا میں اس وقت سے جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک طالب علم تھے، عزم و نظم کا مادہ اور غیر معمولی انتظامی و تنظیمی صلاحیت کا اظہار ہوتا تھا، اس بنا پر ان پر شروع سے علامہ شبلی کی خصوصی نگاہ تھی، وہ سمجھتے تھے کہ اس نوجوان سے بڑا کام لیا جاسکتا ہے، مولانا کے خطوط میں جابجا اس کا تذکرہ ہے، وہ بہت جلد ان کے معتمد خاص بن گئے، پھر جب

دارالمصنفین کے ادارے کا قیام عمل میں آیا تو اس کی نظامت بلا اختلاف ان ہی کے سپرد ہوئی اور انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس کو بہت جلد منظم و مستحکم ادارہ بنادیا، اس میدان میں جو علامہ شبلی کا ایک موروثی باغ اور چھوٹا سا بنگلہ تھا، خوش اسلوب وخوش قطع عمارتیں کھڑی ہوگئیں، کتب خانہ کی مستقل عمارت، رفقاء کے کمرے، مہمان خانہ، خوبصورت مسجد تعمیر ہوگئی، چمن اور خوبصورت روشیں نکل آئیں، مولانا سید سلیمان ندوی جس طرح اس ادارہ کے علمی وفکری روح رواں تھے، اس کی علمی ساکھ اور علمی دنیا میں اس کی آبرو ان سے قائم تھی، ادارہ کا نظم ونسق، اس کا پرسکون وباوقار ماحول، طباعت کا معیار، رسالہ معارف کا وقت پر نکلنا، صفائی وشائستگی، باہر اس کا تجارتی اعتبار، یہ سب مولانا کے دم سے قائم اور ان کی بیدار مغزی، مستعدی اور رعب وداب کا رہین منت تھا، اس سلسلہ میں ان کی کامیابی کا راز، اور ان کی شخصیت کی کنجی ان کی قوت ارادی، بلند حوصلگی اور اولوالعزمی تھی، ایک مرتبہ وہ جب دارالعلوم میں مسجد کی تعمیر میں منہمک تھے، اور کام کرارہے تھے، میں پاس سے گزرا تو فرمایا کہ میں نے عربی کا شعروادب جو تعلیم کے زمانہ میں پڑھا تھا، اس میں سے ایک ہی شعر کو یاد رکھا ہے، اور زندگی کا دستورالعمل بنایا ہے، وہ حماسہ کا شعر ہے۔

إذا هم ألقىٰ بين عينيه عزمه ونكّب عن ذكر العواقب جانبا (ا)

میرے خیال میں ان کی پوری زندگی اسی اصول پر گزری اور انھوں نے اس کو اپنا اصول اور موٹو Motto بنایا۔

دنیا کی نیرنگی اور صحت وشہرت کی بے ثباتی دیکھئے کہ مولانا پر آخری عمر میں فالج کا حملہ ہوا اور وہ تمام عملی سرگرمیوں سے کنارہ کش بلکہ معذور ہوکر دارالمصنفین میں اپنی قیام گاہ میں گوشہ نشین ہوگئے، مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کے درجات اللہ تعالیٰ بلند فرمائے کہ انھوں نے دارالمصنفین پر مولانا کے حقوق واحسانات کا پورا لحاظ کیا اور مولانا کی

(ا) یہ شعر اسلامی شاعر "سعد بن ناشب" کا ہے، شاعر اپنی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "جب وہ کسی کام کا ارادہ کرلیتا ہے تو اپنے مقصد کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھ لیتا ہے، اور نتائج سے بالکل آنکھیں بند کرلیتا ہے۔

عزت واحترام اوران کی خدمت میں کوئی فرق نہ آنے دیا، وہ برسوں مفلوج ومعذور رہے، شروع شروع میں تو گاڑی میں دفتر چلے آتے اور کچھ دیر بیٹھ کر چلے جاتے، بعد میں اس کا سلسلہ بھی جاری نہ رہ سکا، اسی زمانہ میں (۲۰، ۲۱ر فروری ۱۹۶۵ء کو) دارالمصنفین کی پنجاہ سالہ طلائی جبلی منائی گئی، اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جو اس وقت نائب صدر جمہوریہ تھے، اس کی صدارت کے لیے تشریف لائے، ان کے علاوہ ملک کے بیسیوں دانشور، ادیب، عالم وفاضل اور سیاسی وانتظامی شخصیتیں ارکانِ حکومت اس میں شرکت کے لے آئے، یہ ایک ایسا علمی وادبی جشن تھا، جس کو کم سے کم اعظم گڑھ کی سرزمین نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا، افسوس ہے کہ وہ اپنی معذوری کی وجہ سے اس میں کوئی حصہ نہیں لے سکے، ڈاکٹر صاحب جو ان کے پرانے دوستوں میں تھے، اور جامعہ کے سلسلہ میں ان کے ساتھ ہندوستان اور بیرون ہند کے دورے کر چکے تھے، ان سے ملنے کے لیے ان کے قیام گاہ پر آئے، ان کے لحاظ سے ذوق کا یہ مصرعہ واقعہ کی صحیح تصویر ہے کہ ؎

عید ہوئی ذوق ولے شام کو

جشن کے بعد وہ آٹھ، نو مہینے اور زندہ رہے، عبرت کی بات یہ ہے کہ جو لوگ دور دور سے ان کی مجلس میں شریک ہونے کے لیے آتے تھے اور اس کو اپنے لیے بڑا اعزاز اور لطف زندگی سمجھتے تھے، انھوں نے وہ راستہ چھوڑ دیا، جہاں ان پر مولانا کی نظر پڑ سکتی تھی، اور وہ ان کو بلا سکتے تھے، شمع کے سب پروانے شمع کی آب وتاب ختم ہونے کے بعد منتشر ہوگئے، وہ اکثر وقت تنہائی میں گزارتے، دارالمصنفین کے کارکن اور وہی نیازمندان کے پاس بیٹھتے جن کا اس اصول پر ایمان وعقیدہ تھا کہ ؎

ماقصۂ سکندر ودارا نہ خواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر ووفا مپرس

آخر یکم شعبان ۱۳۸۵ھ (۲۶ر نومبر ۱۹۶۵ء) کو بزم شبلی کی یہ شمع بھی آخری طور پر بجھ کر رہ گئی اور وہ مولانا شبلی کے مرقد سے چند گز کے فاصلہ ہی پر آسودۂ خاک ہوئے، رحمہ اللہ تعالیٰ وغفرلہ۔

☆☆☆

مولانا عبدالباری ندوی

بعض شخصیتیں ذہن میں ایسی رچی بسی ہوتی ہیں، اوران سے ملنا، ان کا دیکھنا سننا زندگی کا ایسا معمول بن جاتا ہے کہ یہ پتا لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ ان کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟ اس کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے، جیسا اپنے گاؤں اور محلّہ کا یا وہاں کے رہنے والوں کا کہ شعور کے ساتھ ہی ان کی جان پہچان اوران کی دید وشنید شروع ہو جاتی ہے۔

مولانا عبدالباری صاحب ندوی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ ندوہ کے تعلق سے، پھر بھائی صاحب مرحوم سے خصوصی مناسبت اور کثرت سے آمد ورفت کی وجہ سے تعین کے ساتھ یہ یاد نہیں آتا کہ سب سے پہلے ان کو کہاں اور کب دیکھا تھا؟ اور کب سے ان سے نیازمندی شروع ہوئی، ایسا خیال آتا ہے کہ جب وہ تعطیلات گرما میں حیدرآباد سے لکھنؤ آتے تھے تو کبھی اپنے رفیق محترم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کے ساتھ اور کبھی تنہا بھائی صاحب سے ملنے مکان پر آتے، کشیدہ قامت، کھلتا ہوا گندمی رنگ، باوجاہت، متناسب الاعضاء جسم اور چہرہ، نہایت جامہ زیب، لباس سادہ مگر نہایت صاف ستھرا، اودھ کے دیندار شرفاء ورؤساء اور ندوہ کے خوش ذوق و نستعلیق فضلاء کا نمونہ۔

پھر وہ وقت آیا کہ ان کی کوٹھی جس کا نام انھوں نے ''شبستانِ سعادت'' رکھا تھا، محلّہ قدم رسول میں شیعہ کالج کے بغل میں بن کر تیار ہوگئی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی اب لکھنؤ جلد اور بار بار تشریف آوری ہونے لگی، مولانا اگر ہمارے مکان کے علاوہ کہیں شب گزارنے کے لیے آمادہ ہوتے تو وہ صرف مولانا عبدالباری صاحب کی کوٹھی تھی، ممالک عربیہ میں تو اس کی بکثرت مثالیں ملیں گی، لیکن ہمارے علم میں

ہندوستان میں کسی نے اپنے قلم کے زور سے ایسی اچھی شاندار کوٹھی نہ بنائی ہوگی، مولانا کبھی خود بھی یہ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نے ''دارالترجمہ'' کے لیے فلسفہ کی کتابوں کا ترجمہ کرکے جو مالی فائدہ حاصل کیا اس سے یہ کوٹھی بنائی، نہایت وسیع و دل کشا، اچھے اچھے متعدد کمرے، بیچ میں وسیع ہال جس میں کتب خانہ تھا، سامنے چمن اور گرمیوں میں شام کی نشست کے لیے ایک چبوترہ جس پر کرسیاں پڑی ہوتیں، بغل میں ملازمین کے لیے کوارٹر، کرایہ پر اٹھانے کے لیے بھی کچھ حصے، غرض میں نے اس وقت تک کسی عالم کی قیام گاہ جس کے پاس کسی کالج یا یونیورسٹی کی کوئی سند نہ تھی، اور جو صرف قدیم تعلیم اور ذاتی مطالعہ اور محنت کا ممنون احسان تھا، ایسی مکلّف اور کسی حد تک رئیسانہ قیام گاہ نہیں دیکھی تھی، میرا ناچیز مشورہ شامل ہوتا تو میں اس کوٹھی کا نام بجائے ''شبستان سعادت'' کے ''دارالقلم'' یا ''بیت القلم'' رکھتا کہ یہ سب اسی قدیم فارسی شعر کی شرح تھی، جو خوش نویسی کے مشق کے لیے تبرکاً اور تفاء لاً بچوں سے لکھوایا جاتا تھا۔

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

مولانا عبدالباری ندوی اس حقیقت کا ایک زندہ ثبوت تھے کہ کامیابی اور ترقی کے لیے اصل شے ذاتی قابلیت، خداداد ذہانت اور اپنی محنت ہے، ان کے پاس ندوہ کے سند کے سوا کوئی سند نہ تھی، انگریزی بھی انھوں نے بطور خود اور بقدر ضرورت سیکھی تھی، لیکن اپنی ذہانت اور قابلیت کے زور پر دکن کالج پونا میں جو اس وقت نہ صرف جنوبی ہند میں بلکہ ہندوستان میں بڑا نام اور مقام رکھتا تھا، ان کا فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے تقرر ہوا، اور انھوں نے بجائے فارسی یا اردو کے کلاس میں انگریزی میں لکچر دینا شروع کیا وہ ''دیوان حافظ'' جیسی بلند اور پُر از تلمیحات و رموز کتاب کو انگریزی میں حل کرکے طلبہ کے سامنے پیش کرتے، ان کا یہ تجربہ بی۔اے میں بھی کامیاب رہا اور طلبہ ہر طرح سے مطمئن ہوئے اور کالج کے ایک ذہین طالب علم نے ایک دن بڑے جوش و اعتماد کے ساتھ کہا کہ

''اگر مولوی صاحب رہ گئے تو بمبئی پرنسڈینسی میں ان سے بہتر کوئی استاد نہ ہوگا''۔

دکن کالج کے بعد وہ عرصہ تک گجرات کالج احمد آباد میں رہے، وہیں انھوں نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ایماء پر ''مذہب وعقلیات'' کے موضوع پر زبانی لکچر دیا جو بعد میں کانفرنس کی طرف سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا، فلسفہ ان کے خاص ذوق کا مضمون تھا، ندوہ کی طالب علمی میں وہاں کے جید اساتذہ سے، جن میں مولانا سید شیر علی صاحب حیدرآبادی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، انھوں نے فلسفۂ قدیم کی اعلیٰ کتابیں دلچسپی اور محنت سے پڑھی تھیں، اور درسیات کے حدود سے قدم باہر نکال کر اس موضوع پر انھوں نے وسیع مطالعہ کیا تھا، پھر مولانا شبلی کی صحبت میں ان کو فلسفۂ جدید اور علم کلام کا شوق پیدا ہوا، اور انھوں نے انگریزی میں اتنی استعداد بہم پہنچا کر کہ وہ فلسفہ کی کتابوں کا باطمینان مطالعہ کرسکیں، اس کا غائر نظر سے مطالعہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ذہن رسا اور نکتہ شناس بنایا تھا، انھوں نے بہت جلد مغز کی بات پالی اور جن نتائج تک لوگ بڑی غوّاصی اور شناوری کے بعد پہنچتے ہیں، اپنی سلامت طبع اور خدا کی رہنمائی سے وہ ان نتائج تک جلد پہنچ گئے اور انھوں نے ''فلسفہ وعقلیات'' کے حدود بہت جلد متعین کرلیے اور فلسفہ اور سائنس کا فرق بھی جو اس وقت تک اچھے اچھے پڑھے لکھوں پر پوشیدہ تھا، اور اس کی وجہ سے وہ اکثر خلط مبحث کرتے تھے، ان پر جلد منکشف ہوگیا، یہ رسالہ ان کے مطالعہ کا نچوڑ اور ان کے ذہن کی صفائی اور درّاکی کا اعلیٰ نمونہ ہے (۱)، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے اس کو پڑھ کر برجستہ فرمایا کہ ''یہ مذہب کا آہنی قلعہ ہے'' اور جب ایک مرتبہ حیدرآباد میں بعض حلقوں میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ فلسفہ کی صدارت ایک ایسے شخص کے سپرد ہوئی ہے، جس کو فلسفہ کی کیا سرے سے کوئی ادنی سے ادنیٰ سند بھی حاصل نہیں ہے، شروانی صاحب سے جو یونیورسٹی کے چانسلر بھی تھے، جواب طلب

---

(۱) اس رسالہ کا ترجمہ عربی میں مولوی واضح رشید ندوی نے ''الدین والعقل'' کے نام سے کیا جو قاہرہ مصر سے شائع ہوا۔

کیا گیا تو شروانی صاحب نے حضور نظام کی خدمت میں یہی رسالہ ''مذہب وعقلیات'' اس تحریر کے ساتھ پیش کردیا کہ ''ان کی سند یہ ہے کہ فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے، جس کا اندازہ سرکار خود رسالہ ہذا کی چند سطروں کے ملاحظہ سے فرما سکتے ہیں'' اس جواب کے بعد استقلال کی کارروائی پر دستخط ہوگئے، راقم سطور نے جب اپنی محسن کتابوں پر مضمون لکھا تو اس کتاب کو بھی اپنی خاص محسن کتابوں میں شمار کیا اور اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔

''مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ''مذہب وعقلیات'' پر نظر پڑی، جس کو ذوق وذہن نے پورے طور پر اپنا لیا، اس رسالہ سے عقل ونقل کے حدود اور تجربہ وعلم انسانی کی نارسی ونا پائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا، جو مطالعہ میں بہت کام آیا، اس کے بعد قدیم وجدید فلسفہ اور اس کی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا پڑھا، مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا بلکہ جس قدر پڑھا ''اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ'' اور ''كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ'' کی تفسیر وتوضیح ہی ہوتی رہی''۔(۱)

مولانا عبدالباری صاحب نے جامعہ عثمانیہ میں جو اپنے ماہر فن اساتذہ اور نامور فضلاء کی بدولت اس عہد میں، اس پورے تحتی بر اعظم میں بلند مقام رکھتی تھی، اپنے فرائض منصبی نہ صرف کامیابی اور نیک نامی سے ادا کیے بلکہ علماء کی خودداری وخودشناسی اور ذہنی واخلاقی بلندی کا نقش بھی قائم کردیا، وہ خود اپنا لطیفہ سناتے تھے کہ ایک مرتبہ مسٹر میکنزی جو ڈائریکٹر آف ایجوکیشن تھے (اس سے پیشتر وہ یوپی میں ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن رہ چکے تھے، اور میرے زمانہ تدریس میں دارالعلوم معائنہ کے لیے آئے تھے، بڑے طنطنہ اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے) مولانا عبدالباری صاحب نے ان کو اپنے کلاس کی طرف آتے

---

(۱) محسن کتابیں، ص:۱۸۱

دیکھا تو لڑکوں سے کہا کہ ''دروازہ بند کردو'' میں ایک بار ندوہ کا امتحان دے چکا ہوں، بار بار امتحان نہیں دیتا'' وہ یہ دیکھ کر واپس چلے گئے۔

اس وقت جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ دینیات کے صدر مولانا مناظر احسن گیلانی جیسا فاضل یگانہ، فلسفہ میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، معاشیات میں پروفیسر محمد الیاس برنی، انگریزی میں ڈاکٹر عبداللطیف جیسے شہرۂ آفاق اساتذہ تھے، ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر حمید اللہ حال مقیم پیرس اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی) اسی زمانہ کے طالب علم تھے، مولانا تدریس کے علاوہ دارالترجمہ کے لیے فلسفہ کی اہم کتابوں کا ترجمہ بھی کرتے تھے، ہیوم (Hume) کی ''مبادی علم انسانی'' اور برکلے کی ''مکالمات برکلے'' اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں۔

اپنے تدریسی مشاغل اور مطالعہ وتصنیف کے علاوہ وہ دکن کے ایک مشہور عارف مولانا محمد حسین صاحب کی خدمت میں بھی بڑے اہتمام کے ساتھ جاتے اور اپنے یارِ غار مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کے ساتھ ان کی صحبتوں اور مجلسوں سے مستفید ہوتے، مولوی صاحب موصوف جج کے عہدہ پر فائز تھے، لیکن چشتی سلسلہ کے ایک بزرگ مچھلی شاہ صاحب کے مجاز وخلیفہ تھے، مولوی صاحب پر توحید کا غلبہ تھا، ان کی کوئی مجلس اور ملفوظ اس کے ذکر اور تذکیر سے خالی نہیں ہوتی تھی، صاحب قال ہی نہیں تھے، صاحب حال بھی تھے، ان کے توحید کے حدود ''توحید وجودی'' سے مل گئے تھے، اور اہل علم جانتے ہیں کہ فلسفہ کے ذہین طالب علموں اور فاضلوں کے لیے خاص طور پر جن پر کبھی انکار یا ارتیابیت کا حملہ ہو چکا ہے (اور ہمارے مولانا اس منزل سے گزر چکے تھے) اس مشرب وفلسفہ میں تسکین بلکہ تاثر کا بڑا سامان ہوتا ہے، مولانا لکھنؤ آتے تو ان کی منہ بھر بھر تعریف کرتے، توحید کے غلبہ کے واقعات سناتے، انھی کے شوق دلانے سے بھائی صاحب مرحوم بھی جب ایک مرتبہ ایک مریض کو دیکھنے حیدرآباد گئے تو ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، انھوں نے بھائی صاحب کو اس پر بھی آمادہ کرلیا تھا کہ مجھے ان سے استفادہ کے

لیے حیدرآباد بھیجیں مگر اس کی نوبت نہیں آئی، مولانا گیلانی پر بھی ان کا گہرا اثر بلکہ رنگ تھا، مولانا عبدالباری صاحب پر ان کی صحبت میں جو رنگ چڑھا تھا، اس نے مولانا تھانوی کی بیعت وصحبت سے ہلکا ہو کر نئے رنگ کے ساتھ مل کر ایک نیا رنگ پیدا کرلیا تھا، جس میں مولانا نے اپنی ذہانت سے کشمکش کے بجائے ہم آہنگی پیدا کرلی تھی، انھی مولوی محمد حسین صاحب کے ایک فیض یافتہ اور مجاز پروفیسر محمد الیاس برنی بھی تھے، جنھوں نے مولانا کے بہت سے ملفوظات وافادات بھی محفوظ کردیئے ہیں۔

مولانا گرمیوں کی تعطیل میں جب لکھنؤ آتے تو ان کا معمول تھا (اور یہ معمول سبکدوشی کے بعد تک قائم رہا) کہ جمعہ کی نماز ہمارے محلّہ کی مسجد میں پڑھتے، جس کے امام وخطیب اس زمانہ میں بھائی صاحب مرحوم تھے، پھر انھوں نے مجھے اپنی جگہ کھڑا کردیا تھا، اگر مولوی مسعود علی صاحب لکھنؤ میں ہوتے تو وہ بھی آجاتے، دونوں صاحبان اس دن دوپہر کا کھانا بھائی صاحب ہی کے ساتھ کھاتے اور وہیں نیچے کے گلی کے کمرے میں جو گرمیوں میں بھی ٹھنڈا رہتا، آرام کرتے، نشست کے وقت میں بھی حاضر ہوجاتا، اس وقت ان تینوں حضرات کی علم آموز، دلچسپ ودلآویز باتیں سننے میں آتیں، اگر مولانا مناظر احسن گیلانی بھی ہوتے تو "نورٌ علیٰ نور" کا منظر ہوتا، مولانا کی شیریں گفتاری، بذلہ سنجی، نکتہ آفرینی اور لطیفہ گوئی مجلس کو باغ وبہار بنادیتی۔

مولانا کے اسی زمانہ تعطیل کے قیام میں میں نے صبح کو ان کے دولت کدہ پر حاضری دینی شروع کی، میرے ساتھ میرے محترم رفیق، انگریزی میں میرے استاد اور عربی میں میرے شاگرد حاجی عبدالواحد صاحب ایم۔اے۔ حال مقیم لاہور بھی ہوتے، ہم دونوں ٹہلتے ہوئے مولانا کی کوٹھی پر پہنچ جاتے جو ہماری قیام گاہ بازار جھاؤلال سے دو میل ضرور ہوگی، مولانا قرآن مجید کا درس دیتے، اور درس کے بعد منتخب آموں سے ضیافت بھی کرتے، مولانا کے درس میں ایسے حکیمانہ اشارے ملتے جن کی شرح میں صفحہ کے صفحہ بلکہ رسالے لکھے جاسکتے ہیں، اس درس کے کچھ معین مضامین وفوائد تو یاد نہیں رہے، لیکن اس سے اصولی طور پر

بہت فائدہ پہنچا اور قرآن مجید کی عظمت اور اس کے اعجاز کے یقین میں اضافہ ہوا، یہ سلسلہ زیادہ دن تو جاری نہیں رہا لیکن اپنے نقوش ذہن پر چھوڑ گیا، پھر جب میری تدریسی زندگی کا آغاز ہوا تو میری ترغیب پر دارالعلوم کے اونچے درجہ کے طلبہ نے بھی یہاں جانا شروع کیا، مولانا نے یہ پسند نہیں فرمایا کہ صرف طلبہ ہی چل کر جائیں، وہ اپنی کوٹھی سے چل کر ایک مسجد میں جو ریلوے لائن پر ہے، تشریف لاتے اور اس کو "مَکَاناً سُوًی" (درمیانی مقام) کے نام سے یاد فرماتے، طلبہ کے ساتھ اکثر میں بھی چلا جاتا اور مستفید ہوتا۔

مولانا حیدرآباد میں سیتا پھل منڈی میں جو جامعہ عثمانیہ سے قریب ہے، مقیم تھے، وہیں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی بھی تھے، اور جامعہ عثمانیہ کے ایک استاذ ڈاکٹر عثمان صاحب بھی، ان حضرات نے وہاں ایک مسجد تعمیر کروائی، شہر کے پرلے سرے پر ہونے کی وجہ سے اس کا نام مولانا مناظر احسن صاحب نے المسجد الاقصیٰ رکھا جس سے غالباً تاریخ بھی نکلتی ہے، میں ۱۹۴۶ء میں جب پہلی مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے ایماء پر والد ماجد کی تصنیف "نزہۃ الخواطر" کی طباعت کے سلسلہ میں حیدرآباد گیا اور ڈاکٹر عثمان صاحب کے یہاں مقیم اور مولانا مناظر احسن صاحب کا مہمان ہوا تو مولانا عبدالباری صاحب وظیفہ سے سبکدوش ہو چکے تھے، افسوس ہے کہ میں اس "قران السعدین" کے منظر کو نہ دیکھ سکا، جو دونوں فاضلوں اور ہم مذاق دوستوں کی یکجائی نے حیدرآباد میں پیدا کر دیا تھا، میں نے مولانا عبدالباری صاحب کا گھر بھی دیکھا، ابھی ان کا ذکر اور ان کی یاد اس ماحول میں تازہ تھی، اور ان کے شاگرد و شرکائے محفل مزے لے لے کر اس زمانہ کے واقعات سناتے تھے۔

مولانا کا زمانہ سبکدوشی بہت طویل رہا، ان کا تعلق مولانا تھانوی سے بڑھتا چلا گیا، لیکن ان کی بیعت اصلاً مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے تھی، اپنے رفیق خاص اور ہم سفر و ہم مذاق مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مرحوم کے مقابلہ میں مولانا کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ انھوں نے شیخ بیعت مولانا مدنی اور شیخ صحبت و تربیت (مولانا تھانوی) کے تعلق کو زیادہ جامعیت و توازن کے ساتھ قائم رکھا، اور مولانا تھانوی کی پوری عقیدت

اور ذہنی و ذوقی مناسبت کے ساتھ مولانا مدنی کی عقیدت و عظمت میں فرق نہیں آنے دیا، ان کے متعلق یہ مصرعہ پڑھا جاسکتا ہے۔

یوں کیے کس نے بہم ساغر و سنداں دونوں؟

اسی بنا پر مولانا مدنی ان کی کوٹھی پر کبھی کبھی رات گزارتے اور بڑے منشرح رہتے، مجھے بھی ایک دو بار اس کا اتفاق ہوا ہے، صبح کی آم خوری کی مجلس، صحن چمن میں چبوترہ پر نشست، شیخ وقت کی موجودگی، اور ایک چیدہ و برگزیدہ مجمع اور اس کی شستہ و شائستہ گفتگو، بھولنے والی چیز نہیں۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے رنگ کا مولانا عبدالباری صاحب پر ایسا غلبہ ہوا کہ مولانا (جن کی طبیعت ہمیشہ سے کسی چیز کو پورے طور پر قبول کرنے اور ماسوا کے نفی کی صلاحیت تھی) کے علمی خیالات اور طرز تحریر تک پر اثر پڑا، وہ دبستانِ شبلی کے ایک کامیاب و ممتاز ادیب و صاحب قلم تھے، تحریر میں پختگی و شیفتگی، استدلال و عقلیت کا رکھ رکھاؤ اور زبان و ادب کی چاشنی، جملوں کی برجستگی، دونوں پہلو بہ پہلو ہوتے، اور یہی مولانا کی تربیت کا فیض تھا، ان کا رسالہ "مذہب و عقلیات" اور ان کا مضمون "معجزات" پر جو سیرت النبیؐ کے پانچویں حصہ میں شامل ہے، اس کا نمونہ ہے، لیکن اب ان کو اپنے اس قدیم طرز تحریر میں تلبیس یا تدلیس کا (اور یہ الفاظ خود انھی کے ہیں) شبہ ہونے لگا، اور انھوں نے مولانا تھانوی کے طرز کی تقلید شروع کردی، اگر "چھوٹا منھ بڑی بات" نہ سمجھی جائے تو بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ اس میں محبت کو دخل زیادہ تھا، عقل و زمانہ کے تقاضوں کی رعایت کو کم، اگر وہ ان حقائق کو بھی جو ان کو مولانا تھانوی کی صحبت یا ان کی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوئے تھے، دبستانِ شبلی ہی کی زبان میں ادا کرتے تو اس جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے جس کے لیے وہ کتابیں لکھتے تھے، زیادہ مفید ہوتا اور نوجوانوں کا وہ طبقہ اور ملک کا دانشور حلقہ حقیقت دین سے زیادہ آشنا اور قریب ہوتا۔

ان کے اس دور کی تصنیفات "جامع المجدد دین" اور سلسلۂ تجدید کی کتابیں ہیں،

جو ہندوستان اور پاکستان میں مقبول ہوئیں، تجدید وتصوف وسلوک کا ترجمہ کسی قدر اختصار کے ساتھ عربی میں بھی ہوا، یہ خدمت میرے بھانجے مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی نے انجام دی، میں نے اس پر مقدمہ لکھا جو کئی جگہ نقل ہوا، پھر میں نے اسی کو اپنی کتاب "ربانیة لا رهبانیة" کا مقدمہ بنایا، عربی ترجمہ دمشق سے شائع ہوا، اور اس سے ترکی میں ترجمہ کیا گیا، مولانا نے دونوں ترجموں کو اپنی زندگی میں دیکھ لیا اور اپنی آواز کو بلاد عرب اور ترکی میں سن کر بہت خوش ہوئے۔

مولانا ایک مرتبہ میری درخواست وتحریک پر نظام الدین بھی تشریف لے گئے، اور مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت وہم رکابی میں میوات بھی گئے، وہاں کے جلسہ میں شریک ہوئے، واپسی پر اپنے گہرے تأثرات کا اظہار کیا، اور فرمایا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل گونگا تھا، اس کے پاس زبان نہیں تھی، مولانا سے جو کچھ سنا معلوم ہوا کہ میرا دل یہی کہنا چاہتا تھا، کہہ نہیں سکا"۔

۱۹۳۹ء میں میری کتاب "سیرت سید احمد شہید" نکلی، میں نے ایک نسخہ مولانا کی خدمت میں پیش کیا، وہ حیدرآباد جا رہے تھے، راستہ میں انھوں نے کتاب پڑھی اور اپنے گہرے تأثر کا اظہار کیا، یہاں پر وہ خط نقل کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عثمانیہ کالج ڈاکخانہ لالہ گوڑا حیدرآباد دکن

۱۲/مارچ ۱۹۳۹ء

برادرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں آپ کی کتاب سفر میں ختم کی، بلکہ کہنا چاہئے کہ یہ سفر کاملین ایمان کی مجلس وصحبت میں تھا، ایمان واسلام ان ہی بزرگوں کا تھا، باب چہارم پڑھ کر تو یہ سنگ دل بھی اپنی آنکھوں کو خشک نہ رکھ سکا، جو ہمیشہ تری کو ترسا کرتی ہیں۔

واقعی مسلمانوں کے اندر ایمان کو زندہ رکھنے کے لیے تو ایسے ہی احوال وسوانح کی ضرورت ہے۔ "فجزاکم اللّٰہ عن المسلمین"۔

میرے تو اس یقین کو بھی آپ کی کتاب نے اور مضبوط کر دیا کہ مسلمانوں کا کام آج کی انجمن بازیوں اور انجمن سازیوں سے ہرگز نہ چلے گا، اس کا کام کسی سربکف مومن کامل فرد ہی سے چلے گا، جس کے گرد خود ہی ہر خدمت وصلاحیت کے مخلصین جمع ہو جائیں گے اور ایمانیوں کی سچی انجمن وہی ہوگی، دعا کیجیے کہ اللہ اب اس امت محمدیہ پر رحم فرمائے، ذی الحجہ کا ترجمان کہیں ملے تو پڑھیے۔

والسلام

طالب دعا۔ عبدالباری

جب ان کا ایک خط ایک عزیز یادگار اور تبرک کے طور پر نقل کر دیا گیا تو ایک دوسرا خط بھی پڑھتے چلیے جو میری ایک دوسری کتاب "چند ساعت صحبتے با اہل دل" کے پڑھنے پر لکھا گیا ہے، اور اس سے ان کے انصاف اور حقیقت پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

بسم اللّٰہ

۱۳ رمئی ۱۹۶۸ء

برادر اعزواکرم زادکم اللّٰہ کرماً وکرامۃً۔ السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ

میں نے جب سے تازہ "الفرقان" میں "یک دو ساعت صحبتے با اہل دل" کا تازہ نمبر پڑھا ہے، ماشاء اللّٰہ وجزاک اللّٰہ، بار بار آپ کی خدمت میں رائے بریلی عریضہ لکھانے کا ارادہ کر رہا تھا، لیکن اب یہ بھی روز بروز دشوار ہوتا جاتا ہے، بہرحال جتنے نشانات اس مضمون کے ہر صفحہ پر میں نے لگائے ہیں، اتنے شاید ہی پہلے لگائے ہوں، اور آخر میں "لَکُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ" کی جو تفسیر میرے ذہن میں آتی تھی، اور جس کو "تجدید کلامیات" میں غالباً بار بار دہرایا ہے،

حضرت ممدوح بارک اللہ فی برکاتہم نے اس کی جو تفسیر فرمائی ہے، اس سے اس کم علم کو اپنے خیال میں بڑی تقویت ملی۔ جزاکم اللہ

باقی حضرت بھوپالی مدظلہم جس طرح حکایات وامثال سے بڑے بڑے مسائل کو دلنشیں فرمادیتے ہیں، وہ تو قدم قدم پر بقول ہمارے ماجد میاں کے حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کی یاد تازہ کرتی رہتی ہے، بھلا ارسطو اور ہیگل کے منطق کے دلائل میں دل ودماغ کے لیے تسلی وتشفی کا دور دور بھی نام ونشان کہاں ملتا ہے۔

کل احمد سلمہٗ سے معلوم ہوا کہ آپ ابھی یہیں تشریف فرما ہیں، ورنہ خیال ہے کہ شاید کسی نے کہا تھا کہ رائے بریلی تشریف لے جاچکے ہیں۔

خدا کرے یہ عریضہ ملنے تک تشریف فرما ہوں، ورنہ پھر رائے بریلی ہی بھجوادوں گا۔

میری نقل وحرکت کی دشواری تو اب روز افزوں ہے، پھر بھی اگر آپ کا قیام کچھ زیادہ رہا تو شاید کسی دن زیارت کی سعادت حاصل کرسکوں، اصل میں طبیعت کا حال اب روز بروز ناقابل اعتبار ہوتا جارہا ہے، کسی وقت کچھ ہمت ہوتی ہے، اور دوسرے وقت ٹوٹ جاتی ہے، پھر بھی الحمدللہ قریب کی مسجد میں نماز جمعہ مل جاتی ہے۔

امید ہے کہ آپ کی طبیعت ہر طرح بہتر ہوگی، اور سب خیریت ہوگی۔

والسلام مع الاکرام

دعاجو ودعاگو احقر العباد عبدالباری

اس آخری دور میں ان کے قلم سے ایک اور مفید تصنیف "مذہب اور سائنس" نکلی جو ہماری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے شائع کی، اس پر مشہور فاضل ریاضیات ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی کا فاضلانہ مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے اس کتاب کو سراہا ہے، اس کتاب میں ان کا قدیم شبلوی اسلوب پھر جاگ اٹھا ہے، اور ان کے اشہب قلم

کو اپنی بھولی ہوئی راہیں یاد آ گئی ہیں، یہ کتاب ان کے عالم ہوش اور صلاحیت فکر و تحریر کی آخری یادگار ہے۔

مولانا عبدالباری صاحب و برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب میں بڑے گہرے روابط و تعلقات تھے، دونوں میں کئی باتیں مشترک تھیں، اور یہی مناسبت و اتحاد کا ہمیشہ سے قوی ذریعہ رہا ہے، دونوں معاملات اور حقوق العباد میں بہت محتاط اور ذکی الحس واقع ہوئے تھے، دونوں مظاہر و اشکال اور لوگوں کی تعریف و تنقید سے بے نیاز ہو کر شریعت کے حکم پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور فرائض کو نفلی عبادتوں اور تکمیلی چیزوں پر ترجیح دیتے تھے، دونوں طبعاً و مزاجاً منتظم واقع ہوئے تھے، اور حساب کتاب کے صاف اور اس میں بے تکلف تھے، دونوں مولانا مدنی سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے، ان مناسبتوں اور مشترک نقطوں کے باوجود تعلیم و تربیت، ماحول کے اختلاف اور خاندانی اثرات کی بنا پر دونوں میں بہت سی مابہ الامتیاز خصوصیتیں تھیں، اور جن کو خدا نے دو پیدا کیا ہے، وہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے، مولانا عبدالباری صاحب میں ایک حد تک شدت اور بے لچک پن تھا، وہ اپنے خلاف مزاج و خلاف اصول کسی چیز کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس وجہ سے ان کے چھوٹے اکثر ان سے خائف اور ان سے دور رہتے تھے، اور گھر کے کم افراد ان کے معیار پر پورے اترتے تھے، ان کی اسی مزاجی خصوصیت کو مولانا مدنی نے ایک مرتبہ اس بلیغ جملہ میں ادا کیا کہ "مولانا عبدالباری چاہتے ہیں کہ شیطان مر جائے اور ایسا ممکن نہیں"۔

مولانا عبدالباری صاحب نے بھائی صاحب مرحوم کو اپنا مستقل معالج بنا رکھا تھا، اور وہ ان کے علاوہ اسی وقت کسی ڈاکٹر یا حکیم کی طرف رجوع کرتے تھے، جب بھائی صاحب ان کو مشورہ دیتے، وہ "وحدت مرشد" کے بھی قائل تھے، اور "وحدت معالج" کے بھی، مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے انھوں نے بھائی صاحب کو اپنا مشیر بھی بنا لیا تھا، اخیر زندگی میں بھائی صاحب اور ان کے گھر سے ان کا تعلق بہت بڑھ گیا تھا، ہم میں سے کوئی چلا جاتا تو بہت خوش ہوتے اور بڑی شفقت و اعزاز کا معاملہ فرماتے، بھائی صاحب

کے انتقال کے بعد ان کی محبت ان کے فرزند محمد میاں سلمہٗ کی طرف منتقل ہوگئی تھی، میرے بہت سے خیالات اور سرگرمیوں سے مولانا کو پورا اتفاق نہیں تھا، ندوہ کے معاملات میں بھی بارہا ان کا نقطۂ نظر میرے نقطۂ نظر سے مختلف ہوتا، انھوں نے اپنی بعض تحریروں میں بزرگانہ تنقید بھی فرمائی ہے، لیکن زندگی کے آخری ایام میں ان کو اس کا بڑا احساس ہوگیا تھا، اور ان کی محبت وشفقت اس اختلاف وتنقید پر پوری طرح غالب آگئی تھی، مجھ سے بعض اوقات اس طرح پر اپنے تأثر کا اظہار فرماتے کہ میں ندامت سے پانی پانی ہوجاتا، سبکدوشی وخانہ نشینی کے آخری ایام میں مولانا شبلی کی یاد بھی ان کو بہت آنے لگی تھی، ان کے احسانات، ان کی تعلیم وتربیت کے گہرے اثرات کا وہ اپنی تحریر وتقریر میں باربار تذکرہ فرماتے تھے، اور موجودہ دارالعلوم کو وہ بانیٔ ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری کے بجائے مولانا شبلی کا ساختہ پرداختہ سمجھتے تھے۔

مجھ ناچیز کے متعلق ان کی عرصہ سے رائے تھی کہ مجھے اصلاً عربوں کو اپنا مخاطب اور عالم عربی کو اپنی دعوت کا موضوع اور اپنی حقیر صلاحیتوں کا میدان بنانا چاہیے، وہ کہتے تھے کہ تم یہاں ہندوستان میں (Misfit) ہو، تم یہاں کیا چین کے حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ٹھہرے ہوئے ہو؟(۱) وہ مشرق وسطی اور ممالک عربیہ کے غیر دینی رجحانات اور بعض دشمن اسلام تحریکوں (عرب قوم پرستی اور فتنۂ ناصری) سے واقف تھے، اور میرے عربی مضامین ورسائل سے بھی اجمالی واقفیت رکھتے تھے، اس لیے ان کی خواہش تھی کہ میں اپنی ساری توجہ اسی رخ پر مرکوز کردوں۔

مولانا پر شدید بیماریوں کا حملہ توپے درپے ہوا، متعدد آپریشن بھی ہوئے، لیکن ۱۹۷۱ء سے مکمل طور پر صاحب فراش ہوگئے، اور ان کی ذہنی صلاحیتیں اور جسم تعطل کا شکار ہوگیا، یہ طویل مدت سعادت مند فرزندوں اور تیمارداروں کے لیے صبر آزما اور ان کے لیے رفع درجات اور تکفیر سیئات کا ذریعہ بنی، یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس طویل عرصہ میں

(۱) جس زمانہ میں انھوں نے یہ فرمایا تھا، غالباً وہ چین وہندوستان کی جنگ کا زمانہ تھا، جو چند مہینے جاری رہی۔

ان کے گھر کے لوگ ان کی بیماری یا معذوری سے کبھی نہیں اکتائے، وہ ہمیشہ ان کی درازیٔ عمر کی دعا کرتے رہے اور بڑی مستعدی، فرض شناسی کے ساتھ خدمت کی۔

اس زمانہ میں بھی ان کا ذہن یادِ الٰہی، فکرِ آخرت، اور دینی احکام کے معلوم کرنے سے غافل نہ تھا، دار العلوم کے اساتذہ بالخصوص مفتی محمد ظہور صاحب، مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی مدرسین دار العلوم اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی عیادت کو جاتے تو ان سے مسائل کی تحقیق فرماتے، حافظ محمد اقبال مدرس دار العلوم سے بہت مانوس تھے، ان کے آنے سے خوش ہوتے اور دینی گفتگو کرتے، انھیں نے غسل بھی دیا، یہاں تک کہ ۳۰؍جنوری ۱۹۷۶ء کو ساعت موعود آگئی، اور انھوں نے اس جہان فانی سے عالم جاودانی کا سفر اختیار کیا، ان کی وصیت کے مطابق نماز جنازہ کی سعادت ان کے اس نیاز مند کے حصہ میں آئی اور وہ اپنے محلّہ کے قبرستان ڈالی گنج میں آسودہ خاک ہوئے۔

□□□

مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی مکیؒ مرحوم

بچپن سے جن بزرگوں، مجاہدوں کی وقعت وعظمت اورعقیدت ومحبت دل ودماغ میں پیوست ہوئی، ان میں ایک مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، خاندان کے بزرگ اوراساتذہ ان کے اس کارنامہ کا بڑی عظمت واہمیت کے ساتھ ذکر کرتے تھے کہ وہ عیسائی مشنریوں کے مقابلہ میں اس وقت اٹھے جب ان کے سروں پر سلطنت برطانیہ کے ''ہُما'' نے آشیانہ بنالیا تھا، یہ وہ افسانوی پرند ہے، جس کے متعلق مشہور ہے کہ سر پر اڑتا ہوا گزر جائے تو اس کو سلطنت نصیب ہوتی ہے، لیکن اڑنے کا کیا ذکر اس نے توان کے سر پر نشیمن ہی بنالیا تھا، اور ایک ایسی سلطنت جس کے قلمرو میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا، اور جس نے ابھی سلطنت مغلیہ کا چراغ گل کیا تھا، ان کی پشت پناہ تھی، اس وقت ان کے مقابلہ اور اسلام کی جواب دہی میں لب کشائی ''کلمة حق عند سلطان جائر'' کا پورا پورا مصداق تھا، بزرگوں کو ان کے پادری فنڈر سے مناظرہ کرنے اور اس کے ہندوستان چھوڑ کر چلے جانے کا ذکر ایسا مزہ لے لے کر کرتے سنا، جیسے وہ جنگ صلیبی میں رچرڈ کے مقابلہ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتح کا ذکر کررہے ہوں، اس مسرت میں وہ نفرت چھپی ہوئی تھی، جو ان کو انگریزوں اور ان کی تہذیب اور ان کی پیہم فتوحات اور کامیابی سے تھی، میرے محبوب ومحترم استاد حدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ نے سفر حج کے موقع پر ان کی زیارت بھی کی تھی، اور وہ ان کا بڑی عقیدت وعظمت کے ساتھ نام لیتے تھے، جب کچھ اور ہوش سنبھالا اور پڑھنے کے قابل ہوا توان کی شہرۂ آفاق کتاب ''اظہار الحق'' کی زیارت کی اور اہل نظر ومبصرین نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، اس کو

پڑھا، ''نزہۃ الخواطر'' کی آٹھویں جلد میں (جو اس کی آخری جلد ہے) اپنے والد ماجد کے حقیقت نگار اور محتاط قلم سے ان کا ترجمہ (تذکرہ) پڑھا جس میں اختصار اور اعتدال کے باوجود بلند الفاظ میں ان کی علمی جلالتِ شان اور ان کی دینی خدمات کا اعتراف تھا، یہ تھی میری پہلی واقفیت کیرانہ کے اس خاندان سے جس سے مولانا محمد سلیم صاحب کا تعلق ہے۔

برادرِ معظم مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم کے پاس جن کو حرمین شریفین سے نسبت رکھنے والی ہر چیز سے گہرا تعلق تھا، ''ندائے حرم'' کے پرچے دیکھے اور مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کی بعض رودادیں اور تعارفی رسالے دیکھے جو مولانا محمد سلیم صاحب کے قلم سے نکلے تھے، سب سے پہلے میرے ادبی ذوق کو جس نے متوجہ کیا، وہ ان مطبوعات کی پیشانی پر لکھی ہوئی وہ قرآنی آیت تھی، جس کا اتنا صحیح اور برمحل استعمال کم لوگوں نے کیا ہوگا، پہلے یہ یاد کر لیجئے کہ مدرسہ صولتیہ (جس کا یہ رسالہ ترجمان تھا) کے بانی مولانا رحمت اللہ صاحب تھے، پھر یہ آیت پڑھیے، ''فَانْظُرْ اِلٰی اٰثَارِ رَحْمَةِ اللّٰهِ'' اسی کو نگینہ کی طرح جڑنا کہتے ہیں، پھر مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ پرچہ مکہ معظمہ سے نکلتا ہے، اس کے مدیر و مرتب ایک ایسے صاحب ہیں، جن کی عمر اسی ''وادی غیرذی زرع'' میں گزری، لیکن ان کے قلم اور تحریر میں ایسی شادابی اور رنگینی ہے کہ لکھنؤ اور دہلی کے ادیبوں کا ہوتا ہے، اردو محاورات کا صحیح استعمال، کہیں کہیں رعایت لفظی جس کا نباہ منجھے ہوئے اہل زبان سے بھی مشکل ہوتا ہے، تحریر میں خشکی اور ثقالت کہیں نام کو نہیں، پرچہ ایک دینی مدرسہ کا مقصد، ایک دینی تحریک و ادارہ کا تعارف، لیکن ہاتھ میں لیجئے تو پورا پڑھے بغیر رکھا نہ جائے، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب اور ادبی ذوق بھی ایک فطری حاسہ ہے، جو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے، اور وہبی زیادہ ہے کسبی کم۔

نام تو برسوں سے سن رہا تھا، اور نقوش تحریر بھی سالہا سال سے دیکھتا تھا، پہلی زیارت ۱۹۴۳ء میں دہلی میں ہوئی، مولانا بعض مجبوریوں اور مصلحتوں سے کچھ عرصہ کے لیے ہندوستان آگئے، انھوں نے قرول باغ دہلی میں مدرسہ صولتیہ کا دفتر کھول لیا تھا،

اور وہیں مقیم تھے، خوش قسمتی سے یہ دفتر جس عمارت میں کھولا گیا تھا، اسی کے ایک حصہ میں میرے والد مرحوم کے مخلص دوست، عم مخدوم ومحترم الحاج سید محمد خلیل صاحب نہٹوری مرحوم مقیم تھے، ان کے صاحبزادہ گرامی قدر سید محمد جمیل صاحب (جو بعد میں پورے پاکستان کے اکاؤنٹنٹ جنرل ہوئے) ریلوے کے آڈیٹر تھے، اور اس زمانہ میں دہلی میں ان کا قیام تھا، قریب ہی ''ندوۃ المصنفین'' کا ادارہ اور مدرسہ سبحانیہ واقع تھا، اور ان سب کے سرپرستوں اور کارکنوں سے راقم سطور کے نیازمندانہ اور دوستانہ تعلقات تھے، اور ان سب جگہ آمد ورفت تھی، یہ زمانہ داعی الی اللہ مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آخری علالت کا تھا، مولانا محمد سلیم کے کاندھلہ کے اس خاندان سے قرابت اور عزیزداری کے رشتے تھے، ان کا نظام الدین برابر آنا جانا رہتا تھا، میں نے مولانا مرحوم کو ان سے بزرگانہ اور عزیزانہ طریقہ پر ملتے ہوئے دیکھا۔

خوب یاد آیا، ایک مرتبہ جب میں مولانا کی معیت میں کاندھلہ حاضر ہوا تو مولانا محمد سلیم صاحب کاندھلہ ہی میں (جہاں اس خاندان میں ان کی شادی ہوئی تھی) مقیم تھے، مولانا ان سے ملنے گئے، میں بھی ساتھ تھا، غالباً...... یہی سب سے پہلے دید وشنید تھی، جو ان کے ہندوستان کے قیام کے دوران مجھے حاصل ہوئی، نظام الدین کی ملاقاتیں اس کے بعد کی ہیں، عربی زبان کا محاورہ "ملء العین والسمع" بیسوں بار پڑھا اور بار ہا لکھا تھا، جب کوئی ایسا شخص سامنے آئے جو آنکھوں اور کانوں میں سما جائے اور دونوں اس سے یکساں فیض پائیں اور اس کے گن گائیں تو عرب کہتے ہیں کہ فلاں شخص "ملء العین والسمع" ہے، یہ فیصلہ مشکل ہو جائے کہ وہ باصرہ نواز زیادہ ہے یا سامعہ نواز، تو ایسے موقع پر عرب تذکرہ نگار اس کوزہ میں دریا کو بند کر دیتے ہیں، میرے لیے ان گنے چنے حروف کا ترجمہ چند جملوں میں مشکل ہے، بہر حال یہ جملہ مولانا محمد سلیم صاحب پر پورے طور پر منطبق ہوتا تھا، وجیہ وجمیل، خوش پوشاک وجامہ زیب، ہر ہر چیز سے نفاست اور نستعلیقیت کا اظہار، بولیں تو منھ سے پھول جھڑیں، بات بات میں نکتے اور لطیفے، موزوں اشعار

ومصرعے، مجلس میں بیٹھئے تو اٹھنے کو جی نہ چاہے، معلوم نہیں کہ کتنی بار اور کتنے اشخاص کے لیے یہ شعر لکھا گیا ہوگا، اور خدا معاف کرے اس لکھنے والے نے بھی کتنا اس سے کام لیا ہوگا، لیکن اچھے شعر کی خوبی یہی ہے کہ وہ ایک بار استعمال ہونے کے بعد پرانا نہیں ہوتا۔

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں

کبھی مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم مجھے کسی کام یا پیغام کے لیے قرول باغ بھیجتے، اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، مجھے بھی مولانا کا شریک محفل بننے کا موقع مل جاتا، اتفاق سے انھیں دنوں مولوی ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی (ایم.اے علیگ) مرحوم بھی دہلی میں مقیم تھے، وہ مجھ پر خاص کرم فرماتے تھے، اور مجھے بھی ان سے بڑی مناسبت وموانست تھی، وہ بھی ایک باغ وبہار آدمی تھے، میں قرول باغ جاتا تو آدھے آدھے دن رہ جاتا کھانے کا وقت ہوتا تو مولانا محمد سلیم صاحب دسترخوان لگانے کا حکم دیتے اور دسترخوان کیا ہوتا دہلوی وحجازی کھانوں کا ایک مجموعہ جس سے میزبان کے لطافت ذوق کا پورا پورا اظہار ہوتا، عم محترم سید محمد خلیل صاحب بھی تشریف لے آتے، جن کو خود کھلانے پلانے اور مہمانوں کی خاطر ومدارات کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا، اور میں تو ان کو اولاد کی طرح محبوب وعزیز تھا، پھر مولوی ظہیر الحسن صاحب اور مولانا سلیم صاحب کی نوک جھونک اور بذلہ سنجیاں جو کھانے کے لطف کو اور دوبالا کر دیتیں، اسی زمانہ میں مولانا کے عزیز خاص پروفیسر حافظ محمد عثمان صدر شعبۂ ریاضی پشاور یونیورسٹی بھی آئے ہوئے تھے، اور مولانا محمد سلیم صاحب ہی کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے، مولانا محمد الیاس صاحب کی ہدایت تھی کہ حافظ صاحب میرے عزیز خاص ہیں، میں ان کا خاص اکرام اور دلجوئی کروں، غالباً حافظ ضیاء الدین صاحب مہتمم دفتر بھی اس زمانہ میں وہیں تھے، غرض یہ مجلسیں کبھی فراموش نہ ہوں گی، اور لکھنوی شاعر کے انداز میں کہنا ہوگا۔

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

۱۳٦٦ھ (۱۹۴۷ء) میں پہلے حج کی سعادت نصیب ہوئی، مدرسہ صولتیہ ہندوستانی حجاج کا تو گویا ملجا وماویٰ تھا، اور وہ اس پر اپنا حق سمجھتے تھے، خوش قسمتی سے مدرسہ کے ناظم ومہتمم بھی اس حق کو مانتے تھے، مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام میں ہر دوسرے...... تیسرے دن وہاں جانا ہوتا، مولانا اپنے دفتر کے بالائی حصے میں رونق افروز ہوتے اور یہ لفظ ''رونق افروز'' کسی کے لیے شاعری ہو، ان کے لیے حقیقت تھا، اس کمرے کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی وہ بلند آواز سے پوری گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم فرماتے'' آیئے مولوی ابوالحسن صاحب'' کی آواز اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے، ان کے استقبال میں بزرگانہ شفقت بھی تھی، اور عزیزانہ محبت بھی، چند ہی جملوں میں جسمانی تکان اور ذہنی بار دور ہوجاتا، وہ اردو عربی دونوں نہ صرف یکساں قدرت کے ساتھ بلکہ یکساں حلاوت ولطافت کے ساتھ بولتے تھے، میں نے ہندی الاصل حجازیوں کی عربی میں ان سے اور مولانا سید محمود صاحب مدنی سے زیادہ بے ساختگی اور برجستگی نہیں دیکھی، مزاح ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اور خشکی اور ''عبوس'' میں سے ان کو نام کو بھی حصہ نہیں ملا تھا، کسی عرب عالم سے میرا تعارف کراتے ہوئے بولے "اسمه أكبر من جسمه أبو الحسن علي الحسني الندوي"

مولانا کی ان مجلسوں کا موضوع خاص (اور خاص طور پر جب اس مجلس میں کوئی نامحرم نہ ہو) انگریزوں کی اسلام دشمنی، حکومت برطانیہ کی جرائم پیشگی، خلافت عثمانیہ کے استیصال کی کوششیں، ترکوں اور مسلمان سلطنتوں کے خلاف اس کی سازشیں، ترکی عہد کی برکتیں، شریف مکہ کی غداری اور مسلمانوں کی سادہ لوحی، مؤتمر اسلامی مکہ معظمہ میں علی برادران کی آمد، مولانا کے والد ماجد مولانا محمد سعید صاحب سے رات گئے تک مشورے اور راز ونیاز کی باتیں، ترکوں کے معاملہ میں شریف مکہ اور اس کے اعوان وانصار کی سفاکی اور ناخدا ترسی، یہ وہ پسندیدہ اور دائمی موضوع تھا، جس سے مشکل سے کوئی مجلس (بشرطیکہ وہ بہت مختصر نہ ہو) خالی جاتی ہوگی، مولانا ان دلخراش اور جگر دوز واقعات سے اتنے متاثر اور انگریزوں کے بارے میں اتنے ذکی الحس تھے کہ بعض مرتبہ اپنے خاص انداز میں فرماتے تھے کہ

''اگر انگریزوں کا کوئی حامی یا وکیل غلاف کعبہ کو جسم سے لپیٹے ہوئے حجر اسود کی گھڑی لگائے اور سر پر قرآن شریف رکھے ہوئے بھی آئے اور قسم کھائے تو مجھے اس کی صداقت کا یقین نہ ہوگا''میں نے بارہا ان سے عرض کیا کہ آپ جو چیزیں بیان کرتے ہیں، ان کو نوٹ کرا دیں اور تحریری طور پر محفوظ کر دیں، وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب سلطان ابن سعود کا قبضہ ہوا تو شریف مکہ کے قصر میں جو کچھ فائلیں اور کاغذات تھے وہ ردّی کی طرح باہر ڈال دیئے گئے، بچے ان کو اٹھا کر لے جانے لگے، بعض چیزیں میرے ہاتھ بھی لگیں، ان سے عجیب وغریب انکشافات ہوتے تھے، اور ان کی مدد سے ایک تاریخ مرتب ہو سکتی تھی، افسوس ہے کہ مولانا کی وارستہ مزاجی اور شدید مشغولیت نے اس کا موقع نہیں دیا، اور غالباً یہ قیمتی معلومات وہ اپنے ساتھ لے گئے۔

۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) کے بعد ۱۳۶۸ھ (۱۹۴۹ء) میں دوبارہ حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، یہ سفر مرشد محترم مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی ہم رکابی میں تھا۔

حضرت کے قیام مکہ کے منتظم مولانا محمد سلیم ہی تھے، انھوں نے باب الباسطیہ میں ایک مکان کا انتظام کیا تھا، میں بھی ساتھ ہی رہتا تھا، حج کے بعد حضرت مدرسہ صولتیہ کے بالائی حصہ میں منتقل ہو گئے، جہاں کئی زینے چڑھ کر پہنچنا ہوتا تھا، جس نے حضرت کی زندگی کا آخری زمانہ دیکھا ہے، وہ کہاں یقین کر سکتا ہے کہ حضرت دن میں کئی کئی بار یہ زینے چڑھتے اور اترتے تھے، اسی زمانۂ قیام میں مولانا کو اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، مولانا سلسلۂ صابریہ چشتیہ کے مشہور شیخ حضرت شیخ جلال الدین پانی پتی کی اولاد میں تھے، جو حضرت مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولوی کے پیر و مرشد تھے، اس نسبت سے سلسلۂ صابریہ چشتیہ کے تمام مشائخ و وابستگان مولانا کا احترام کرتے تھے، حضرت چونکہ اس سلسلۂ عالیہ کے نامور مشائخ میں تھے، اس لیے آپ بھی ان کا بہت لحاظ فرماتے تھے، پھر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے مجاہدانہ کارناموں سے خوب واقف اور ان کے بڑے قدرداں تھے، آپ

نے مولانا محمد سعید صاحب کا زمانہ بھی دیکھا تھا، اس لیے آپ کو بھی مولانا کی ذات اور مدرسہ صولتیہ سے بڑا تعلق تھا، اور مولانا محمد سلیم صاحب بھی پوری بزرگ داشت ملحوظ رکھتے تھے۔

حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے تشریف لے جانے کے بعد مجھے اور میرے ندوی رفقاء اور عزیزوں کو مکہ معظّمہ میں ٹھہرنا تھا، اور دعوت وتعارف کا کام کرنا تھا، مولانا نے ازراہ کرم ان عزیزوں کو مدرسہ صولتیہ کے دارالاقامہ میں جگہ دے دی، عزیزانِ گرامی مولوی عبداللہ عباس ندوی (۱)، سید رضوان علی رامپوری (۲) عزیزی محمد رابع اور مولوی محمد طاہر منصور پوری عرصہ تک دارالاقامہ میں رہے، پھر محلّہ شامیہ کی رباط بھوپال میں منتقل ہوگئے، لیکن مولانا سے اور مدرسہ صولتیہ سے ربط برابر قائم رہا، یہ راقم سطور اپنے عزیزوں مولوی معین اللہ ندوی اور مولوی عبدالرشید ندوی کے ساتھ مصر چلا گیا اور تقریباً ۶، ۷ مہینے کے بعد مکہ معظّمہ واپس ہوا اور اسی رباط میں اگلے حج تک قیام رہا، مولانا کی خدمت میں حاضری کا شرف برابر حاصل ہوتا رہا، اور ہمیشہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ ہم اپنے کسی بزرگ خاندان کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں، ان کے پاس بیٹھ کر ہمیشہ غم غلط ہوتا اور اپنے بزرگوں وعزیزوں سے مل کر جو تقویت اور مسرت حاصل ہوتی ہے، اس کا احساس ہوتا۔

۱۳۷۰ھ (۱۹۵۰ء) کے بعد سے ۱۳۸۱ھ (۱۹۶۱ء) تک گیارہ برس کا زمانہ حجاز کی حاضری سے مسلسل محرومی میں گزرا، ایسا اندیشہ ہونے لگا تھا کہ شاید اب پھر وہاں کی حاضری نصیب نہ ہوگی، اچانک ۱۹۶۱ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا قیام عمل میں آیا اور اس کے معاً بعد رابطہ عالم اسلامی قائم ہوا، اور یہ بے ہنر دونوں کی تاسیسی مجلسوں کا رکن منتخب ہوا اس طرح اللہ نے حجاز کی بار بار حاضری کا غیبی سامان پیدا فرمادیا اور تقریباً ہر سال اور بعض مرتبہ سال میں دو دو مرتبہ کسی نہ کسی تقریب سے حاضری نصیب ہوتی، مولانا کو جب اس پروگرام کا علم ہوتا تو خوش ہوتے، حاضر ہوتا تو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے

---

(۱) حال ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی استاذ جامعۃ الملک عبدالعزیز۔

(۲) حال ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی استاذ جامعہ طرابلس لیبیا۔

اور فرماتے کہ ان اداروں کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ آپ آجاتے ہیں، اور آپ سے ملاقات ہوجاتی ہے، پھر اپنا پرانا دردِ دل کہتے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو یہودی مسیحی سازشیں دنیا میں ہو رہی ہیں، ان پر تبصرہ فرماتے، حکیم سنائی کے اس مصرعہ کی تشریح و تفصیل ؎

گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

میں نے انگریزوں اور برطانوی اقتدار سے ایسا نفرت کرنے والا، ترکوں کا حامی و مداح، اور سلطنت عثمانیہ کے زوال اور اس کے اسباب کی تاریخ سے واقف کم دیکھا ہے، ان کی مغفرت اور ترقی درجات کے انشاء اللہ بہت سے اسباب و ذرائع ہیں، مکہ معظمہ کے ایک مرکزی دینی ادارہ کی طویل و مسلسل خدمت، مکہ معظّمہ کا طویل قیام، ہر سال کا حج، حجاج کی خدمت، جنۃ المعلی میں اجلۂ صحابہ و صحابیات اور اولیائے امت کے جوار میں تدفین، یہ سب وہ نعمتیں اور "آثار رحمۃ اللّٰہ" ہیں جو ان کے خوش قسمت ہونے کی دلیل اور مغفرت کی علامتیں ہیں، لیکن میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا زادِ راہ (اسلام اور ایمان کی دولت کے بعد) ان کی وہ حمیت اسلامی اور دینی غیرت ہے، جو ہزار عبادتوں سے زیادہ موجب رضا اور جالب رحمت ہے، اور جس کا حصہ وافر ان کو ملا تھا، الحب للّٰہ کی دولت کا حصہ تو بہت لوگوں کو ملتا ہے، لیکن البغض فی اللّٰہ کی دولت خاص ہی خاص لوگوں کو عطا ہوتی ہے، میری معلومات اور مشاہدہ کی حد تک ان کو اسلام اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے مسیحی اقتدار سے جس کا سب سے بڑا نمائندہ برطانیہ تھا، جتنی شدید نفرت تھی، وہ کم لوگوں کو ہوگی، مکہ معظّمہ میں جو عالم اسلامی کا قلب ہے، بیٹھ کر ان کو تمام ممالک کی معلومات بیٹھے بیٹھے حاصل ہوجاتی تھیں، وہ اخبارات و رسائل کا خود ہی مطالعہ کرتے تھے، آنے جانے والوں سے اور مدرسہ صولتیہ کے پرانے فضلاء سے جو بہت سے ملکوں میں پھیلے ہوئے تھے، وہ حالات و واقعات معلوم کرتے رہتے تھے، اور خود مرکز اسلامی میں ان کے تہذیبی و تعلیمی اثرات کا مشاہدہ کرتے اور ان پر کڑھتے رہتے، اور اس

سب سے ان کے اس یقین میں اضافہ ہوتا تھا کہ۔۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں

تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا صاف اور فراخ دل عطا فرمایا تھا، ہندوستانی مسلمانوں سے ان کو بڑا گہرا تعلق تھا، اور حجازی ہو جانے کے باوجود یہ وابستگی ختم نہیں ہوئی تھی، وہ ان کی خوشی سے خوش اور ان کی پریشانی سے پریشان ہوتے تھے، ہندوستان میں کوئی اچھا کام ہوتا تھا تو اس سے خوش ہوتے اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے، ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن ہوا تو مولانا نے اس سے اپنی گہری دلچسپی اور مسرت کا اظہار کیا، صاحبزادۂ گرامی قدر مولوی محمد شمیم صاحب اور اپنے دو پوتوں (عزیزان مولوی حلیم و مولوی حشیم سلمہما) کو شرکت کے لیے مدرسہ صولتیہ کے وفد کی حیثیت سے بھیجا، ایک رقم بھی عنایت فرمائی، پھر جب اس کی روداد چھپی اور اس کی کامیابی کا حال معلوم ہوا تو بڑی مسرت کا اظہار کیا اور مبارک باد دی، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا خود مدرسہ صولتیہ کا جشن تھا، اور اس کی کامیابی ان کی کامیابی تھی، مقاصد سے دلچسپی کے علاوہ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کے ایک بھتیجے مولانا بدر الاسلام جو سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ میں قصر سلطانی میں ان کے کتب خانہ کے مہتمم رہے ہیں، ایک عرصہ تک دار العلوم ندوۃ العلماء میں ادب عربی کے مدرس رہے، مولانا اکثر اس کا تذکرہ فرماتے تھے، اب ایسے سراپا شفقت و محبت بزرگ جن کے ساتھ ایک پوری تاریخ وابستہ ہو اور جو خود اپنی ذات سے ایک ادارہ اور انجمن ہوں کب پیدا ہوں گے اور کہاں سے آئیں گے؟

یکم جولائی ۱۹۷۷ء کو دورۂ امریکہ کے درمیان فلاڈلفیا میں میری آنکھ کا آپریشن ہوا، اس کی اطلاع جب مولانا کو مکہ معظمہ میں ملی تو انھوں نے اس کی کامیابی کے لیے دعا کی اور اس کے لیے وہ فکرمند تھے کہ وہ خود اس مرحلہ سے گزر چکے تھے، اور میری تصنیفی و قلمی مصروفیت اور اس کے تقاضوں سے واقف تھے، آپریشن کے بعد میں آرام کا وقفہ شیکاگو

میں گزار رہا تھا کہ عزیزی سید حسن عسکری طارق سے جو مکہ معظّمہ سے چند دن میرے پاس رہنے کے لیے آئے تھے، اچانک معلوم ہوا کہ......کو مولانا محمد سلیم صاحب سفر آخرت پر روانہ ہو گئے اور جنت المعلی میں اپنے بزرگ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے پہلو میں دفن ہو کر جوارِ رحمت میں پہنچ گئے، رحمۃ اللہ علیہ۔

❑❑❑

نامور ادیب وانشا پرداز

- مولانا عبدالماجد دریابادی
- پروفیسر رشید احمد صدیقی
- چودھری غلام رسول مہر
- مولانا ماہر القادری

مولانا عبدالماجد دریابادی

۱۹۲۴ء کا کوئی مہینہ تھا، میری عمر دس گیارہ سال کی تھی، میں اس زمانہ میں والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے والدہ صاحبہ کے ساتھ اپنے وطن رائے بریلی میں رہتا تھا کہ اچانک ایک اخبار کسی کے ہاتھ میں دیکھا جس میں اس زمانہ کے مشہور بزرگ مولانا سید عین القضاۃ صاحب بانی مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ کی وفات کی خبر، ان کے انتقال کا واقعہ اور ان کے متعلق ایک مفصل مضمون تھا یہ ''سچ'' کا پہلا پرچہ تھا، جو نظر سے گزرا، بات بہت پرانی ہوگئی، مضمون تو غالباً مولانا عین القضاۃ صاحبؒ کے مسترشد مولوی ظفر الملک صاحب علوی کاکوروی کا لکھا ہوا تھا، جو اس وقت شریک ادارت تھے، لیکن لوح پر مدیر کی حیثیت سے نام مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا تھا جو لوحِ دل پر اسی وقت سے نقش ہوگیا، غالباً اس سے زیادہ سیدھا سادھا، عام فہم اور روزمرہ کسی پرچہ یا اخبار کا نام اس وقت ہندوستان میں نہ تھا، لیکن اس کا ادبی معیار، اس کے مضامین کی سطح میری عمر اور استعداد سے بہت زیادہ تھی، اس لیے اس عمر میں اس سے زیادہ استفادہ کا موقع نہ تھا، اور نہ اس شمارے کے بعد کسی اور شمارے کا دیکھنا یاد آتا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد میں اپنی تعلیم کی غرض سے زیادہ تر لکھنؤ اپنے بڑے بھائی حکیم ڈاکٹر مولوی سید عبدالعلی صاحب کے پاس رہنے لگا، محمد علی ڈائری کے ابتدائی مضمون سے معلوم ہوا کہ مولانا عبدالماجد صاحب اپنے محبوب مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی معیت میں ندوہ کے اجلاس کانپور (۱۹۲۵ء) میں شریک تھے، میں بھی ایک کم سن تماشائی کی حیثیت سے جس کے خاندان کا اس تحریک و ادارہ سے بہت قدیم اور گہرا تعلق تھا، اول سے آخر تک

اجلاس میں شریک رہا، ہندوستان کے چوٹی کے مشاہیر عصر اور زعماء کی اپنی عمر میں پہلی مرتبہ وہیں زیارت کی، حاذق الملک حکیم اجمل خاں تو خیر صدر جلسہ ہی تھے، مولانا ظفر علی خاں، قاضی محمد سلیمان منصور پوری مصنف سیرت "رحمۃ للعالمین" مولانا شاہ پھلواروی اور کتنے ہی مشاہیر کو وہیں دیکھا، اس وقت اچھی طرح یاد نہیں، لیکن یہ بات ہر طرح قرین قیاس ہے کہ مولانا عبدالماجد صاحب کو پہلی مرتبہ وہیں اسٹیج پر مولانا محمد علی کے پہلو میں بیٹھا ہوا دیکھا ہو۔

لیکن شعور اور تعارف کی پہلی ملاقات اس کے ایک دو سال بعد ہوئی، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی لکھنؤ تشریف لائے ہوئے تھے، خیالی گنج کی کاکوری والی کوٹھی سے ندوہ تک منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کی فٹن میں مولانا عبدالماجد صاحب کی معیت وہمرکابی کا شرف حاصل ہوا، مولانا اگرچہ اس وقت کہن سال نہیں، لیکن کہنہ مشق تو ضرور تھے، ایک مشہور و معروف ادیب، فلسفی، مصنف، صحافی اور مفکر اور ایک ۱۳،۱۴ سال کی عمر کا طالب علم کا کیا جوڑ، مولانا کو التفات بھی نہ ہوتا لیکن تعارف ہونے پر والد صاحب اور بھائی صاحب کے تعارف و تعلق سے بزرگانہ شفقت فرمائی گئی۔

اس زمانہ میں میں شیخ خلیل عرب صاحب سے پڑھتا تھا، ان کا مکان بازار جھاؤ لال لکھنؤ میں عربی ادب و زبان کی تعلیم کا ایک مرکز بنا ہوا تھا، میری عربی تعلیم کی تو بسم اللہ ہی وہیں ہوئی، لیکن دارالعلوم ندوۃ العلماء، فرنگی محل اور لکھنؤ یونیورسٹی کے بہت سے منتہی طلبہ اور عربی ادب کے شائقین مختلف وقتوں میں وہاں استفادہ اور تعلیم کے لیے آتے تھے، یہ مختلف عمروں اور استعدادوں کے طالب علم تھے، اور اکثر خارج وقت میں پڑھنے والے تکمیل کے طالب علم ہوتے تھے، اس لیے ان سے زیادہ مناسبت اور یگانگت کی کوئی وجہ نہ تھی، میرے ایک ہی ہم عمر اور ہم سبق ساتھی تھے، اور وہ عرب صاحب کے چھوٹے بھائی حسین عرب، یا کچھ عرصہ کے بعد میرے چچازاد بھائی سید ابوبکر حسنی (۱) تھوڑا زمانہ گزرا تھا کہ ایک ہم عمر اور ہم سن طالب علم کا اضافہ ہوا یہ مولانا عبدالماجد صاحب کے بھتیجے حکیم

---

(۱) سید ابوبکر حسنی ایم۔اے حال استاذ مہرو یونیورسٹی دہلی۔

عبدالقوی صاحب تھے، جن کو ہم لوگ ان کے عرفی اور گھریلو نام آفتاب میاں سے جانتے اور خطاب کرتے تھے، بھائی آفتاب صاحب کا مطالعہ اس وقت بھی ہم لوگوں کے مقابلہ میں وسیع اور متنوع تھا، وہ مولانا کے تعلق اور رشتہ سے مولانا محمد علی کے نام کے عاشق اور فدائی تھے، اور ان کے تمام مخالفین اور معترضین سے سخت ناراض تھے، مجھ پر ''زمیندار'' کے مطالعہ سے مولانا ظفر علی خاں کا رنگ چڑھا ہوا تھا، اور سیاست اور ادب وشاعری سب میں ان کے گن گاتا تھا، اکثر ہم دونوں کی نوک جھونک ہوتی اور عرب صاحب کے مکان کی دیوار کے نیچے گلی میں کھڑے ہوئے مناظرے ہوتے رہتے، ان کے ذریعہ مولانا کی تحریروں، مضامین اور تصانیف کا نام اور حوالے کان میں پڑے۔

مولانا کی سب سے پہلی تحریر جو بھائی آفتاب کے ذریعہ پڑھنے کو ملی وہ مولانا کا وہ خطبۂ استقبالیہ تھا، جو چند سال پہلے لکھنؤ میں ہونے والی خلافت کانفرنس کے لیے لکھا گیا تھا، یہ ایک نیم دینی، نیم سیاسی جلسہ میں پڑھا جانے والا خطبہ تھا، لیکن سیاسی ودینی سے زیادہ اس پر ادبی رنگ غالب تھا، اور وہ ایک سیاسی خطبہ ہونے کے بجائے ایک ادبی دستاویز اور مولانا کے طرز تحریر کا ایک اعلیٰ ادبی نمونہ بن گیا تھا، میں اس سے پہلے آزاد کی ''آب حیات'' ''نیرنگ خیال'' اور خالص ادبی چیزوں میں رتن ناتھ سرشار کا ''فسانۂ آزاد'' پڑھ چکا تھا، علامہ شبلی کی چند اہم ادبی تصنیفات بھی نظر سے گزر چکی تھیں، اس لیے ادب اور زبان کا چٹخارا پیدا ہو گیا تھا، اور اچھا برا سمجھنے لگا تھا، مولانا کا خطبہ بڑے لطف وذوق سے پڑھا اور دل نے پہلی مرتبہ ان کے قلم اور زور بیان کا لوہا مانا، اس کے بعد جب کبھی مولانا کی خدمت میں حاضری ہوئی، قدیم تعارف کے بعد بھائی آفتاب کی ہم مکتبی کی نسبت کا اضافہ ہو گیا جو مولانا کے لیے قدرۃً کشش اور مزید شفقت کا ذریعہ بن گئی اور اس طرح اس محبت وشفقت میں جدید آب وتاب پیدا ہو گئی۔

یہی زمانہ تھا جب مولانا عبدالماجد صاحب نے مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت واسترشاد کا تعلق پیدا کیا، میرے بڑے بھائی ڈاکٹر صاحب نے بھی اسی زمانہ میں مولانا

سے تعلق پیدا کیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا گھر لکھنؤ میں مولانا کی مستقل فرودگاہ بن گیا، اس جدید روحانی رشتہ سے مولانا عبدالماجد صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی جلد از جلد زیارت ہونے لگی۔

۱۹۲۹ء میں مولانا نے حج وزیارت سے فراغت حاصل کی اور وہ سفرنامہ ان کے قلم سے نکلا جو نہ صرف ان کی تحریروں بلکہ ان لاتعداد کتابوں میں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، امتیاز خاص رکھتا ہے، جہاں تک یاد ہے، یہ مولانا کی پہلی کتاب تھی جو میں نے بڑے شغف و انہماک کے ساتھ پوری پڑھی، پڑھتا تھا، اور مولانا کے زور قلم اور البیلے طرز تحریر پر جس میں ادب اور واردات قلبی کا نہایت حسین اور دلآویز امتزاج ہے، جھوم جھوم جاتا تھا، اسی زمانہ کے قریب ندوہ کے ابناء قدیم (اولڈ بوائز) کا جلسہ ہوا، انھوں نے مولانا کو اس جلسہ کا صدر اور حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کو صدر استقبالیہ منتخب کیا، مولانا نے جو علامہ شبلی کے ساتھ خصوصی تعلق اور ندوہ کے مقاصد سے ہم آہنگی بلکہ ندوہ کے تخیل کی عملی تصویر ہونے کی بنا پر اعزازی ندوی تسلیم کیے گئے تھے، اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے تو اپنے ایک خطبہ میں ان کو باقاعدہ فضلاء ندوہ میں شمار کر کے ان کو بطور سند پیش کیا تھا، اس موضوع پر جو خطبہ پڑھا، اس میں ان کے طرز تحریر کی ساری خوبیاں، ان کا پورا بانکپن اور اس کی پوری رنگینی موجود ہے، بے ساختہ اور بے تکلف مسجع عبارتیں اور ادبی استعارے اور تشبیہیں قلم سے نکل گئیں ہیں، حافظہ کی کمزوری کے باوجود اس کا ایک ٹکڑا ابھی تک یاد ہے، بانیان ندوہ، اساتذہ دارالعلوم اور موجودہ طالب علموں کو بیک وقت خراج محبت پیش کرتے ہوئے ان کے قلم سے یہ جملہ نکلا ہے۔

''اللہ کی رحمت پیرانِ مے فروش پر، اللہ کی رحمت جوانانِ مے نوش پر''۔

ایک فطری ادیب اور صاحب قلم کی پہچان یہ ہے کہ موضوع کیسا ہی سادہ، سنجیدہ اور خشک و پُر تقدس ہو، وہ اپنے قلم کی جولانی، خیال کی رعنائی اور طرز ادا کی دلآویزی کو روک نہیں سکتا، اور اس کے لیے اپنے ادبی ذوق اور اسلوب تحریر سے عاری و خالی ہو جانا ناممکن

ہوتا ہے، خلافت وندوہ کے خطبات کا ثقہ ومتین ماحول ہو، یا فلسفۂ اجتماع یا فلسفۂ جذبات کی سنگلاخ زمین اور پر خار وادی، یا تفسیر وتصوف کا پُر عظمت اور نازک میدان جہاں ہر ہر قدم پر "ہوشیار اور نگاہ روبرو" کی آواز اور بڑے ادیبوں کے کان میں۔

قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں

کی صدا آتی ہے، اس کا قلم گل کاری اور گلفشانی سے باز نہیں رہتا اور یہی راز ہے کہ ادب وزبان کے رسیا اور لطف بیان کے جویا بھی یہ "بھاری بھرکم" تحریریں ذوق وشوق سے پڑھ لیتے ہیں، اور گرانی محسوس نہیں کرتے خالص ادیبوں میں یہ امتیاز مولوی محمد حسین آزاد کا ہے کہ شعراء کی محفل شعر وسخن ہو، یا سلطان وقت کا دربار اکبری ان کی ہر تصویر میں نیرنگ خیال اور ان کی ہر تحریر میں آب حیات نظر آتا ہے، عالموں اور محققوں میں مولانا شبلی کی خصوصیت یہ ہے کہ "شعر العجم" اور "موازنہ انیس ودبیر" جیسی خالص ادبی وتنقیدی تصنیف ہو، یا "الفاروق" و "سیرۃ النبی" جیسی ثقہ، پر شوکت وباعظمت موضوع، یا "الکلام" و "علم الکلام" جیسا سنگین وخشک مضمون، ہر جگہ ان کی تحریر کی شگفتگی ورعنائی قائم رہتی ہے، اور ادب وزبان کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔

یہی اپنے رنگ میں مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی خصوصیت ہے کہ ان کی کوئی تحریر ادب وزبان کی چاشنی سے خالی نہیں اور کہیں ان کا اسلوب تحریر جو ان کی شخصیت بن گیا ہے، ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا، حد یہ ہے کہ لیکی کی کتاب ہسٹری آف یورپین مارلس کے ترجمہ "تاریخ اخلاق یورپ" میں بھی (جو اپنے موضوع، اپنے فنی اصطلاحات، اردو کی تنگ دامنی، اور ترجمہ کی مشکلات کی وجہ سے نہایت مشکل کام تھا) وہ پورے طور پر کامیاب ہوئے ہیں، اور پوری کتاب میں کہیں ثقالت وخشکی اور ترجمہ پن نظر نہیں آیا، میرے محدود مطالعہ میں ظفر علی خاں کی "معرکہ مذہب وسائنس" کے بعد ترجمہ کی کوئی کوشش اتنی کامیاب نظر نہیں آتی، اس بارے میں ان کے علاوہ اگر کسی کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ مولوی عنایت اللہ بی۔اے دہلوی ہیں۔

اب وہ زمانہ آیا کہ میرا ذہن بلوغ کی منزلیں طے کرنے لگا، بڑے بھائی صاحب کی صحبت میں مغربی تہذیب کی سطحیت اور موجودہ تمدن کا کھوکھلا پن نمایاں ہونے لگا اس موقع پر "سچ" کے پرچے جو ندوہ کی طالب علمی اور مولانا سے روز افزوں تعلق کی بنا پر باقاعدہ مطالعہ میں آنے لگے تھے، بڑی رہنمائی کرنے لگے، اور ان سے ذہن وشعور کو فراوانی کے ساتھ غذا ملنے لگی، بلکہ اس اجمال کی تفصیل اور اس خیال کی تکمیل اسی کی رہین منت ہے "سچ" کے مطالعہ نے دو بڑے کام کیے، ایک مغربی تہذیب کی جس کو مولانا یاجوجی تمدن اور دجّالی فتنہ سے تعبیر کرتے تھے، حقارت اور بے وقعتی اور اس کے ثبوت میں دلائل وواقعات کی فراہمی جو مولانا برطانیہ سے نکلنے والے انگریزی پرچوں سے براہ راست مہیا فرماتے تھے، دوسرے لسان العصر میر اکبر حسین الٰہ آبادی کی شاعری اور ان کے حکیمانہ خیالات سے گہری واقفیت اور قلبی مناسبت، اکبر کے کلام سے مخصوص خاندانی ماحول اور ہم خیالی کی بنا پر مناسبت تو شروع ہی سے تھی، لیکن "سچ" نے اس کو عقیدت ومحبت کے درجہ تک پہنچا دیا، "سچ" کا کوئی پرچہ مشکل سے ان دونوں باتوں سے خالی ہوتا تھا، مولانا انگلستان وہندوستان سے نکلنے والے پرچوں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے حقائق، اعداد وشمار، تہذیب مغرب کی ناکامی، اس کی انسانیت کشی اور انسان دشمنی کی مثالیں پیش کرتے رہتے تھے کہ آنکھیں کھل جاتیں اور خون کھول اٹھتا، دوسری طرف حضرت اکبر کے حکیمانہ اشعار کو اپنی دلپذیر تمہید وتشریح کے ساتھ اس طرح پیش کرتے کہ جن باتوں کے لیے ضخیم ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، وہ چٹکلوں میں ادا ہوجاتیں، اس طرح "سچ" اس ذہن وشعور کی تشکیل میں بیش قیمت مدد کرتا رہا جس کا اپنی بعد کی اردو عربی تصنیفات ہندوستان اور ہندوستان کے باہر دعوتی کاموں میں بنیادی حصہ رہا، یہ وہ احسان ہے جس کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

اب وہ وقت آیا کہ مجھے دار العلوم ندوۃ العلماء میں درس قرآن اور تفسیر کی خدمت سپرد ہوئی، مولانا نے اپنی انگریزی تفسیر کی تالیف کا سلسلہ شروع فرمادیا تھا، اور اس سلسلہ میں ان کے مطالعہ کا اصل میدان اور تفسیروں میں ان کی تفسیر کا اصل امتیاز صحف سماوی

اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ اور ان شخصیتوں، مقامات اور تاریخی ادوار کی جدید جغرافیائی وتاریخی معلومات کی روشنی میں تحقیق اور قرآن مجید کے مشکل مقامات کا حل پیش کرنا تھا، جن کے بارے میں جدید علوم، مستشرقین کے اعتراضات اور جدید مطبوعات نے مختلف سوالات کھڑے کر دیئے ہیں، میں اپنے درس میں سورہ بقرہ میں ہاروت ماروت کے قصہ "وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا" کی آیت پر پہنچا تو مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ مولانا کی تحقیقات ومطالعہ سے استفادہ کرلوں، غالباً سبق روک کر میں پہلی مرتبہ دریاباد اس مقصد سے گیا، مولانا نے قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے بھی اور دیرینہ تعلقات کی بنا پر بھی بڑی شفقت فرمائی، میں وہاں سے ایسے بہت سے سوالات کا جواب اور بہت سا قیمتی مواد لے کر آیا، یہ اتفاق غالباً کئی بار پیش آیا کہ مجھے جب کوئی ایسی مشکلات پیش آتیں تو میں دریاباد کا قصد کرتا یا مولانا کو خط لکھتا مولانا ہمیشہ جواب شافی سے مدد فرماتے، مولانا کے یہ خطوط جو تقریباً سب میرے پاس محفوظ ہیں، نہ صرف تفسیر کے طالب علموں کے لیے بلکہ عام اہل ذوق کے لیے بھی بڑی افادیت رکھتے ہیں۔

اس زمانہ میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے رسالہ "الندوہ" کا احیا فرمایا اور اس کی ادارت میرے اور رفیق محترم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کے سپرد ہوئی، میں نے عام ناظرین کی دلچسپی اور اہل علم کی رہنمائی کے لیے ایک سلسلہ مضامین "میری محسن کتابیں" کے عنوان سے شروع کیا اور ہندوستان کے مشاہیر اہل علم اور اہل نظر کو موضوع پر قلم اٹھانے کی دعوت دی، اس دعوت کی بڑی پذیرائی ہوئی اور قدیم وجدید حلقے کے چوٹی کے اصحاب فکر ونظر نے اس میں حصہ لیا، مضمون نگاروں کی پہلی صف میں قدرۃً مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بھی تھے، جنھوں نے دعوت قبول کر کے اپنی خورد نوازی اور علم پروری کا ثبوت دیا، اس مضمون میں ان کی زندگی کے بہت سے اہم واقعات اور ان کے ذہنی وفکری ارتقاء، انقلاب کی مختصر تاریخ آ گئی ہے، جس سے آئندہ مورخوں اور ادیبوں کو بڑی مدد ملے گی۔

میرے استفادہ اور خط وکتابت کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا، غالباً ۱۹۴۳ء میں مولانا نے اپنے ایک پرچہ میں لندن یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے صدر سی. ایم. جوڈ کی دو کتابوں ''نیو فلاسفی آف اور ٹائمز'' اور "A Guide to Modern Wickedness" کے اقتباسات پیش کئے، میں اس زمانہ میں کتاب ''مـاذاخسرالعالم بانحطاط المسلمين'' لکھ رہا تھا، جس کا مختصر اردو ترجمہ پہلے ''مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا'' پھر اضافوں کے ساتھ دوسرا ایڈیشن ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کے نام سے نکلا، میں نے یہ دونوں کتابیں امیر الدولہ لائبریری سے نکلوائیں اور پوری پڑھ گیا، لیکن ان کے بہت سے مقامات جو خاص اصطلاحات اور تاریخی واقعات اور ادبی تلمیحات پر مبنی تھے، میری سمجھ میں نہیں آئے، میں نے مولانا کو تکلیف دی، اور مولانا نے ان کی پوری تشریح فرمائی، میں نے اپنی کتاب کی تصنیف میں ان کے بہت سے اقتباسات پیش کئے اور ان سے بہت فائدہ اٹھایا، کتاب کی تالیف کے دوران مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ میں ''سچ'' اور ''صدق'' کے پورے فائل پر ایک نظر ڈال لوں کہ ان میں میرے کام کی بہت سی باتیں ہوں گی، سخت گرمی کا موسم تھا، اور میرے پاس صرف ایک دن تھا، مولانا کے اصول ومعمول کے مطابق میں اطلاع دے کر ایک دن صبح کی گاڑی سے پہنچا، مولانا ایسے موقع پر پسند کرتے ہیں کہ ان کے لائق بھتیجوں میں سے کوئی موجود ہوتا کہ کتابوں کے تلاش کرنے میں اور مہمان کے کام اور آرام میں ان سے مدد ملے اور مولانا کا حرج نہ ہو، غالباً عزیز گرامی محمد ہاشم صاحب قدوائی (حال استاذ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) موجود تھے، مولانا نے اپنے معمول کے مطابق ضروری انتظامی سوالات کئے، کتنا ٹھہروگے؟ دوپہر کا کھانا کس وقت کھاؤ گے؟ پرہیز وغیرہ وغیرہ، یہاں پر یہ ذکر بھی کرتا چلوں کہ یہ تھانہ بھون کی سنت ہے، جو مولانا کا دوسرا مرکز روحانی اور آخر میں مولانا کی ذہنی اور قلبی عقیدت کا سب سے بڑا مرکز رہ گیا تھا، مولانا تھانوی کے خلفاء اور مسترشدین بہت تھے، اور سب ان کے رنگ کے عاشق، لیکن انضباط اوقات اور تنظیم کار کا جیسا نمونہ مولانا کے یہاں دریاباد

میں دیکھا مشکل سے کہیں اور پایا اور یہی راز مولانا دریابادی کے اتنے مختلف النوع بلکہ متضاد کاموں کو کامیابی وخوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کا ہے، غرض ان سوالات پر میں نے عرض کیا کہ میں صرف آج ٹھہروں گا، اور چونکہ وقت بہت کم اور کام بہت ہے، دوپہر کا کھانا نہیں کھاؤں گا کہ گرمیوں میں اس کے بعد کام کرنا مشکل ہے، باوجود بزرگانہ شفقت کے ایک بار بھی اس پر جرح نہیں فرمائی اور نہ کھانے پر اصرار کیا، میں نے کام شروع کیا اور "سچ" کا جب سے اجراء ہوا تھا، میں نے اس کے پرچوں پر نظر ڈالی اور اپنے کام کی چیزیں نوٹ کرنی شروع کیں، تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مولانا کے ایک فرستادہ گنے کا رس لے کر آئے کہ یہ گرمی کا زمانہ ہے، اور کھانے میں داخل نہیں، اس میں کوئی حرج نہ ہوگا، میں نے اس کو بسروچشم قبول کیا، گھنٹے دو گھنٹے کے بعد پھر اسی طرح سے لسّی کا گلاس اور پھر کسی وقت شربت آیا اور میں اس حکیمانہ ضیافت ومیزبانی کی داد دیتا رہا، اور قبول کرتا رہا، واقعہ یہ ہے کہ اگر مفرح ولطیف غذا کی کمک وقتاً فوقتاً نہ پہنچتی رہتی تو میں اس شدید گرمی میں مسلسل دماغی کام نہ کرسکتا تھا، اور اپنے اس اعلان پر پچھتانا پڑتا کہ میں دن بھر کچھ نہ کھاؤں گا، میری نوعمری، محنت کوشی، گرمیوں کا لمبا دن اور کام کی دھن کہ میں نے مغرب تک اپنا کام مکمل کرلیا، اور اگلے دن وہاں سے کامیاب آیا۔

اس وقت سے مولانا کی یہ بزرگانہ شفقت اور ان کا عالمانہ ذوق ہے کہ جب کبھی میرے کام کی کوئی چیز ان کی نظر سے گزرتی یا کوئی ایسی کتاب اور مضمون ملاحظہ فرماتے جو ان کے نزدیک میرے مطالعہ سے گزرنا چاہئے تو وہ کتاب یا مضمون کا تراشہ میرے پاس بھیج دیتے، جب میری دریاباد آمد کی خبر سنتے تو وہ تمام رسائل مضامین اور کتابیں مہیا فرمالیتے جن کے متعلق بات چیت کرنی یا جن کے متعلق واقف کرانا چاہتے، اس طریقہ سے وہ کسی پرچہ پر وہ تمام باتیں نوٹ فرمالیتے جن کے متعلق مجھ سے گفتگو کرنی ہے، اس لیے وہ پسند کرتے کہ ایسے عزیز مہمان کی آمد کی خبر کچھ دن پہلے سے ہوجائے، تاکہ اس سے اطمینان سے گفتگو کرنے کا وقت نکال لیں اور پہلے سے اس کی تیاری فرمالیں، بعض مرتبہ

ایسے عزیزوں سے گفتگو کرنے کے لیے ان کو کئی دن کام کی مقدار اور رفتار بڑھانے کی ضرورت ہوتی، تاکہ وہ تھوڑا سا وقت اس دن کے لیے خالی کرلیں، جس دن ایسے عزیز کو آنا ہے، اس لیے کہ مولانا کے یہاں صحیح معنی میں وقت "نپا تلا" رہتا، ہر وقت کے لیے ان کے پاس کام ہوتا، اس لیے محض لوازم مہمانداری اور گفتگو و مذاکرہ کے لیے جب ہی وقت نکل سکتا جب پہلے سے اس کی تیاری ہو جائے، اس کی وجہ سے ان کے وقت میں بڑی برکت اور ان کے کاموں میں نہ صرف تنوع بلکہ اس کی مقدار بھی اتنی ہوتی جو اچھے اچھے کام کرنے والوں کے یہاں نظر نہیں آتی، اس بارے میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، ان کے امام و پیشوا مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کو انھوں نے صرف دین ہی کا نہیں دنیا کا بھی حکیم مانا تھا، اور اس شعبہ میں اب تو تنہا وہی ان کے مقتدیٰ کامل نظر آتے تھے۔

مولانا کے اسلوب تحریر اور ادبی خصوصیات کے متعلق میرا کچھ کہنا تو بے ادبی اور جسارت ہے، مگر اتنا ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے طرز کے بانی اور خاتم ہیں، طنز نگاری، اسالیب بیان اور اوصاف ادب میں نازک ترین اور دشوار ترین صنف ہے، اس میں وہی ادیب، صاحب قلم کامیاب ہو سکتا ہے، جو صحیح معنی میں زبان کا ادا شناس اور مزاج داں ہو، بلکہ اہل زبان ہو کہ ذرا سی چوک، بے احتیاطی اور بے اعتدالی سے بلکہ بعض اوقات محاوروں کی چاٹ اور زبان کے چٹخارے میں طنز، ہجو، پھکڑ پن اور بے تمیزی کے حدود میں داخل ہو جاتا ہے، حد یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب جیسا مانا ہوا ادیب محاورات کے استعمال کے بڑے ہوئے شوق میں بعض اوقات موضوع کی ثقاہت اور مقصد کی متانت کو قائم نہ رکھ سکا اور ان مرحوم کو اس کی وجہ سے دوسروں کا ہدف ملامت اور بلا ضرورت اذیت کا بھی سامنا کرنا پڑا، قرآن مجید کے ترجمہ اور امہات الامۃ کی تعبیر و تحریر میں ان سے ایسی ہی فرو گزاشتیں ہوئیں، انھوں نے بعض ایسے محاورات کا استعمال کیا جن کے استعمال سے مہذب مجلسوں میں احتیاط برتی جاتی ہے، ذرا سی غفلت، بسیار گوئی، اور داستاں سرائی کے جوش میں آدمی کو خفت اٹھانی پڑتی ہے، ہمارے علم میں مولانا آزاد

جنھوں نے لکھنؤ کی ادبی مجلسوں کا لطف بھی اٹھایا تھا، اور زبان کے نوک پلک سے خوب واقف تھے، اس بارے میں بڑے محتاط تھے، مولانا عبدالماجد کی حس اس بارے میں ذکاوت حس تک پہنچی ہوئی ہے، اور زبان کے معاملہ میں ان پر گرفت مشکل ہے، بعض مرتبہ ان کا ایک فقرہ ایک شذرہ کا اور ایک شذرہ پوری کتاب کا کام کر جاتا ہے، اور کسی وقت ان کا ایک جملہ مخاطب یا ''مشارالیہ'' کے لیے ایسا بھاری پڑ جاتا ہے کہ اس کا رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اٹھانا بھی، بعض مرتبہ وہ کسی پرانے شاعر کے مصرعہ کو عنوان بنا کر پورا کام کر جاتے ہیں، اور وہ مصرعہ سب کچھ کہہ جاتا ہے، اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے، سب اس کی تشریح اور تفصیل، اس موقع پر ان کی ادبیات کے ذخیرہ پر وسیع نظر ان کے انتقال ذہنی اور ان کے حسن انتخاب کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے کہ وہ یہ مصرعہ کہاں سے لائے اور کس طرح اس کو نگینہ کی طرح انگوٹھی میں جڑ دیا۔

مولانا کی تمام ذوقی باتوں، ان کی تمام علمی تحقیقات، ان کے سارے خیالات سے کلی اتفاق نہ ہو، یہ نہ ہر پڑھنے لکھنے والے کے لیے ضروری ہے، نہ مولانا کی عظمت وشہرت کے پیش نظر ان کے لیے مفید، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے زمانہ کی نادرۂ روزگار اور صاحب کمال شخصیتوں میں سے تھے، ایک ادیب وصاحب قلم کی حیثیت سے بھی، قرآن کے ایک مفسر وخادم کے لحاظ سے بھی، قدیم وجدید کے ایک جامع عالم کے طور پر بھی، اور اپنے وقت اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہنچانے والے انسان کی حیثیت سے بھی ایک کہنہ مشق صحافی اور ایک صاحب طرز ناقد وطنز نگار کے بنا پر بھی وہ ہر طرح قابل قدر اور اعزاز کے مستحق ہیں، میں نے ان کے متعلق مدراس کی تعارفی تقریر میں کہا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ اس نسل کے لوگ اس پر فخر کریں گے کہ ہم نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو دیکھا تھا، اور ان کی باتیں سنی تھیں، اگر ہمارے ملک کی یونیورسٹیوں میں صحیح قدر شناسی اور صحیح معنوں میں بے تعصبی ہوتی تو ان کو متعدد یونیورسٹیوں کی طرف سے ادب، فلسفہ اور دینیات میں اعزازی ڈگریاں ڈاکٹریٹ کی بہت پہلے پیش

کی جاتیں، لیکن یہاں (چند مثالوں کو چھوڑ کر) یہ سب کام سیاسی اور انتظامی مصالح کی بنا پر ہوا کرتے ہیں، اور ان سے اکثر مفادات یا سیاسی فوائد وابستہ ہوتے ہیں، غنیمت ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنی خوش مذاقی وجوہر شناسی کا ثبوت دے کر ہندوستانی جامعات کے اس داغ کو دھودیا، مولانا کو مرکزی حکومت یا صوبائی حکومت کی طرف سے جو کچھ اعزاز واعتراف حاصل ہوا وہ خود ان کے لیے باعث اعزاز اور ان کے حسن مذاق اور حسن انتخاب کی دلیل ہے، مولانا کی عزت وعظمت میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوا کہ ؎

مادح خورشید مدّاح خود است

مولانا کے خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ میرے مرقع خطوط کی زینت ہے، شاید ان کا کوئی مختصر سے مختصر اور سرسری طور پر لکھا ہوا خط بھی ضائع نہیں ہوا، شمار کیا تو یہ خطوط تعداد میں ۵۳ نکلے، ان میں میرے علمی استفسارات کے جواب بھی ہیں، کسی نئی کتاب یا مضمون کے شائع ہونے کی اطلاع بھی ہے جس سے میرا واقف ہونا مولانا کے نزدیک ضروری تھا، میری حقیر تصنیفات یا مضامین پر اپنے تأثر یا تنقید کا اظہار بھی، اور کبھی کسی قدیم کتاب یا عربی تصنیف یا عرب مصنفین یا اہل قلم کے قلم سے نکلی ہوئی کسی نئی تحقیق کے متعلق استفسار بھی، تمام خطوط سے بزرگانہ شفقت، میری علمی ودینی ترقی کی خواہش، اور اس بارے میں بزرگانہ رہنمائی...... سطر سطر سے جھلکتی ہوتی، یہاں پر تبرکاً چند خطوط درج کیے جاتے ہیں، ان میں سب سے پہلا خط ۴؍جون ۱۹۴۲ء کا ہے، اسی سے آغاز کیا جاتا ہے۔

"اخبار صدق"

دریاباد ضلع بارہ بنکی

مورخہ ۴؍جون ۱۹۴۲ء

عزیزی سلمہ اللہ وعلیکم السلام

جوابی پوسٹ کارڈ کی خوب رہی، وہ کارڈ الگ کر کے رکھ لیا ہے، لکھنؤ ہی میں انشاء اللہ واپس ملے گا۔

ملاقات کو تو آنکھیں ترس گئیں، لکھنؤ میں ایک بار خود ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا معلوم ہوا کہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں، اور اس کے بعد سے آفتاب (۱) بھی برابر یہی کہتے رہتے ہیں کہ وطن گئے ہوئے ہیں۔

مقالہ مذکور کا زیر طبع نمبر خاص طور پر قابل توجہ ہوگا، انشاء اللہ "وَلٰكِنْ شُبِّـــهَ لَهُـمْ" کی تفسیر اسی میں ہے، حال میں ندوہ کی ایک ابتدائی درسی کتاب (۲) محض اتفاق سے نظر پڑ گئی، بڑا ہی دل دکھا، تصویروں کی وہ بھرمار کہ شاید عبارت بھی اتنی نہ ہو، سرِ ورق سے لے کر آخر تک جاندار مخلوق کی تصاویر سے رنگین، اللہ اور رسول کا شروع سے آخر تک نام نہیں، لغو قصے (قدیم جن و پری کے طرز کے) حیرت ہوگئی کہ ایسی کتاب اور سید صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں؟ خط دونوں صاحبوں کو لکھ دیا ہے "چو کفر از کعبہ برخیزد" الخ، مصری کتابیں تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی ہرگز ندوی طلبہ کے لیے مفید نہیں ہوسکتیں (Our This Wa) کے سلسلے کے مضامین اپنے رنگ میں اچھے اور بصیرت افروز ہیں، لیکن ہمارے آپ کے کام کی زیادہ نہیں، خالص سیاسی نقطۂ نظر ہے، اور اسد (۳) کی کتاب کا کیا کہنا، اس رنگ کی تو کوئی دوسری کتاب نہ ملے گی، البتہ پرانے لکھنے والوں میں Tolstoy اور Ruskin نے اچھی خاصی ہجو مغربی تہذیب کی کی ہے، گاندھی جی ان دونوں سے بہت متاثر ہیں، (خود گاندھی جی کی "انڈین ہوم رول" تو یقیناً نظر سے گزر چکی ہوگی) برطانیہ کے مشہور مفکر و ادیب Bertrand Russell کے یہاں اور امریکہ کے

---

(۱) حکیم عبدالقوی صاحب عرف آفتاب۔

(۲) اس سے مراد بچوں کے مصری مصنف کامل کیلانی کی کتاب "حکایات الاطفال" ہے، جس میں بچوں کی زبان و آسان عربی میں کتے، بلی اور بندر کے قصے ہیں، اسی کی جگہ لینے کے لیے مکتوب الیہ نے "قصص النبیین للاطفال"، لکھی، ممکن ہے کہ اس کی تالیف کے لیے مولانا کا یہ مکتوب گرامی محرک بنا ہو۔

(۳) محمد اسد صاحب سابق لیوپولڈ ویس کی کتاب "Islam at the Cross Roads"

مشہور صاحب قلم افسانہ نویس Uptan Sinclair کے افسانوں میں بھی خاصی تنقید مغربی تمدن و معاشرت پر ملے گی، خصوصاً آخر الذکر کا افسانہ They Call Me Carpenter تو پڑھنے کے قابل ہے، لکھنؤ پبلک لائبریری میں یہ سب کتابیں مل جائیں گی، لاہور کے پروفیسر ٹی کے دت کی تازہ کتاب "What English Education Has Made Ofus" بھی اچھی چیز ہے میرے پاس موجود ہے۔

والسلام

عبدالماجد

راقم سطور ۱۹۵۶ء میں دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر استاذ زائر Visiting Professor کی حیثیت سے دمشق گیا تھا، وہاں یونیورسٹی کے بعض پروفیسروں کی ایک مجلس میں حال میں شائع ہونے والی ایک اطالوی بیرسٹر کی کتاب کے انگریزی ترجمہ کا ذکر ہوا جو ٹرائل آف جیسس (مقدمہ مسیحؑ) کے نام سے شائع ہوئی تھی، اور اس سے قرآن مجید "ولکن شبه لهم" کی ایسی تصدیق و تفسیر ہوئی تھی کہ آدمی محو حیرت ہو جائے، میں نے یہ کتاب مولانا کے یہاں دیکھی تھی، ان فضلاء نے اس کے عربی میں ترجمہ کی خواہش ظاہر کی، میں نے مولانا سے اس کے بھیجنے کی درخواست کی، میں نے اپنے عریضہ میں دمشق میں قیام کے بعض تأثرات بھی لکھے تھے، مولانا نے اس خط کے جواب میں جو شفقت نامہ لکھا، وہ درج کیا جاتا ہے، اس خط سے مولانا کے تحقیقی ذوق اور تفسیری نوٹ کے سلسلہ میں ان کے اہتمام کا اندازہ ہوتا ہے۔

بسم اللہ

دریاباد، سہ شنبہ

۲۲ رمئی ۱۹۵۶ء۔ ۱۰ رشوال ۱۳۷۰ھ

برادر عزیز سلمۂ اللہ و علیکم السلام ورحمۃ اللہ

کل شام کو خیریت نامہ خوب ہی ملا، بڑا اشتیاق وانتظار تھا، گویا عید دوبارہ ہوگئی، خود خط لکھنے کا ارادہ کئی دن سے کر رہا تھا، بس ٹلتا ہی رہا۔

صدق کے کام کی چیزیں بھی بہت کچھ اسی میں مل گئیں انشاء اللہ گنجائش نکلتے ہی نکل جائیں گی۔

اپنی تفسیر کے بعض اجزاء کا عربی میں منتقل کرانے کا جی خود ہی چاہ رہا تھا، ایک زمانہ میں نظر مولانا مسعود عالم مرحوم پر رہتی تھی، اب اگر ذریعہ ہوسکتا ہے، تو ان عزیز ہی کا، مولوی عبداللہ عباس سلّمہٗ، یا محمد رابع سلّمہٗ یا اور جو عزیز اس کے لیے مناسب سمجھے جائیں۔

صدق کے پرچوں کے لیے اسی وقت لکھنؤ لکھے دیتا ہوں، کل ہی انشاء اللہ وہاں سے ہوائی ڈاک سے روانہ ہوجائیں گے، شرمندہ ہوں کہ پہلے سے اس کا خیال ہی نہ آیا Trail of Jesus بھی انشاء اللہ دو ایک روز بعد روانہ کراسکوں گا، کیا فلسطین خصوصاً بیت المقدس تک ہوآنے کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟ اگر یہ ممکن ہوتا تو ممکن تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے سلسلہ میں جغرافیائی وتاریخی دونوں قسم کے معلومات کچھ اور حاصل ہوجاتے۔

بہرحال دمشق میں بھی کچھ واقفیت تو یہودیوں، نصرانیوں اور ان کے مختلف فرقوں کے متعلق تو حاصل ہی ہوسکتی ہے، قرآن مجید کے پیش نظر تو سب سے بڑھ کر شامی ہی مسیحیت تھی، علماء شام یا خود مسیحیوں اور یہودیوں نے ان مباحث پر اگر عربی انگریزی میں لکھا ہو تو ان کتابوں کا آرڈر میری طرف سے بے تکلف دے دیجیے، انشاء اللہ قیمت یہاں سے فوراً روانہ کردوں گا۔

حکومت شام کے محکمۂ آثار قدیمہ کے مطبوعات میں بھی تاریخ انبیاء کے سلسلہ میں کچھ کام کی چیزیں مل سکتی ہیں، واپسی مع الخیر انشاء اللہ کب

تک ہوگی؟

والسلام

دعا گو ودعا خواہ۔ عبدالماجد

جنوری ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام بین الاقوامی پیمانہ پر ایک اسلامک کلوکیم ہوا تھا، مدعو میں بھی تھا، لیکن جا نہیں سکا، مولانا نے ۷/جنوری ۱۹۵۸ء کو لاہور سے جو خط لکھا، وہ درج ذیل ہے۔

بسم اللہ

نائیڈوز ہوٹل لاہور

۷/جنوری ۱۹۵۸ء

برادرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا کہوں کہ آپ کے نہ آنے کا یہاں پہنچ کر اور یہاں کا رنگ دیکھ کر کس درجہ افسوس مجھے ہو رہا ہے، بہترین زمین یہاں آپ کے لیے تیار تھی، وہاں کا کام دوسرے حضرات کر سکتے تھے، مگر یہاں کے لیے بجز آپ کے اور کوئی ہندوستانی میری نظر میں نہیں۔

مصر، شام، حجاز، عراق، ایران، افغانستان، ترکی، سوڈان وغیرہ کے نمائندوں کی اکثریت بہت ہی اچھی ہے، یعنی خوب پڑھے لکھے اور ساتھ ہی پختہ دیندار، مستشرقین بھی اچھے اچھے جمع ہو گئے تھے، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، امریکہ، جرمنی سب کہیں کے، میں ایک تو طبعی طور پر شرمیلا اور اَگلا کھرا پھر بڑا سوال عربی میں گفتگو کا، صرف ہٹی اور اسمتھ اور ڈریوز (ہالینڈ) سے چند منٹ انگریزی میں بات کر سکا، اور ہاں عبدالوہاب عزام سے کچھ دیر اردو میں، عبدالحمید خطیب اور ایک اور عرب سے سرسری گفتگو رہی، ایک پاکستانی صاحب ترجمانی کا کام کرنے گئے، لیکن بہرحال سبھی گفتگوئیں بالکل رسمی اور سرسری ہی رہیں۔

اس خط کے پہنچنے سے پہلے ہی انشاء اللہ لکھنؤ پہنچ جاؤں گا اور ایک مختصر قیام کے بعد دریاباد۔

اگلے ہی ہفتہ مدراس یونیورسٹی کی دعوت پر مدراس روانہ ہو جانا ہے "سیرت نبوی قرآن مجید سے" پر ۶ لکچر دینے ہیں اس وقت تک ۴ ہی لکچر تیار ہو پائے ہیں، اللہ ہی عزت آبرو رکھ لے۔

یہاں کی بے اعتدالیوں نے شدید نزلہ میں مبتلا کر دیا ہے، رات کو ایک مصری مندوب ڈاکٹر عبداللہ دراز چند گھنٹوں کے اندر انتقال کر گئے، جنازہ مصر گیا۔ انا للہ......

والسلام

دعا گو عبدالماجد

اشخاص اور جماعتوں کے بارے میں مولانا کا ذہن بہت وسیع واقع ہوا تھا، جہاں کام کی بات دیکھتے خوش ہوتے، اور قبول فرماتے، مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی اپنے زمانہ کے ایک ایسے عارف و حکیم بزرگ تھے، جن کے کمالات پر ان کی تواضع وخاکساری اور اخفاء وعزلت پسندی نے پردے ڈال رکھے تھے، مجھے ان کی مجالس کے ارشادات وملفوظات مرتب وجمع کرنے کا خیال آیا اور وہ رسالہ "الفرقان" میں بالاقساط شائع ہونے لگے تو مولانا نے ان کو پڑھ کر حسب ذیل خط لکھا۔

صدق جدید ہفتہ وار

دریاباد ضلع بارہ بنکی

۷رجولائی ۱۹۶۷ء

برادرم السلام علیکم

یہ حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب کو آپ نے خوب ڈھونڈ نکالا، ماشاء اللہ ایک گوہر بے بہا ہیں، برابر ان کے ملفوظات سے مستفید ہو رہا ہوں، اپنے حضرت تھانوی سے اتنا اقرب اور اشبہ ہوتے کسی کو نہیں پایا، ان کے

بیشتر خلفاء کو بھی۔ ذلك فضل الله...... الخ

اب تو بھوپال جا کر ان کی زیارت کی تمنا دل میں جاگ اٹھی، یہ کارڈ محض آپ کی شکر گزاری اور مبارک باد کے لیے۔

والسلام

دعا گو عبد الماجد

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب مولانا کا پہلا مکتوب دیا گیا تو ان کا آخری مکتوب بھی پیش کر دیا جائے، جس کے بعد غالباً میرے نام کوئی مکتوب لکھنے کی نوبت نہیں آئی، میں افغانستان، ایران اور ممالک عربیہ کے دورے پر نکل گیا اور چند مہینوں کے بعد مولانا پر فالج کا حملہ ہوا، اس مکتوب سے مولانا کے بعض دلی جذبات اور زندگی کے بعض حالات پر نظر پڑتی ہے، اس لیے بھی اہم اور ضروری ہے، مکتوب حسب ذیل ہے۔

بسم اللہ

دریاباد، ۲۲/اپریل ۱۹۷۱ء

برادرم السلام علیکم

خدا معلوم کیوں اور کیسے بہر حال دل میں ایک تمنا سالہا سال سے بسی ہوئی ہے، اپنے وقت موعود کا جب بھی خیال آتا، اسے تو عرفہ ذی الحجہ کے لیے کہ جب ہزاروں لاکھوں بندے سر برہنہ سجدوں میں پڑے ہوں، اور سب کی زبان پر لبیک جاری ہو، اس کے چند روز بعد جب لکھنؤ کے عوام اجتماع تبلیغ میں بعد ظہر کے ملے تو اس وقت اس مجمع نقل عرفات کو دیکھ کر یہی تمنا دل پر غالب تھی کہ کاش اپنا وقت موعود یہی ہوتا، بے شمار اہل اللہ دعائے جنازہ پڑھ لیتے اور عجب نہیں کہ امامت آپ ہی کے حصہ میں آتی، دنیا کے عمر بھر کے عزیزانہ و برادرانہ تعلقات کا بہترین انجام۔

ہلکی سی ایسی ہی تمنا مسلمانوں کے ہر بڑے مجمع کو دیکھ کر پیدا ہوتی رہتی ہے۔

حال میں "Marshall Lang's Guide to Eastern Literature" دیکھنے میں آئی، عربی لٹریچر پر مقالہ (......(۱)......) کے قلم سے ہے جی میں آیا کہ آپ کی نظر سے بھی گزر جائے، اردو والا مقالہ Russel کے قلم سے اچھا خاصا ہے۔

کتاب لکھنؤ کے برٹش کونسل لائبریری (حضرت گنج) میں ہے، اس کے ممبر ۱۰؍روپیے سالانہ دے کر ہوجایئے یا محمد میاں (۲) یا مولوی رابع (۳) کو کرا دیجئے کام کی خاصی کتابیں ملتی رہیں گی۔

ترجمہ قرآن کے سلسلہ میں نئی نئی صورتیں ذہن میں آتی رہتی ہیں، دو بغرض اطلاع عرض ہیں۔

قَلِيْلاً مَّايُؤْمِنُوْنَ — ''یہ ایمان کچھ یوں ہی سا رکھتے ہیں''

وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ — ''نوجوانان سدا جوان''

ماہر القادری (فاران والے) میرے خصوصی مخلصوں میں تھے، ایک معاملہ میں مجھے ان سے شکایت پیدا ہوگئی اور برسوں ہو گئے کہ ان سے سارے تعلقات منقطع کر لئے، اب حال میں انھوں نے ایک ایسا مضمون لکھ دیا کہ اس کے بعد سات خون بھی ان کے معاف ہو سکتے ہیں، یعنی جوش کی کتاب خرافات (۱) پر دل لگا کر ایک تبصرہ ۲۵، ۳۰ صفحے کا لکھ دیا، پڑھ کر پھڑک گیا، ایک مکی نے مکہ معظّمہ سے وہ فاران مجھے بھیج دیا ہے، اب یہ کر رہا ہوں کہ انشاء اللہ پورا مضمون ۱۲، ۱۳ نمبروں میں صدق میں نقل کر دوں گا، جا بجا حاشیہ اپنی طرف سے بڑھا دوں گا، عنوان رکھ رہا ہوں ''ایک زیلیے کی خود گزشت''

''ہندوستان اسلامی عہد میں'' (۲) اچھی پہنچی، سبحان اللہ وماشاء اللہ

---

(۱) نام پڑھا نہ جاسکا۔ (۲) مولوی محمد الحسنی مرحوم مکتوب الیہ کے برادرزادہ۔ (۳) مولوی محمد رابع حسنی ندوی مکتوب الیہ کے خواہرزادہ (۴) جوش صاحب کی کتاب ''یادوں کی برات'' جو اسی زمانہ میں پاکستان سے شائع ہوئی تھی۔ (۵) والد ماجد مولانا سید عبدالحی صاحبؒ کی کتاب ''الہند فی العہد الاسلامی'' کا اردو ترجمہ جو ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ'' سے شائع ہوا تھا۔

باوجود مختصر ہونے کے بڑے کام کی نکلی، متعدد باتیں بالکل نئی خود مجھ کو ملیں۔

حاجی عبدالقیوم دریابادی کلکتہ کے مشہور ہوٹل والے ہیں، جلسہ دارالمصنفین کے لیے شاہ صاحب کی تحریک پر انھیں ڈرتے ڈرتے لکھا تھا، آدمی بڑے مخلص ودیندار ہیں، لیکن دارالمصنفین کی علمی سطح کے نہیں، پرسوں جواب آیا، مایوس کن نہیں خاصا امید افزا ہے، مفصل اور قطعی جواب بعد کو دینے کو لکھا ہے۔

ہاں صاحب ایک میرے عزیز عثمانیہ کے گریجویٹ اور میاں غوثو کے سوتیلے بھائی حیدرآباد میں رہتے ہیں، اور تنگی معاش سے سخت پریشان، آپ کے ذریعہ سے نواب منتخم جاہ سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں (بسلسلۂ ملازمت) انھیں خبر یہی پہنچی ہے کہ آپ سے اور نواب صاحب سے خصوصی روابط ہیں، میرے خیال میں یہ خبر بہت مبالغہ آمیز ہے، اس لیے میں نے انھیں کچھ امید نہیں دلائی ہے، لیکن اگر اس کی کچھ بنیاد ہے تو پھر میں تفصیلات آپ کو لکھ بھیجوں، میں نے یہی لکھ دیا ہے کہ "اگر کچھ بنیاد ہوگی تو ڈاکٹر عبدالمنان کے واسطہ سے ہوگی تم ان ہی ڈاکٹر صاحب کو گھیرو"۔

والسلام

دعا گو ودعا خواہ عبدالماجد

مولانا کی خصوصیات وکمالات میں سب سے بڑا جوہر ان کی اسلامی حمیت تھی، ذات نبویؐ، اسلام، شریعت اسلامی کے لیے کوئی توہین آمیز مضمون، رسالہ یا کتاب، یا فلم یوروپ وایشیا میں کہیں نکلتی یا کوئی گستاخ وبے ادب کوئی تصویر شائع کر دیتا تو سب سے پہلے مولانا صدق میں اس کا نوٹس لیتے، اس وقت ان کا خامۂ گوہر بار، شمشیر جوہر دار بن جاتا، وہ اس کا سلسلہ جاری رکھتے یہاں تک کہ خود ناشر کی طرف سے معذرت یا تلافی کی کوشش ہوتی یا اس کے خلاف اسلامی حلقوں میں عمومی احتجاج ہوتا، اس بارے میں ان کی عقابی نگاہ سے کم کوئی چیز پوشیدہ رہ پاتی، اسی دینی حمیت نے ان کو انکار حدیث کے فتنہ کے

موقع پر نیاز فتحپوری، اور خدا رسول اور مذہب کے خلاف دریدہ وہنی سے بیتاب ہوکر جوش ملیح آبادی اور یگانہ چنگیزی کے مقابلہ میں صف آرا کر دیا اور انھوں نے ''صدق'' کو عرصہ تک ان کی تردید اور ان کے خلاف مضامین کی اشاعت کے لیے وقف کر دیا، وہ چونکہ رسمی واصطلاحی طور سے کسی مدرسہ کے عالم ومدرس نہ تھے، بلکہ اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ، صاحب طرز ادیب وانشاء پرداز، فلسفہ ونفسیات کے فاضل، اور مغرب اور اہل مغرب سے (مذہب کا مذاق اڑانے والوں سے زیادہ) واقف تھے، اس لیے ان کی تحریروں کو ''ملائے مذہبی'' کا طعنہ دے کر یا ''شعر من بمدرسہ کے بُرد'' ؟ کا فقرہ چست کر کے ٹالا نہیں جاسکتا تھا، اس بارے میں مولانا کی ذکاوتِ حس اتنی تیز تھی کہ کسی شاعر کے کلام یا کسی ادیب کے مضمون میں مذہب وشریعت کی توہین، یا طنز واستہزاء کا کوئی جملہ دیکھ لیتے تو فوراً اس کا نوٹس لیتے اور اس پر متنبہ فرماتے، مولانا کی مغفرت ومقبولیت کے لیے شاید یہی دینی حمیت کافی ہوجائے جو ہزار عبادت وتسبیح سے زیادہ خدا کے یہاں وزن رکھتی ہے۔

مولانا اگرچہ فلسفہ ونفسیات کے ماہر تھے، وہ ان کا عالمانہ تحلیل وتجزیہ کر چکے تھے، اور ان پر فاضلانہ وناقدانہ لکھ چکے تھے، لیکن ان پر اچھی خاصی جذباتیت غالب تھی، رجائیت کا پہلو ہمیشہ قنوطیت پر غالب رہا، بعض مشاہیر وعظماء کے بارے میں جن کی زندگی ملی واجتماعی نقطۂ نظر سے قابل تنقید یا قابل اعتراض ہوتی، ان کا کوئی ایسا فعل یا واقعہ جس سے نیک شگون لیا جاسکتا تھا، ان کے مدح واعتراف کے لیے کافی تھا، اور وہ ان کی وجہ سے ان کی تمام غلطیوں سے صرف نظر کر لیتے، مثلاً ان کا جمعہ کے دن انتقال کرنا یا کسی ایسے ہی مبارک ومقبول ساعت میں راقم سطور کو مولانا کی اس قوت ایمانی اور دین کی قدر دانی پر ہمیشہ رشک آتا رہا، لیکن وہ اس کی تقلید نہ کر سکا۔

مولانا سن وسال اور علم وفضل میں مجھ سے بڑے تھے، جب سے ہوش سنبھالا اپنے کو خورد اور ان کو بزرگ پایا، عمر وعلم میں اس تفاوت کے باوجود کبھی کبھی اپنے حدود سے تجاوز کر جاتا اور بعض ایسے مسائل میں دخل در معقولات کرتا جن کے بارے میں مولانا

بڑے حساس واقع ہوئے تھے، دو ایسے معاملوں میں دخل دیا جس میں مولانا کو اپنے بعض خوردسال معاصرین اور عزیزوں سے شکایت پیدا ہوگئی تھی، اور وہ رنجش اور کسی قدر مقاطعہ کی حد تک پہنچ گئی تھی، مولانا کا یہ بڑا ایثار اور بزرگانہ شفقت تھی کہ میری بات مان لی اور نزاع کا خاتمہ ہوگیا، ایک مرتبہ ایک نامور معاصر کے مسئلہ میں جن پر مولانا کا قلم کئی بار سخت تنقید کر چکا تھا، اپنے موقف کو نرم کرنے اور ایک بار قادیانیت اور قادیانیوں کے بارے میں اپنے نرم اور روادارانہ موقف پر نظر ثانی کا مشورہ دینے کی جسارت کی اور اس سلسلہ میں کچھ خط وکتابت ہوئی، مولانا نے اس سے اتفاق نہیں کیا، اور یہ بات ہم سب نیازمندوں کو معلوم تھی کہ مولانا جب کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں، تو اس کو آسانی سے ترک نہیں فرماتے اور اکثر اوقات مداخلت یا مشورہ اس میں اور پختگی یا شدت پیدا کر دیتا ہے، لیکن اس پر اپنی آزردگی کا اظہار بھی نہیں فرمایا اور اس سے ان کی شفقت ومحبت میں کوئی فرق نہیں پڑا، خط وکتابت، ملاقات تعلقات کسی چیز سے اس کا اظہار نہیں ہوتا تھا کہ اس جرأت بیجا سے ان کو کوئی گرانی یا کبیدگی ہوئی ہے، مولانا نے عقیدت، تعلق، تنقید وتبصرہ سب ہی کے حدود مقرر کر رکھے تھے، اپنے بزرگوں کے ساتھ خود ان کا یہی معاملہ تھا، اور اپنے خوردوں کو بھی اس کی اجازت دیتے تھے۔

مولانا کے ساتھ مجھے کسی طویل سفر اور رفاقت کا اتفاق نہیں ہوا لیکن دارالمصنفین کی کمیٹیوں میں شرکت کے لیے اعظم گڑھ کے سفر میں اکثر رفاقت ہوئی، مولانا بھی اس کو پسند کرتے اور اہتمام فرماتے تھے کہ جاتے اور آتے ہوئے ساتھ ہو، کبھی لکھنؤ سے معیت کا شرف حاصل ہوتا، کبھی دریاباد سے مولانا کی معیت حاصل ہو جاتی، سفر بڑے لطف سے طے ہوتا، فراغت کی یکجائی، مسافروں کی اجنبیت کی وجہ سے خلوت اور انجمن کا لطف، یہ بات دریاباد، لکھنؤ میں بھی مشکل سے نصیب ہوتی، تین بار رائے بریلی میں غریب خانہ پر بھی تشریف لائے، ایک بار بھائی صاحب (ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء) مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے اور دو بار میرا حقیر کتب خانہ دیکھنے

اور حقیقتاً اپنے تعلق اور شفقت کے اظہار کے لیے، مدراس کے سفر میں معیت تو نہیں ہوئی لیکن داعی و میزبان ٹی عبدالواحد صاحب کے دولت خانہ واقع مدراس میں ایک ہی جگہ قیام رہا، مولانا مسافرانہ قیام میں بھی اپنے معمولات کے پابند اور مطالعہ میں مشغول رہتے تھے۔

۱۴؍مارچ ۷۴ء ۱۹ کو فالج کے حملہ کی وجہ سے مولانا بہت افسردہ و مضمحل رہنے لگے تھے، سب سے بڑا مجاہدہ علمی و تحریری کاموں بالخصوص قرآن مجید کی خدمت کا اضطراری التوا تھا، جو مولانا کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، اور جوان کی روح کی غذا اور دوا تھی، لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں خاتون منزل حاضر ہوتا، اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا آتا، مولانا جیسے مشغول اور فعال آدمی کو معذور و فارغ دیکھ کر دل پر چوٹ لگتی اور دنیا کی بے ثباتی اور عمر و صحت کی بے وفائی کا نقش دل پر قائم ہوتا، گفتگو میں بھی دقّت اور رکاوٹ محسوس ہوتی، رقت بہت بڑھ گئی تھی، تحریر اگر بمشکل چند سطروں کی ہوتی تو اس کا پڑھنا دشوار تھا، اسی دوران میں کہ بیماری کا سلسلہ چل رہا تھا کہ اکتوبر ۷۶ء ۱۹ میں گر جانے سے ایک نئی معذوری اور بیماری کا اضافہ ہوا، لیکن اس سے جلد سنبھل گئے، حجاز کے ایک سفر سے واپسی ہوئی چونکہ علالت کا سلسلہ ایک عرصہ دراز سے چل رہا تھا، اور لکھنؤ پہنچنے کے بعد ہی مجھے رائے بریلی آنا پڑا نیت یہ تھی کہ اب لکھنؤ واپسی ہوگی تو فوراً مولانا کی خدمت میں حاضری دی جائے گی، لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا، ۷؍جنوری ۷۷ء ۱۹ کو اپنے وطن رائے بریلی میں اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا کہ لکھنؤ سے ٹیلیفون کے ذریعہ وفات کی اطلاع ملی، اور یہ کہ نماز جنازہ بعد ظہر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوگی اور مولانا کی وصیت کے مطابق مجھے نماز پڑھانی ہوگی، یہ سب آناً فاناً ہوگیا، لکھنؤ پہنچ کر یہ آخری خدمت انجام دینی پڑی، بعض مجبوریوں کی بنا پر جنازہ کے ساتھ دریاباد جانا نہیں ہوسکا، معلوم ہوا کہ دریاباد میں بھی نماز جنازہ میں ہزاروں کی تعداد تھی، دیکھنے میں آیا ہے کہ بڑی بڑی شخصیتوں کے ساتھ اہل وطن کو کوئی خاص لگاؤ اور عقیدت نہیں ہوتی، بلکہ اکثر ہمسائیگی، ہم وطنی، معاصرت اور قربت حجاب بن جاتی ہے، لیکن مولانا کا معاملہ دوسرا تھا، اہل دریاباد نے اور اس کے قرب وجوار کے رہنے والوں نے مولانا کے

ساتھ اپنی عقیدت ومحبت کا پورے جوش وخروش کے ساتھ اظہار کیا، واقعہ یہ بھی تھا کہ دریاباد کو مولانا ہی کے دم سے عزت وشہرت حاصل ہوئی تھی، لیکن یہ بات تنہا کافی نہیں، اس میں مولانا کی مقبولیت، ان کی یکسوئی اور ان کے اصول زندگی کو بھی بہت دخل تھا، جن کی عمر بھر انھوں نے پابندی کی، اپنے جدامجد مخدوم آبکش (جن کا مزار مبارک مولانا کی قیام گاہ کے زیر دیوار تھا، اور مولانا اس معنی میں اپنے کو ان کا صحیح مجاور کہتے تھے) کے پہلو میں دفن ہوئے، مجمع کی کثرت کی وجہ سے دیوار ہٹادی گئی اور ہزاروں سوگواروں نے جنازہ کا ندھا دے کر اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچایا، بعض ایسے آثار قبولیت بھی ظاہر ہوئے جو خدمت قرآن کا صلہ ہے، ارادہ اور وعدہ کے باوجود قبر پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت عرصہ دراز تک حاصل نہ ہوسکی، ۲۹ رستمبر ۱۹۷۸ء یوم جمعہ کو محب مکرم حکیم عبدالقوی صاحب کی معیت میں جب دریاباد حاضری ہوئی اور مولانا کے قیام گاہ پر جانا ہوا تو زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا، یہاں مولانا مطالعہ فرماتے، تصنیف وتالیف کے کام میں مشغول رہتے، یہ عام مجلس کی جگہ ہے، یہ مہمان خانہ تھا، غرض ع

بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

□□□

پروفیسر رشید احمد صدیقی

رشید احمد صاحب کا نام ایک طنز نگار و مزاحیہ نویس ادیب کی حیثیت سے عرصہ سے کان میں پڑا تھا، ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''خنداں'' پر نظر بھی پڑی تھی، اور متفرق مضامین رسالوں میں بھی دیکھے تھے، جونپور اور علی گڑھ سے چونکہ قدیم تعلقات تھے، اور ایک سے رشید صاحب کا وطنی اور دوسرے سے ذہنی و علمی تعلق تھا، اس لیے ان کا تذکرہ جونپور و علی گڑھ کے احباب و اعزہ سے سننے میں آتا رہتا تھا، رشید صاحب کے مزاحیہ مضامین میں چونکہ علمی و تاریخی تلمیحات بکثرت ہوتی ہیں، اور جب تک پڑھنے والا انگریزی ادب، یونانی فلسفہ اور ادبیات و ضمیمات سے واقف نہ ہو، ان کا پورا لطف نہیں لے سکتا، پھر وہ اردو کے نئے نئے جملے تراشتے اور بعض فقروں اور محاوروں کو جو ہلکے پھلکے ادب میں عام طور پر استعمال نہیں ہوتے بڑی خوبی سے استعمال کر جاتے ہیں، اس لیے جب تک مطالعہ وسیع اور پختہ نہ ہو ان کی تحریروں کا پایہ پورے طور سے سمجھ میں نہیں آ سکتا، اس لیے اس کو جس چیز پر بھی محمول کیجیے کہ عمر کے اس مرحلہ میں رشید صاحب سے زیادہ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی، اور احمد شاہ پطرس بخاری کے مضامین تفریح طبع کا زیادہ سامان بنے، جب رشید صاحب کی کتاب ''گنجہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' پڑھی تو رشید صاحب کے ادب، ان کی انشاء پردازی، معاصرین کی تصویر کشی، انسانی نفسیات سے گہری واقفیت، شخصیت کی کلید دریافت کر لینے کی قابلیت اور قلم کی بے جان تصویروں میں جان ڈال دینے کی صلاحیت کا لوہا ماننا پڑا، کسی کسی وقت تو یہ احساس ہوتا تھا کہ ان کی اِن دو کتابوں کو ترقی یافتہ مغربی زبانوں میں شخصیات پر بہترین کتابوں میں رکھا جا سکتا

ہے، اور وہ ان سے آنکھیں ملاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ادبیات کی تاریخ کا یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ ایک ادیب ادب کے ایک خاص شعبہ میں بڑا نام پیدا کر لیتا ہے، اور وہ خود بھی اس کو اپنی متاع حیات سمجھتا ہے، اور لوگ بھی اس کو اسی شعبہ کا امام مان لیتے ہیں، لیکن دراصل اس کو دوسرے شعبہ میں امتیاز حاصل ہوتا ہے، اور کچھ زمانہ گزر جانے کے بعد اسی شعبہ میں اس کی انفرادیت یا برتری تسلیم کی جاتی ہے، اور وہی اس کے قبول عام اور بقائے دوام کا سبب بن جاتا ہے، مرزا غالب کو ساری عمر اپنی فارسی شاعری پر ناز رہا، لیکن ان کی شہرت ومقبولیت کا ذریعہ ان کی وہ اردو شاعری ہے، جس کے بارے میں ان کو اپنے بعض نامور معاصرین کے طعنے بھی سننے پڑے، انگشت نمائی بھی ہوئی اور مشورے بھی دیئے گئے، میرا خیال ہے کہ رشید صاحب کا معاملہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، ان کی شہرت وامتیاز ایک طنز نگار کی حیثیت سے تھا، لیکن ان کے مضامین جو انھوں نے معاصر شخصیتوں پر لکھے ہیں، ان کے ادب وانشا کا اعلیٰ نمونہ ہیں، اور اردو زبان کا قیمتی سرمایہ۔

۱۹۳۶ء میں جب پہلی مرتبہ علی گڑھ جانا ہوا اور تقریباً دو ہفتے یونیورسٹی کے حدود (Campus) ہی میں قیام رہا تو جہاں تک یاد آتا ہے، پہلی مرتبہ رشید صاحب کو ان کے ہم وطن بزرگ مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دولت خانہ پر دیکھا جہاں یونیورسٹی کے بڑے درجہ کے اساتذہ اور پروفیسر صاحبان اکثر تشریف لایا کرتے، رشید صاحب کا مولانا سے تو جونپور کا بھی تعلق تھا، میں اس زمانہ میں مولانا سید سلیمان اشرف صاحب صدر شعبۂ دینیات کی مجلس میں پابندی سے جایا کرتا تھا، اب نہیں کہہ سکتا کہ رشید صاحب کو پہلی مرتبہ وہاں دیکھا، مولانا ابوبکر صاحب کے یہاں، لیکن اس زمانہ کی کوئی بات رشید صاحب کے متعلق یاد نہیں، ہم دونوں کی لائنیں کچھ ایسی الگ تھیں کہ عرصۂ دراز تک کہیں آمنا سامنا (Cross) نہ ہوا، یہ اتفاقی آمنا سامنا اس وقت ہوا جب میں نے بھی تصنیف وتالیف کے کوچہ میں قدم رکھا اور میری بھی بعض

کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں، رشید صاحب اگرچہ اردو ادب کے کہن سال استاد و نقاد تھے، لیکن وہ ہر طرح کی چیزیں پڑھتے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی جو یونیورسٹی کورٹ کے بھی ممبر تھے، اور اکسپرٹ کی حیثیت سے بھی سلیکشن کمیٹیوں میں ان کو بار بار جانا ہوا تھا، التزاماً رشید صاحب کے یہاں ٹھہرتے، اس طرح دار المصنفین اور ندوہ سے ان کی رسم و راہ پرانی تھی، اسلام اور اسلامیات سے ان کو ہمیشہ دلچسپی رہی، ان کے یہاں ساری ادبی شوخیوں اور تنقیدوں کے ساتھ مذہب و اہل مذہب کا احترام ہمیشہ رہا، خاندانی اور وطنی طور پر ان کا خمیر جس خاک سے اٹھا تھا، اس میں نہ صرف مذہبی روایات بلکہ مذہبی جذبات بھی شامل تھے، جونپور قدیم زمانہ سے علمی و دینی شہر رہا ہے، آخر زمانہ میں وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح و جہاد کا ایک عظیم مرکز بن گیا تھا، جہاں ان کے دو جلیل القدر خلفاء مولانا سخاوت علی صاحب اور مولانا کرامت علی صاحب موجود تھے، مذہب کے احترام کے ساتھ شرافت نفس رشید صاحب کے گھٹی میں پڑی تھی، مجھے یہ جرأت نہیں ہوئی کہ کوئی تصنیف ان کے پاس بھیجوں، میرے ان کی مراسلت اور تعلقات کی تقریب یہ ہوئی کہ یونیورسٹی کے کسی طالب علم نے جو لکھنؤ سے گئے تھے، رشید صاحب کو میری اس وقت کی ایک تازہ تصنیف ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر'' پڑھنے کو دی، اس کو پڑھ کر رشید صاحب نے مجھے پہلا خط لکھا، کتابیں بہت سے لوگ پڑھتے ہیں، اور پسند بھی کرتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے گویا رشید صاحب اپنے اس نیاز مند کو جو سن و سال اور علم و فضل میں ہر طرح ان کا خورد تھا، یاد کرنے کے لیے بہانہ ڈھونڈھ رہے تھے، یہ خط ۱۱/ مارچ ۱۹۵۵ء کا لکھا ہوا ہے، آپ بھی اس کو پڑھتے چلئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محترمی، آداب نیاز، وسلام مسنون

آپ کی گراں مایہ تصنیف ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر'' ایک عزیز طالب علم نے آج لا کر دی، آپ کے اس کرم کا شکریہ۔

چند دن ہوئے ''فاران'' کے صفحات میں اس تصنیف کا ذکر نظر سے گزرا تھا، اور اشتیاق تھا کہ کسی طرح پوری کتاب پڑھنے کا موقع ملے، اب میں اطمینان سے پڑھوں گا اور جو کچھ سمجھ میں آئے گا عرض کروں گا، اتنا ابھی سے عرض کر دیتا ہوں کہ سید سلیمان صاحب مرحوم کی تصانیف کے بعد آپ کی اس کتاب پر پہلی مرتبہ نظر پڑی جو میری نظر میں اردو کی مذہبی اور علمی تصانیف میں اعلیٰ پایہ رکھتی ہے۔

خدا آپ کو خوش اور تندرست رکھے۔ آمین

اس وقت بڑی عجلت میں ہوں، اس لیے اس رواروی کی تحریر کی معافی چاہتا ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

رشید صاحب سے مراسلت کا اصل سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب میں نے ان کو خود ''تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی'' بھیجا، یہ تذکرہ میں نے ان کے ممدوح ومحبوب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو بھی بھیجا تھا، اور عجیب بات ہے کہ دونوں کے تاثرات ایک ہی طرح کے آئے، ذاکر صاحب کا خط تو ان کے تذکرہ میں دیکھا جا سکتا ہے، رشید صاحب کا خط یہاں نقل کیا جاتا ہے، اس خط میں ان کے انداز تحریر کی جھلک بھی زیادہ روشن ہے، وہ لکھتے ہیں۔

ذکاء اللہ روڈ، یونیورسٹی علی گڑھ

۲۵ رنومبر ۱۹۵۸ء

محترمی سلام مسنون

آپ کا گراں قدر عطیہ ''تذکرہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ'' موصول ہوا، عزت افزائی کا شکر گزار ہوں، اس عطیہ کی یوں اور خوشی ہوئی کہ والد مرحوم بھی حضرت سے بیعت تھے، اور اس احتیاط واحترام سے نام لیا کرتے تھے کہ گویا کوئی بہت بڑی ذمہ داری تھی، جس

سے عہد برآ ہونا ان کے لیے آسان نہ تھا، کتاب بڑی اچھی اور ستھری شائع ہوئی ہے، اتنی اچھی اور ستھری جیسے اس پر حضرت کا سایہ پڑ رہا ہو، کتاب کے آخر میں جن بزرگوں کے مضامین شامل کردیئے گئے ہیں، وہ خاص طور پر بہت اچھے ہیں، ان سے حضرت کی شخصیت جیسی دلآویز معلوم ہونے لگی ہے، پوری کتاب سے نہیں ہوتی، شاید اس لیے کہ ایک میں واقعات مذکور ہیں، دوسرے میں شخصیتیں (تاثرات) جگمگاتی ہیں۔

ایک بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی حضرت منطق سے کیوں اس درجہ بیزار تھے، اور بار بار قاضی مبارک کے انجام کا حوالہ دیتے تھے (۱)، تحصیل حدیث کے شرف وسعادت سے انکار نہیں، لیکن منطق، فلسفہ، ریاضی علوم عظیمہ میں سے ہیں، ان کے بجز تو علوم کی شیرازہ بندی نہیں ہوسکتی، اس کے بغیر خود معلم بے دست وپا ہے۔

امید ہے کہ آپ میری اس طرح کی باتوں سے بدحظ یا بدگماں نہ ہوں گے، ممکن ہے ارشاد وہدایت کے طور طریقے بالکل علیحدہ ہوتے ہوں جن سے میں ناآشنا ہوں، پوری کتاب تقریباً ایک ہی نشست میں ختم کردی تھی، اس لیے ممکن ہے کہ بعض نکات تک رسائی نہ ہوئی ہو، دعا ہے کہ آپ بہمہ وجوہ مع الخیر ہوں گے۔

خیر طلب

رشید احمد صدیقی

ایک اور خط جوان کی شرافت وشفقت کا آئینہ ہے "کاروان مدینہ" پڑھنے کے بعد لکھا گیا، اس خط میں ذات نبوی سے رشید صاحب کا تعلق جھلک رہا ہے، جو ہمیشہ رہا، اور وہ ان کی تحریروں میں آب ورنگ پیدا کرتا رہا، اس خط پر تاریخ ۲۶ر جنوری ۱۹۶۸ء پڑی ہے لکھتے ہیں۔

---

(۱) رشید صاحب کو شاید (مدارس عربیہ کی دنیا سے دور رہنے کی وجہ سے) یہ معلوم نہ تھا کہ وہ زمانہ یونانی معقولات (منطق وفلسفہ) میں غلو، شدید انہماک اور اس کو معیار فضیلت بلکہ آدمیت سمجھنے...... اور منقولات (علوم شرعیہ) سے کسی قدر غفلت کا تھا، اسی کا ردعمل اور اصلاح تھی، جو مولانا کے ملفوظات میں پائی جاتی ہے۔

ذاکر باغ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مخدوم ومحترم

اللہ تعالیٰ آپ کو زیادہ سے زیادہ دنوں تک قائم رکھے اور آپ کی گراں قدر علمی، دینی اور ادبی خدمات کو تا یوم الآخر۔

"کاروان مدینہ" کا ایک نسخہ ۳-۴ دن ہوئے موصول ہوا تھا، خوش اور شکر گزار ہوا، پڑھتا گیا اور رائے قائم کرتا گیا کہ یہ تقریر سب سے اچھی ہوگی، دوسری کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ پچھلی سے اونچی ہے، تیسری پڑھی تو محسوس ہوا کہ یہ دونوں سے بہتر رہی ہے، اس طرح خوب سے خوب تر تک سفر کرتا چلا گیا، آپ کے لیے ذہن میں تحسین کا جو دفتر کھلا وہ فی الحال قابو میں نہیں آتا کہ لکھ کر آپ تک پہنچاؤں، کتنے محدود صفحات میں آپ نے بصائر ومعارف کا کیسا گراں بہا ذخیرہ فراہم کردیا ہے، پھر آپ کا جامع فکر انگیز اور دل نشیں لب ولہجہ و پیرایۂ بیان، اس مختصر مطالعہ سے کتنی اور کیسی اچھی اور فکر انگیز باتیں ذہن میں پیدا ہوتی ہیں، اور زندگی وذمہ داری کے کیسے کیسے نئے افق سامنے آتے ہیں۔

"کاروان مدینہ" پر حرف آخر علامہ علی طنطاوی نے کہہ دیا ہے (ا) جو ان کے پورے خط یا مضمون کی جان ہے، یعنی "......آپ کا صد ہزار شکریہ کہ آپ نے دوبارہ میرے اندر اپنی ذات اور اپنے ادب پر اعتماد بحال کردیا" یوں مضمون یا خط میں آپ ہی کے مضامین (تقریروں) کا پرتو ملتا ہے، ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں، حضور کی بارگاہ اقدس میں شہداء کا بھی وفد جانا چاہئے تھا، سید الشہداء سے لے کر سید قطب تک جو سلسلہ شہداء کا ہے، وہ آپ کے پیش نظر ہوگا، اس کی طرف اقبال نے بھی اشارہ کیا ہے۔

(ا) "کاروان مدینہ" اصلاً "الطریق الی المدینۃ" کا ترجمہ ہے، علی الطنطاوی کا خط اس کا مقدمہ بنا دیا گیا ہے۔

سرخاک شہیداں برگہائے لالہ می پاشم

دعا ہے کہ آپ اپنے سے اور ہم سب سے خوش وخرم ہوں اور رہیں،
گرامی نامہ عرصہ ہوا صادر ہوا تھا، رسید اور شکریہ بھیجنے کی اب نوبت آئی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

میری علی گڑھ آمد ورفت رہتی تھی، رشید صاحب نے تو سالہا سال سے سفر کرنا چھوڑ دیا تھا، صحت کی خرابی، اور بعض ناخوشگواری وتلخ واقعات نے ان کی طبیعت کو مستقل طور پر افسردہ بنا دیا تھا، وہ علی گڑھ میں بھی اپنے گھر سے بہت کم نکلتے تھے، ان کے یونیورسٹی کے تعلق کے زمانہ میں تو میں طویل وقفوں کے بعد گیا، ایک مرتبہ وہ جب اساتذہ کی انجمن کے سکریٹری تھے تو انھوں نے میرے اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے اعزاز میں اساتذہ کی طرف سے دعوت بھی دی تھی، مارچ ۱۹۶۲ء میں میں علی گڑھ کے مشہور آئی ہاسپٹل میں داخل تھا، رشید صاحب اپنی اس خلوت گزینی کی وجہ سے آ تو نہیں سکے لیکن مٹھائی بھیجی، ساتھ ہی جو خط لکھا وہ شیرینی اور لطافت میں اس سے کم نہ تھا، فرماتے ہیں کہ "یہ چند ٹکڑے مٹھائی کے حاضر کرتا ہوں، آپ لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے میر انیس کا لطیفہ یاد دلانا پڑا جو اپنا کلام سناتے وقت بعض الفاظ یا فقروں کے بارے میں فرمادیا کرتے "یہ میرے وطن کی زبان ہے، حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں بولتے" چنانچہ (اس لطیفہ کے پیش نظر) مجھے بھی کہنا پڑ رہا ہے کہ "یہ میرے وطن کی مٹھائی ہے، لکھنؤ، علی گڑھ اور دہلی میں نہ ملے گی"۔

میرا قیام جب علی گڑھ میں مستقل طور پر اپنے فاضل ومحترم دوست ڈاکٹر ابرار مصطفیٰ خاں صاحب صدر شعبہ نباتیات کے یہاں رہنے لگا جو تار بنگلہ مسجد کے قریب رہتے ہیں، اور رشید صاحب کا مکان اس کے قریب ہے، میں کوشش کرتا کہ علی گڑھ پہنچنے کے بعد جلد سے جلد رشید صاحب کی خدمت میں حاضری دوں، علی گڑھ جن چند بزرگوں اور قدیم تعلقات رکھنے والے حضرات کے یہاں جانا ضروری سمجھتا تھا، ان میں ایک رشید

صاحب بھی تھے، کچھ عرصہ کے بعد رشید صاحب نے بھی ابرار صاحب کے مکان پر کرم فرمانا شروع کیا، میں بڑا محجوب ہوتا لیکن بعض اوقات سبقت فرما ہی جاتے، لوگوں کو بھی جو ان کے معمول اور افتادِ طبع سے واقف تھے، اس پر تعجب ہوتا، بعض اوقات آتے اور گھنٹے گھنٹے دو دو گھنٹے بیٹھتے، ان گفتگوؤں میں ان کا دردمند دل اور حساس و بیدار ضمیر کھل کر سامنے آتا، مجھے اندازہ نہ تھا کہ اردو کا یہ ادیب اور انشاپرداز جس نے اپنی پوری زندگی یونیورسٹی کی ملازمت میں گزاری ہے، اسلام اور ملت اسلامیہ ہندیہ سے ایسا گہرا تعلق اس کی زبوں حالی پر اتنا اشک بار، اس کی عظمتِ رفتہ کا ایسا حُدی خواں، اس کی خوشی سے اتنا خوش اور اس کے مصائب وحوادث سے اتنا رنجور وشکستہ دل ہے، بعض ملی حوادث سے (جو مسلمانوں کی تذلیل کا باعث ہوئے) تو ان کا دل اتنا متاثر تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ رو پڑیں گے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۶۷ء میں طلبائے ندوہ نے اپنی انجمن ''الاصلاح'' میں ان سے تشریف لانے اور تقریر کرنے کی فرمائش کی، رشید صاحب تو کیا آتے انھوں نے ایک مضمون لکھ کر بھیج دیا عنوان تھا، ''فرزندان ندوہ کے نام'' ان کا شمار ان کی اچھی اچھی تحریروں میں کیا جا سکتا ہے، اس میں ہندوستان کے مسلمانوں کی ملی زندگی کے بارے میں بڑے بلیغ اشارات ہیں، دینی تعلیم اور ندوہ کے متعلق ان کی توقعات اور دلی جذبات بھی آ گئے ہیں، بعض بڑے خوبصورت فقرے اور نادر ترکیبیں بھی آئی ہیں، مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے متعلق بھی معنی خیز اعترافات ہیں، ماہر القادری صاحب اور بعض دوسرے ادیبوں نے اس کو بہت پسند کیا، یہ جلسہ مولانا...... عبدالماجد صاحب دریابادی کی صدارت میں ہوا، میں نے افتتاحی تقریر کی، اور رشید صاحب کے ادبی مقام کا تعارف بھی کرایا، رشید صاحب کو اس کی رپورٹ ملی، ان کے متعدد عزیز دارالعلوم کے احاطہ میں رہتے تھے، ان کے حقیقی بھائی نیاز احمد صاحب صدیقی ایم.اے (سابق پرنسپل محمد حسن انٹر کالج جونپور) دارالعلوم میں انگریزی کے استاذ تھے، رشید صاحب کے بہنوئی ماسٹر محمد سمیع صدیقی صاحب ایم.اے.ایل.ٹی ہم سب کے استاد اور ندوی خاندان کے ایک فرد اور بزرگ ہیں، رشید

صاحب کو اس جلسہ کا حال معلوم ہوا تو قدرۃً ان کو خوشی ہوئی۔

نومبر ۱۹۶۶ء میں میں نے آل انڈیا مجلس مشاورت کے ایک وفد میں شریک ہو کر ریاست میسور (کرناٹک) کا دورہ کیا، اس دورے کی روداد "بارہ دن ریاست میسور میں" کے عنوان سے ندائے ملت میں بالاقساط چھپی، رشید صاحب نے پڑھی اور بہت پسند کیا۔

۱۹۶۷ء میں مجھے حجاز کے سفر کے دوران بڑا سنگین حادثہ پیش آیا، جس میں اللہ تعالیٰ نے بال بال بچالیا، میں اور برادرزادۂ عزیز محمد الحسنی سلّمہٗ طائف سے مکہ مکرمہ آرہے تھے کہ کار الٹ گئی اور اس طرح الٹی کہ چھت نیچے تھی، اور چاروں پہیے اوپر، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ خراش تک نہیں آئی، یہ خبر روزنامہ "دعوت" دہلی میں بھی شائع ہوئی اور اہل تعلق کو خطوط اور آنے جانے والوں سے بھی اس کا علم ہوا۔

اس پورے پس منظر کو معلوم کرنے کے بعد اب رشید صاحب کا یہ یادگار خط پڑھئے جو ان کے طرز انشا اور ان کی شرافت نفس دونوں کا مظہر ہے، اس میں وہ لطیف مزاحیہ انداز بھی ہے، جو رشید صاحب کی تحریر کا خاص جوہر ہے وہ لکھتے ہیں۔

ذکاءاللہ روڈ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

دوشنبہ ۲۰/نومبر ۱۹۶۷ء

مخدومی و معظمی آداب

ارض شرف وسعادت میں آپ کو جو حادثہ پیش آیا اور جس طرح اللہ نے آپ اور دوسرے ساتھیوں کو ہر طرح کی گزند سے محفوظ رکھا، اس سے خدا کا شکر ادا کرنے اور خوش ہونے کی توفیق ہوئی، اس توفیق کو بجائے خود اپنے لیے ایک نعمت سمجھتا ہوں، جو اس سلسلہ میں مجھے نصیب ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ درماندگی میں اللہ تعالیٰ کو آپ سے معلوم نہیں کتنی اور کیسی خدمات اور لینی ہیں، خدا کی طرف سے یہ بشارت بندہ کے لیے کتنی گراں مایہ ہے۔

اول درجہ کے کریکٹ مین میں یہ بات مشہور ہے کہ اگر کسی (Batsman) کو مخالف پارٹی کا کوئی کھلاڑی موقع ملنے پر (Catch) نہ کر سکے یا (Miss) کر دے، تو پھر پہلا کھلاڑی ایک سو رن (سنچری) کئے بغیر نہ رہے گا، بالفاظ دگر ہر چوک پر اعلیٰ درجہ کے کرکیٹ مین کو سورن کا تاوان ادا کرنا پڑتا ہے، اس کی تفصیل کبھی آصف صاحب (۱) سے دریافت فرمایئے گا، اس حادثہ سے خدا نے آپ کو بچالیا، تو کرکیٹ کی تلمیح کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب آپ اس مصاف زندگی میں جس سے آج کل مسلمانوں کو عالمگیر سابقہ ہے، سورن بنائے بغیر آوٹ نہ ہوں گے، انشاءاللہ۔

آپ نے ندوہ کے خطبہ کا تعارف کراتے ہوئے میرے بارے میں جو کچھ فرمایا اس کے لیے دل سے شکر گزار ہوں، علی گڑھ کے دانشوروں کے اس حلقہ میں بھی اس کی پذیرائی بہت اچھی ہوئی، جو دین و مذہب کو زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھتا، بعض نے تو یہاں تک کہا کہ اس کا انگریزی ترجمہ کریں گے، خیال ہوتا ہے کہ اگر اس ایڈیشن کی نکاسی جلد ہوگئی اور دوسرے ایڈیشن کی ضرورت سمجھی جائے گی تو اس کو اصلاح و اضافہ سے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کروں گا۔

کچھ دن ہوئے ''ندائے ملت'' میں آپ کے دورۂ دکن کی روداد نظر سے گزری تھی، جو آپ اور آپ کے رفقاء نے مجلس مشاورت کو متعارف کرانے کے لیے کیا تھا، وفد کا خیر مقدم جس خلوص اور گرمجوشی سے کیا گیا وہ غیر متوقع نہ تھا، لیکن مجھے تو مصحفی کا وہ شعر یاد آرہا ہے (کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا) (۲) جو آپ نے اس سلسلہ میں لکھا تھا، جس مہم

---

(۱) ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم اے، پی ایچ ڈی جو مکتوب الیہ کی اکثر کتابوں کے انگریزی مترجم ہیں اور قریب ہی رہتے تھے۔ (۲) اس سلسلہ مضامین کا آغاز مصحفی کے اس شعر سے ہوتا تھا۔

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

اور مقصد کے پیش نظر یہ شعر آپ کے ذہن میں آیا اس سے معلوم نہیں کتنا اضافہ اس لطف و عقیدت میں ہوا جو آپ کی طرف سے میرے دل میں ہے، دین، مذہب، سیاست اور معلوم نہیں کتنے اور مسائل مہمہ سے دوچار رہ کر زادِ سفر کی ایسی شگوفہ زائی کتنی دلآویز معلوم ہوئی، شعر وادب کی اس شگفتگی کو تو میں آدمی کی شرافت، شجاعت اور شائستگی پر محمول کرتا ہوں، اچھا اور بڑا آدمی بجائے خود اچھا شعر ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب(۱) وائس پریسیڈنٹ تھے، تو آپ کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی، جس کا ایک نسخہ موصوف کو بھی ملا تھا، دورانِ گفتگو میں آپ کا ذکر آ گیا تو فرمانے لگے ''مولانا اردو بڑی اچھی لکھتے ہیں'' ذاکر صاحب کا کسی کی انگریزی یا اردو کے بارے میں یہ رائے رکھنا میرے نزدیک مصنف کے لیے بڑی معتبر سند ہے، مصحفی کا یہ شعر خوب ہے، لیکن آپ نے جس سیاق وسباق میں اس کو پیش کیا ہے، اس سے یہ شعر آپ کا ہو گیا، یہ بحث دلچسپ لیکن طویل ہے، اس لیے اس پر گفتگو پھر کبھی ہوگی، اگر اس کا موقع ملا۔

مسلم یونیورسٹی جن منازل سے گزرتی ہوئی، جہاں پہنچی ہے(۲) اس سے کتنے نئے اور پرانے غم تازہ ہو گئے، ایسا معلوم ہونے لگا ہے، جیسے مسلمانوں کے لیے تمام دنیا میں کہیں امان ہے نہ انصاف، اللہ تعالیٰ نے ان غریب اور غیور مسلمانوں کو اس آزمائش سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق دے، جن کے بارے میں بشارت دی گئی ہے، کہ اسلام کو انھی سے سہارا تسکین اور طاقت ملے گی، خدا آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو یہ افتخار بخشے، آپ صاحبان کے بارے میں میرا یہی خیال ہے، خدا ہم سب کا

---

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم

(۲) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے متعلق یہ بحث شروع ہو گئی تھی کہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں کی قائم کی ہوئی ہے، اور ان کے انتظام میں دی جائے، یا حکومت کی، اور اس کے بارے میں اس کو ہر طرح کا اختیار ہے، نیز اس کے اقلیتی کردار کا مسئلہ مسلمانوں کے قومی وقار کا مسئلہ بن گیا تھا۔

حافظ وناصر ہے۔ آمین۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

رشید صاحب کا مجھ سے تعلق خاطر اس لیے بڑھ گیا تھا کہ مسلم یونیورسٹی کی حمایت میں پہلی آواز لکھنؤ سے اٹھی تھی، لکھنؤ کے مشہور گنگا پرشاد میموریل ہال میں جلسہ ہوا تھا، میں نے بھی تقریر کی تھی، اخبارات میں اس کی رپورٹ شائع ہوئی اور رشید صاحب نے پڑھی، اس تحریک میں میرے رفقاء واحباب خاص طور پر ظفر احمد صاحب صدیقی وکیل سیتاپور، حاجی شفیق الرحمٰن صاحب ایڈووکیٹ اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی پیش پیش بلکہ سچ پوچھیے تو اس مسئلہ میں یہ تینوں ''خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گلِ کوزہ'' کے مصداق تھے، یہ سب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے اور اپنی مادر علمی کے سعادت مند فرزند اور سچے وفادار تھے، علیگ برادری میں میں نے ان سے بڑھ کر علی گڑھ کا جاں نثار ووفادار نہیں دیکھا، اخیر کی سطروں میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

محبت کی طرح پسندیدگی کا آئین بھی سب سے نرالا ہے، اس کے لیے بھی کوئی کلیہ وضابطہ نہیں، میری ناچیز تصنیفات میں ان کو سب سے زیادہ میرا سفرنامہ ''دریائے کابل سے دریائے یرموک تک'' پسند آیا، مجھے آنے جانے والوں میں بالخصوص ان کے لائق وسعید بھانجے ڈاکٹر فصیح نے جو مسلم یونیورسٹی ہی میں استاذ تھے، بتایا کہ وہ اپنے یہاں آنے جانے والوں کو بھی اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس کو راشننگ (Rationing) کے ساتھ تھوڑا تھوڑا پڑھنا چاہیے، ایک خط کا یہاں اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جو ۵/ جنوری ۱۹۷۵ء کا لکھا ہوا ہے۔

''آپ نے جن مقامات کی سیاحت فرمائی، وہاں کے جن گزشتہ اور موجودہ علماء، شعراء، سلاطین اور اکابر کو یاد کیا، اور ان کی منزلت یاد دلائی، نیز یہ کہ ان کے عظیم کارنامے کتنے وسیع خطۂ ارض، کیسی گراں قدر

تصانیف اور یادگاروں اور مختلف الاحوال لوگوں کے ذہن و دماغ میں کس طرح اور کس شکل میں جلوہ گر ہیں، اس کا احساس شاید ہمارے اچھے خاصے لکھے پڑھے طبقے میں بھی کم ہی لوگوں کو ہوگا، ان کارہائے عظیم اور خدمات جلیلہ کے باوجود ہماری جو حالت وشہرت مہذب دنیا میں ہے، وہ کتنی عبرتناک ہے، آپ نے اس کا احساس کیا اور کلام پاک کے حوالہ سے اس کا جواب بھی دیا، لیکن کلام پاک کی تنبیہ وتاکید کو یاد دلانا آسان ہے، اس کو منوانا اور ذہن نشین کرادینا جس کی قدرت میں ہے، وہ نہ ہمارے بس کا ہے نہ آپ کے بس کا، قلب ضرور ہمارا ہے، لیکن اس کا مقلب تو کوئی اور ہی ہے، ایسا تو نہیں کہ مسلمانوں کا اقبال گزشتہ تہذیبوں کے فطری زوال کے مانند عمر طبعی کو پہنچ چکا ہو، ایسا ہے تو اس کی ضرب کہاں کہاں پہنچتی ہے، اس کا اندازہ مجھ سے کہیں زیادہ آپ کر سکتے ہیں۔

دعا ہے کہ آپ اس پایہ کی تصنیف سے ہمارے ولولوں کو آنے والے اچھے دنوں کی بشارت سے تازہ کار رکھیں گے اور تقویت پہنچاتے رہیں گے، آپ کی تصانیف میں انشاء پردازی کا جو حسن، جامعیت اور ''موافق احوال'' ہونے کی صفت پائی جاتی ہے، اس کا اعتراف مجھ سے بہتر لوگ کر چکے ہیں، مختلف تقریبوں میں آپ کی تقریریں بڑی عالمانہ، شگفتہ، شائستہ اور برمحل ہیں، کہیں کوئی ڈھیل بربنائے مصلحت نہیں ملتی، ص ۱۴۱ سطر آخر سے پہلی سطر میں آپ نے ''اسلامی نخوت'' (۱) کا فقرہ لکھا ہے نخوت کا لفظ اسلامی کے ساتھ کھٹکا، عربی، فارسی زبان میں نخوت کا جو بھی مفہوم ہو، اردو میں تکبر، گھمنڈ اور غرور کے معنی میں بالعموم استعمال ہوتا ہے، عام طور پر کبر ونخوت ہی بولتے ہیں، اردو میں نخوت کو بزرگی کا مفہوم شاید ہی کسی نے دیا ہو، لیکن اس معاملہ میں آپ کا قول قول فیصل ہے، دعا

(۱) یہ سفرنامہ مصنف کے عربی سفرنامہ کا ترجمہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے عربی ہی کا لفظ اردو میں رکھ دیا ہے، اردو میں مذموم معنی میں بولا جاتا ہے۔

ہے کہ آپ خوش وخرم ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

رشید صاحب کی طبیعت اس خط کے لکھنے سے سیر نہیں ہوئی، انھوں نے کتاب پڑھ کر بیس دن کے بعد دوسرا خط لکھا جو درج ذیل ہے۔

جمعہ ۲۴/جنوری ۱۹۷۵ء

ذاکر باغ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مکرمی ومحترمی سلام مسنون

والا نامہ صادر ہوا تھا، آپ نے جس لطف وکرم کا اظہار فرمایا ہے، اس کے لیے میں شکر گزار ہوں، اس اظہار کے ساتھ کہ آپ جس نوازش سے یاد فرمایا کرتے ہیں، اس کے مطابق میں اپنی احسان مندی کا اظہار نہیں کر پاتا، گرتے پڑتے، ڈرتے "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" عبور کر گیا، اور قبل اس کے کہ صدا بلند ہو کہ "فلاں (راقم السطور) نماند" (۱) جی چاہا کہ آپ کو بے اختیار مبارک باد دوں کہ آپ کی یہ تصنیف اس طرح کی تصانیف سے جو دوسروں نے اب تک پیش کی ہیں نمایاں طور پر ممتاز ہے، اسلوب اور اظہار مطالب کے اعتبار سے جتنی سنجیدہ اور مؤثر ہے، اتنا ہی دلکش بھی ہے۔

جن موضوع ومسائل پر آپ نے بحث کی ہے، اس کی سطح اور انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے قدیم کو جدید میں جس خوبی وخوبصورتی سے ڈھالا ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے، ص: ۹۹ سے ۱۱۵ تک کے مطالعہ سے خاص طور سے متاثر ہوا، جہاں آپ نے اہالیان ایران کو اسلام

---

(۱) سعدی کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر   زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

اور اثنا عشریت کے پیش نظر ''وہ راہبر کی ہدایت یہ رہ گزر کا فریب'' کو واضح کیا ہے، اس دعوت میں جس قوت ایمانی، دین ودانش کے تقاضے اور وزن وقار، خطابت وخشیت کے توازن کے جتنے نمونے ملتے ہیں، اور موقع کی نزاکت کا خیال آتا ہے، تو آپ کی کیسی کیسی علمی خداداد صلاحیتوں کا احساس ہوتا ہے، کاش لکھنؤ کے شیعہ اکابر بھی اس دعوت پر غور فرماتے۔

کتاب کے تعارف میں جو باتیں ٹائٹل پیج پر درج ہیں، ان سے کچھ زیادہ ہی صفات سے یہ کتاب متصف ہے، یہ امتیاز کم تصانیف میں ملے گا، اسلامی ممالک اور ان کے مسائل سے آگاہ ہونے اور رکھنے کا یہ کتاب بڑا معتبر وسیلہ ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے جتنے عظیم مقاصد اور مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں، اور اس امر سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے، اس سے یہ خیال دل میں آنے لگتا ہے کہ اگر آپ برابر ایسے سفر پر رہیں تو مسلمانوں اور ملت پر بڑا احسان ہوگا، امید ہے کہ مزاج عالی مع الخیر ہوگا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۹۷۵ء میں جب میری کتاب ''پرانے چراغ'' چھپ کر آئی تو میں نے بہت ڈرتے ڈرتے رشید صاحب کو بھیجی کہ جس کے قلم سے ''گنجہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' جیسی کتابیں نکلی ہیں، اس کی نگاہ میں یہ چلتا ہوا تذکرہ کیا جچے گا، انھوں نے کتاب کی رسید دی، یہ وہ زمانہ تھا کہ ان کو کتابوں کا پڑھنا دشوار ہو گیا تھا، اور بقول ان کے ''اب نگاہ جلد جواب دینے لگتی ہے، جواب ہی نہیں دینے لگتی دیر تک جواب طلب کرتی رہتی ہے'' ان کی طبیعت اتنی حساس اور حوادثِ روزگار سے اتنی چوٹ کھائے ہوئی تھی کہ مسلمانوں اور عالم اسلام کی کوئی بُری خبر ان کو ملول وافسردہ کر دیتی، ان کے قلم سے اس خط میں یہ جملے بھی نکلے ''امیر فیصل مرحوم کی شہادت نے اور زیادہ مایوس وملول کر دیا، کیسا زمانہ آیا ہے، اور کیا مقدر

ہے کہ ہر روز کوئی نہ کوئی نامبارک ہی خبر سننے میں آتی ہے" یہ خط ۲۶ / مارچ ۱۹۷۵ء کا ہے، ایک ہی ہفتہ کے بعد جب ان کو کتاب پڑھنے کا موقع ملا تو ۳ / اپریل ۱۹۷۵ء کو انھوں نے دوسرا خط لکھا جس میں کتاب سے اپنا تأثر ظاہر کرنے کے ساتھ ایک ایسا مشورہ بھی دیا جو ان جیسا کہنہ مشق ادیب و صاحب نظر ہی دے سکتا تھا۔ انھوں نے لکھا۔

"بسلسلۂ گزشتہ عرض ہے کہ "پرانے چراغ" کے آپ کی اول درجہ کی تصنیف ہونے میں کوئی شک نہیں، میرا خیال ہے کہ اول درجہ کا مصنف اپنی کسی دوسری درجہ کی تصنیف پر نہ قادر ہوتا ہے، نہ اس کو گوارہ کر سکتا ہے، آپ نے جن عظیم المرتبت مرحومین کو عقیدت کا ہدیہ پیش کیا، کون ہے جو ان کی فضیلتوں کا معترف نہ ہوگا، اور ان کی جدائی پر محرومی کا احساس نہ کرے گا۔

یہ وہ ہستیاں ہیں، جو عالم ارواح میں سایۂ رحمت میں اکٹھا مل جائیں گی، اور بآسانی پہچان لی جائیں گی، چاہتا ہوں کہ آپ کسی بہت ہی معمولی شخص کی غیر معمولی صفات کا اور خدمات کا مرقع پیش فرمائیں، جس کو بہت کم لوگ جانتے ہوں، لیکن آپ کے اجاگر کئے ہوئے نقوش ایسے گمنام اور کس مپرس شخص حشر کے ہیجان و ہجوم میں بھی جدھر سے گزرے یا جہاں ہو فوراً پہچان لیا جائے، خاکہ نگاری کا بڑا وصف اور اولین شرط میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے، بڑے کو کتنا ہی بڑا دکھائے آسان ہوگا، بنسبت اس کے کہ چھوٹے کو بڑا دکھایا جائے، فن اور فن کار کی یہ معراج ہوگی"۔

۳۱/ اکتوبر اور ۱/ ۲/ نومبر ۱۹۷۵ء کو ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی منایا گیا جو ہندوستان میں برسوں تک یادگار رہے گا، ممالک عربیہ کے دانشوروں، ماہرین تعلیم، عرب حکومتوں کے اعلیٰ عہدہ داروں اور جامعات و علمی اداروں کے موقر وفود کی اتنی بڑی تعداد ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں اس سے پہلے اس ملک کے کسی جلسہ میں شریک نہیں

ہوئی تھی، خود ہندوستان میں ایسا شائستہ وشستہ، چیدہ وبرگزیدہ، مجمع کسی دینی وعلمی مرکز میں اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا تھا، اس اجلاس کی متعدد خصوصیتوں کی طرف ملک کے مشاہیر اہل علم واہل ذوق نے اشارہ کیا اور ان کو سراہا، لیکن رشید صاحب نے جو اپنی روایت ومعمول کے مطابق اس جلسہ میں شریک نہیں ہوسکے تھے، اس پر جس بزرگانہ وعزیزانہ مسرت کا اظہار کیا، وہ ان کا حصہ تھا، یہاں یہ کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں اور اس سے اگر خودستائی ہوتی ہے تو اس کے لیے قلم وقلب دونوں معذرت خواہ ہیں کہ بہت کم لوگوں نے اس بات کا احساس واعتراف کیا کہ اس میں جو خطبۂ استقبالیہ پڑھا گیا تھا، وہ ایک نئے طرز کا تھا، اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اس بلند سطح سے خطاب کیا گیا تھا، اور اس میں خدا اعتمادی وخود اعتمادی کی وہ روح تھی، جو عرصہ سے ایسے خطبوں میں ملحوظ نہیں رکھی گئی تھی، اس میں ندوۃ العلماء ہی نہیں بلکہ ملت اسلامیہ ہندیہ اور اسلامی تہذیب کا جو اس نے یہاں پیدا کی، اس انداز سے تعارف کرایا گیا تھا کہ جس سے مہمانانِ گرامی یہ محسوس کریں کہ وہ ان کی کچھ مدد کرسکتی ہے، اور اس سے بہت سی چیزیں سیکھنے اور حاصل کرنے کی ہیں، رشید صاحب نے اس کو اچھی طرح محسوس کیا اور اپنی طبعی فراخ دلی وخلوص کے ساتھ اس کا اپنے خط میں اظہار بھی کیا، وہ لکھتے ہیں۔

> ’’جس وسیع پیمانہ پر، جس حوصلے، سلیقے، آراستگی، حسن انتظام اور حفظ مراتب سے جن اعلیٰ مقاصد کے پیش نظر یہ تقریب منائی گئی، اور اتمام کو پہنچی، وہ اپنی نظیر آپ ہے اور ایک طویل مدت تک خوشی وفخر کے ساتھ یاد رکھی جائے گی، آپ اور آپ کے رفقائے کرام ہماری تہنیت، شکر گزاری اور دعائے خیر کے مستحق ہیں۔
>
> آپ کا خطبۂ استقبالیہ اس تقریب کا سب سے قیمتی اور دلکش تحفہ ہے ’’برنگ اصحاب صورت را، بہوار باب معنی را‘‘ اس کی خوبیاں خلاف توقع نہیں بلکہ پورے طور پر متوقع تھیں، اس لیے کہ خطبہ آپ سے منسوب

تھا، ہندوستانی اسلامی تہذیب کا جو نقش بدیع اور ہندوستانی مسلمانوں کے موقف کا اظہار واعلان آپ نے جس بے مثل مورخانہ، مفکرانہ اور مجتہدانہ انداز واختصار سے کیا ہے، وہ بہت کم لکھنے والوں کے حصہ میں آتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان کچھ دنوں سے جس بے دلی اور بے مقصدی میں مبتلا ہو گئے تھے، آپ نے اس تقریب کی غیر معمولی کامیابی سے اسے دور کر دیا اور مسلمان پھر اپنے کو حوصلہ مند اور تازہ دم محسوس کرنے لگے ہیں، یہ بہت بڑی بات ہوئی جو آسان نہ تھی، آپ اور آپ کے ساتھ کام کرنے والوں کے لیے صمیم قلب سے دعا نکلتی ہے، البتہ ایک بات سے ڈرتا ہوں کہ اگر عملاً اور مسلسل اسی حوصلہ کو طاقت نہ پہنچائی گئی تو اس کا وہی حسرتناک انجام ہوگا جو دیکھنے میں آتا رہتا ہے"۔

میری عربی کتاب "روائع اقبال" کا اردو ترجمہ "نقوش اقبال" کے نام سے مولوی شمس تبریز خاں نے کیا، جب اس کے دوسرے ایڈیشن کے چھپنے کی نوبت آئی تو انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں رشید صاحب سے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کروں، ان کے ضعف واضمحلال طبع کو دیکھ کر مجھے اس میں بڑا تأمل تھا، اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ کتاب عربی میں تو نبھ گئی کہ وہاں کے لیے اقبال پر جو کچھ لکھا جائے وہ سوغات کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کا ڈر تھا کہ اگر وہ چیز بجنسہٖ ہندوستان کے ادیبوں اور نقادوں کے سامنے پیش کی گئی تو کہیں اس کی قلعی نہ کھل جائے، اردو میں اقبال پر اتنا لکھا گیا ہے، اور اقبال کا نام وکلام یہاں اس طرح دن رات کا وظیفہ بلکہ "تکیہ کلام" ہے کہ اس کا عربی میں رہنا اچھا ہے، لیکن میں نے جرأت کر کے ان کو لکھ دیا، ان کا لکھنا بہت کم ہو گیا تھا، لیکن ان کی شفقت تھی کہ انھوں نے اس کو منظور کر لیا، اور کتاب پر ایک ایسا مقدمہ لکھا جو اقبالیات کے وسیع ذخیرہ میں اپنی حیثیت رکھتا ہے، انھوں نے کلام اقبال کی قدر و قیمت معلوم کرنے اور سمجھنے کے سلسلہ میں بعض نئے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا، ان کا یہ فرمانا کتنا وزن رکھتا ہے کہ

''اقبال اور حالی کے کلام کا سنجیدگی اور احترام سے مطالعہ کیے بغیر ملت اور ملت کے بخشے ہوئے فضائل کا ادراک واحساس آسان نہیں ہے، یہ فیضان ہے عشق رسول کا، جس نے ان شعراء کے کلام کو گراں مایہ اور لازوال بنادیا...... یہ کچھ شاعروں ہی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ ہر مسلمان کا مذہبی اور تہذیبی معیار یہ ہے کہ اس کی زندگی اور اس کا کردار کس حد تک عشق رسول سے مشرف ومستنیر ہے'' اقبال کے متعلق انھوں نے یہ آخری بات لکھ دی کہ ''اقبال کا کلام اس صدی کا علم کلام ہے، اور اب مذہب وزندگی کی تفہیم اسی طرح اور اسی سیاق وسباق میں کی جائے گی جو ہم کو اقبال کے یہاں ملتی ہے''۔ یہ مقدمہ ان کے دور آخر کی ممتاز تحریروں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

رشید صاحب روز بروز اپنی ادبی وفکری دنیا میں محدود سے محدود تر ہوتے چلے جارہے تھے، اب ان کا گھر سے نکلنا اور بھی کم ہوگیا تھا، وہ یونیورسٹی سے بھی جوان کے لیے ہمیشہ سے وہی نسبت رکھتی تھی، جو شمع کو پروانے سے اور بلبل کو گل سے رہی ہے، برداشتہ خاطر، اور وہاں کے واقعات سے شکستہ دل ہوتے جارہے تھے، ان کو جب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دیئے جانے کا فیصلہ ہوا (جو افسوس کہ بہت تاخیر سے ہوا) تو ان کی غیور طبیعت نے اس کو لینے کے لیے کانووکیشن میں جانا بھی پسند نہ کیا، اور وہ اپنے گھر میں بیٹھے رہے، میرے دل میں اس سے ان کی عزت اور بڑھ گئی، وہ اگرچہ اب دنیا سے یکسو تھے، اور ان کا مطالعہ بھی بہت محدود رہ گیا تھا، لیکن مسلمانوں اور عالم اسلام سے ان کی دلچسپی کم نہیں ہوئی تھی، وہ ضمیر فروشی اور بے کرداری کے واقعات سے بہت دلگیر رہنے لگے تھے، جو عالم اسلام اور ہندوستان میں وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے تھے، دین ومذہب، علم وہنر، فکر ودانش کا معیار روز بروز اتنا پست ہوتا جارہا تھا، ارزاں فروشی کی جو وبائے عام پوری دنیا میں آئی ہوئی تھی، اس سے وہ باخبر بھی تھے، اور آشفتہ خاطر بھی، ۷؍ جولائی ۱۹۷۶ء کو ایک خط میں جو ہمارے مرقع خطوط میں ان کا آخری خط ہے، تحریر فرماتے ہیں ''اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں تو دور دور تک کسی کو دوسرے تیسرے درجے

پر بھی نہیں دیکھتا، کیسا وقت آگیا ہے کہ ہم میں معتبر سیاسی و مذہبی پیشوا ناپید ہیں، محرومی و مایوسی اس کی ہے کہ ہمارے فرد، جماعت اور حکومتیں بہت جلد اور بہت کم قیمت پر خرید لیے جاتے ہیں، یہ متاع اس طرح لٹے گی یا لٹائی جائے گی تو اللہ ہی حافظ"۔

۱۵ر جنوری ۱۹۷۷ء کو ان کی وفات کا حادثہ پیش آیا، ایک ہفتہ بعد ہی جب یونیورسٹی کے سیمینار "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" کا افتتاح کرنے کے لیے علی گڑھ گیا تو ان کے دولت خانہ پر بھی حاضری دی، حاضر الوقت اعزہ سے تعزیت کی اور ان کے آخر وقت کے حالات تفصیل کے ساتھ سنے، عزیز گرامی ڈاکٹر فصیح سے معلوم ہوا کہ اپنی اس آخری بیماری میں بھی جب وہ آتے تو ان سے پوچھتے کہ علی میاں کا کوئی خط آیا ہے، کیسے ہیں، کب آئیں گے؟ افسوس ہے کہ یہ گنج خوبی انھی گنجہائے گراں مایہ میں شامل ہو گیا، جن پر اس نے برسوں آنسو بہائے اور ادب و انشا کے پھول کھلائے تھے۔

□□□

چودھری غلام رسول مہرؔ

سن ۲۵-۱۹۲۶ عیسوی میں زمیندار لاہور کا پُر جوش اسلامی حلقوں میں طوطی بولتا تھا، اس کا سنڈے ایڈیشن رنگین اور بڑی آن بان کا ہوتا تھا، اس میں مولانا ظفر علی خاں کی نظمیں خاصہ کی چیز ہوتی تھی، ان لوگوں کو زیادہ تر انھیں نظموں اور اس کے پُر زور افتتاحیوں اور ''افکار و حوادث'' کے مزاحیہ کالم کی وجہ سے انتظار رہتا تھا، لوح پر بحیثیت ایڈیٹر کے دو آدمیوں کے نام ہوتے تھے، چودھری غلام رسول مہرؔ، عبدالمجید سالکؔ، مہرؔ صاحب زیادہ تر افتتاحیہ اور ایڈیٹوریل نوٹس لکھتے تھے، اور ''افکار و حوادث'' کا کالم سالکؔ صاحب سے مخصوص تھا، افتتاحیے متانت تحریر کا نمونہ ہوتے، کبھی کسی اَیجیٹیشن یا مسلمانوں کے کسی ملی مسئلہ کی وجہ سے اس میں زورِ قلم یا تندی ترشی آجاتی، ورنہ عام طور پر معتدل اور ٹھنڈے ہوتے، افکار و حوادث کا کالم البتہ بڑا چٹ پٹا اور مزیدار ہوتا، یہ عنوان ''الہلال'' سے لیا گیا تھا، لیکن سالکؔ صاحب نے اس میں نیا آب و رنگ پیدا کر دیا تھا، انھوں نے طنز و مزاح کا ایک نیا اسلوب صحافت میں داخل کیا تھا، جو شوخی اور دل لگی کے ساتھ ابتذال اور سوقیانہ پن سے پاک تھا، دونوں اردو کے منجھے ہوئے ادیب یا صحافی تھے، زبان کی غلطیوں اور پنجاب کے دوسرے تیسرے درجہ کے لکھنے والوں کی کمزوریوں سے محفوظ، اپنی سادگی اور نوعمری کی وجہ سے عرصہ تک ان کو بھائی سمجھتا رہا، ان کا نام اور زمیندار لازم و ملزوم بن گئے تھے، مولانا ظفر علی خاں تو رزم و بزم کے آدمی تھے، آج یہاں شیر کی طرح گرج رہے ہیں، کل وہاں بلبل کی طرح چہک رہے ہیں، کبھی جیل میں ہیں، کبھی کسی تنظیم کے قائد، اردو شاعری تو ان کے گھر کی لونڈی تھی، اردو نے عرصہ سے ایسا قادر الکلام شاعر پیدا نہیں کیا ہوگا، قوافی کے تو

وہ بادشاہ تھے، میں اپنی زندگی میں سب سے پہلے جس شخصیت سے متاثر ہوا ہوں وہ ظفر علی خاں تھے، ۹-۱۰ سال کی عمر تھی کہ مولوی اسماعیل میرٹھی مرحوم کا تیار کیا ہوا اردو کا نصاب پڑھا، اسی سلسلہ کی کتاب ''سفینۂ اردو'' پڑھی ظفر علی خاں کا جادو دل و دماغ پر چل گیا، ان کی نظم ''راجہ دسرتھ کی کہانی خود ان کی زبانی'' مزے لے لے کر پڑھتا اس کا مطلع تھا۔

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی
تھی زمین پہنے ہوئی وردی ہری بانات کی

کثرت سے پڑھنے کی وجہ سے اس نظم کا تقریباً حافظ ہو گیا تھا، اسی کتاب میں ان کی ایک دوسری نظم بھی تھی، جس میں حیدرآباد کی موسیٰ ندی کے سیلاب کی قیامت خیزی کی تصویر کھینچی گئی تھی، ہماری بستی دائرہ شاہ علم اللہ میں بھی چونکہ سیلاب آتے رہتے ہیں، اس لیے اس کے پڑھنے میں بڑا لطف آیا، مطلع تھا۔

او نامراد ندّی تجھ پر غضب خدا کا
الٹا ہے تو نے تختہ یارانِ آشنا کا

پھر جب زمیندار گھر آنے لگا تو اور بھی ان کی شاعری، ذہانت، خطابت اور جوش و حمیت کا کلمہ پڑھنے لگا، دوستوں اور ساتھیوں سے ان کے بارے میں بحث کرتا اور کسی کو ان کا مدّ مقابل نہ سمجھتا، خدا معاف کرے مولانا محمد علی بھی اس وقت نظر میں نہ جچتے۔

مولانا ظفر علی خاں کی تو بات بیچ میں آگئی اور آنی ضروری تھی، کہ بغیر ان کے مہر و سالک کا تذکرہ نہیں کیا جا سکتا، پھر وہ وقت بھی آیا کہ یہ دونوں ستارے زمیندار کے آسمان سے ٹوٹ کر صحافت کے ایک دوسرے افق پر نمایاں ہوئے اور انھوں نے زمانہ کے انقلاب کا ثبوت دیا، مہر و سالک نے زمیندار سے علیٰحدگی اختیار کر کے لاہور سے ایک نیا اخبار ''انقلاب'' کے نام سے نکالا، ان کی علیٰحدگی کے بعد مولانا ظفر علی خاں کا جو پہلا افتتاحیہ زمیندار میں شائع ہوا اس میں اس انقلاب حال پر حسب عادت کچھ شعر بھی تھے، ایک شعر ابھی تک یاد ہے۔

مہرؔ وسالکؔ کے انقلاب کو دیکھ
انقلابات ہیں زمانہ کے

کچھ عرصہ کے بعد جب عقل وشعور نے کچھ اور ترقی کی تو اپنے بزرگ خاندان مولوی سید خلیل الدین صاحب کے ہاں ان کی تصنیف ''سیرت ابن تیمیہ'' دیکھی، معلوم ہوا کہ وہ صرف صحافی نہیں مصنف ومؤرخ بھی ہیں، لیکن لاہور کئی بار جانے کے باوجود ان سے ملنا نہیں ہوا، ایک مرتبہ یاد آتا ہے کہ مولانا سید طلحہ صاحب کے ساتھ والدہ صاحبہ کے مجموعۂ کلام ''باب رحمت'' پر تبصرہ کرنے کی فرمائش کے سلسلہ میں دفتر انقلاب گیا تھا، ان سے اصل ربط اس وقت پیدا ہوا جب انھوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی سیرت لکھنی شروع کی، میں بھی اس راہ کا ان کے مقابلہ میں خوردسال، کم حیثیت (جونیر) مسافر تھا، میری کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' جو اس وقت لکھی گئی جب میری عمر ۲۴-۲۵ سال کی تھی، نکل چکی تھی، اور ملک میں مقبول تھی، کتاب کے اس پہلے ایڈیشن میں واقعات کی تفصیل کے لحاظ سے بھی اور محققانہ اور مؤرخانہ حیثیت سے بھی بہت سی خامیاں اور کوتاہیاں تھیں، لیکن صاحب سوانح کی مقبولیت اور کچھ ہندوستان کے خاص حالات کا تقاضا کہ کتاب اس سے زیادہ اور مقبول اور مشہور ہوئی، جس کی وہ مستحق تھی، مہرؔ صاحب جیسے کہنہ مشق مصنف اور تجربہ کار مؤرخ کی نظر میں تو یہ کتاب جچنے والی اور مصنف سے رابطہ قائم کرنے پر آمادہ کرنے والی تو کیا ہو سکتی تھی، لیکن صاحب سوانح سے خاندانی تعلق اور ان کے حالات ومعلومات اور انساب کے خاندانی ذخیرہ سے جو رائے بریلی ولکھنؤ میں موجود تھا، استفادہ کا خیال، پھر ایک صحیح مصنف کا ذوق جستجو جو غیر اہم سے غیر اہم آدمی سے بھی مدد حاصل کرنے پر آمادہ کرتا ہے، میرے ساتھ خط وکتابت کا محرک ہوا، اور انھوں نے مراسلت کی ابتدا کی، ان کو اس موضوع سے پیشہ ورانہ تعلق نہ تھا، اور نہ اس کا کوئی اقتصادی وتجارتی محرک تھا، ان کو اس موضوع سے عشق سا ہو گیا تھا، وہ اس کو اپنی ایک عظیم سعادت بلکہ عبادت سمجھ کر انجام دے رہے تھے، وہ ذہنی (اور غالباً خاندانی طور پر بھی) سید صاحب کی فکر ودعوت سے

اتفاق رکھتے تھے، قلبی طور پر ان کی شخصیت کے معتقد اور ان سے بہت متاثر تھے، پہلی ملاقات کے وقت انھوں نے بتایا کہ ۱۲-۱۴ برس سے جب سے انھوں نے اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ کیا ہے، کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب انھوں نے دو رکعت نفل پڑھ کر بوجہ احسن اس کام کی تکمیل کے لیے اللہ سے دعا نہ کی ہو، وہ جب سید صاحب کا ذکر کرتے تھے تو ان کی عقیدت میں ڈوبے ہوئے نظر آتے تھے، ان کو سید صاحب اور ان کے کام، اقدامات اور فیصلوں کے بارے میں پورا شرح صدر ہو گیا تھا، اور وہ ان کے ان واقعات اور رایوں کے بارے میں کلی طور پر مطمئن تھے، جو عام طور پر لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے خلش کا باعث بنے ہوئے ہیں، اپنے محبوب اور محترم بزرگ مولانا ابوالکلام آزاد کے برخلاف جن کے وہ بہت بڑے مدّاح اور معترف تھے، وہ اس پوری تحریک، جدوجہد اور فکر میں سید صاحب ہی کو مرکزی نقطہ، اس کے تخیل اور فکر کا سرچشمہ اور اس کی تاثیر اور اثر انگیزی کا اصل سبب مانتے تھے، اور اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ ان کو محض عالی نسبی یا بعض خصوصیات ومصالح کی بنا پر قائد کا مقام دے دیا گیا تھا، ورنہ اس تحریک میں اصل حضرت شاہ اسماعیل شہید یا حضرت شاہ اسحٰق دہلوی تھے، مہر صاحب حضرت سید صاحب کے جدّ امجد سید شاہ علم اللہ کی شخصیت اور خاص طور پر ان کے ذات نبوی کے اتباع کامل سے بہت متاثر تھے، اور یہ دونوں باتیں ان کی کتاب کی سطر سطر سے جھلکتی تھیں۔

مجھ سے مہر صاحب کی خط وکتابت غالباً ۱۹۴۴ء کے اوائل سے شروع ہوئی، خاندانی حالات، رائے بریلی کے مقامات سید صاحب کے شجرۂ نسب، اور خاندانی قرابتوں کے متعلق کوئی بھی مشکل پیش آتی یا کسی بات کا سمجھنا ہوتا، جو خاندانی کاغذات یا خاندانی واقفیت کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی تو فوراً مجھے خط لکھتے، بالعموم ''سید صاحب'' لکھ کر بات شروع کر دیتے، ان کے ایسے خطوط درجنوں کی تعداد میں ہوں گے جو ان کے سوالات واستفسارات پر مشتمل ہیں، اس خاندانی پہلو کے علاوہ ان کی تحقیقات ہر طرح مکمل اور معیاری تھیں، انھوں نے اس موضوع کو اپنی زندگی کا آخری موضوع بنا لیا تھا، ایک ایک

مقام اور ایک ایک نام کی تحقیق میں بعض اوقات ان کو سیکڑوں صفحات دیکھنے پڑے، صوبہ سرحد اور وہ خطہ جو سید صاحب اور ان کی جماعت کی سرگرمیوں اور نقل وحرکت کی جولانگاہ تھی، آزاد علاقہ اور سمہ کا میدان جہاں سید صاحب کی تحریک یا ان کے بعد کی مجاہدانہ کوششیں جاری رہیں، اس کے چپہ چپہ سے وہ واقف تھے، اس کی تاریخ وجغرافیہ کو ایک محنتی طالب علم کی طرح انھوں نے باقاعدہ پڑھا تھا، خود بھی بار بار ان علاقوں میں گئے اور ان کے نقشے تیار کیے، اس باب میں ان کی بلند ہمتی، ذوقِ جستجو، دیدہ ریزی اور جگر کاوی پرانے مصنفین کی یاد تازہ کرتی ہے، جنھوں نے کسی چیز کی تحقیق کے لیے بحر وبر چھان ڈالے اور کتابوں پر اکتفا نہ کرتے ہوئے، ان مقامات پر جا کر ذاتی معلومات حاصل کیں، وہ کبھی رائے بریلی نہیں آئے، لیکن کتابوں کے مطالعہ سے ان کو یہ معلوم تھا کہ تکیہ جانے کے کون کون سے راستے ہیں، پرانا راستہ کون تھا، نیا کون؟ سید صاحب اپنی ہمشیرہ سے ملنے کے لیے اپنے مکان سے قلعہ کس راستہ سے جاتے تھے، کون سا موضع کس سمت واقع ہے، میں نے ان سے کہا بھی کہ جب آپ کو ایسا تعلق ہے تو آپ ایک بار رائے بریلی کیوں نہیں آتے، لیکن وہ ہمیشہ سن کر خاموش ہو گئے، ملک کی تقسیم ہو چکی تھی، اور آنے جانے کی قانونی دشواریاں بھی تھیں، میں بھی خاموش ہو گیا، لیکن مدتوں اس کا افسوس رہے گا کہ وہ ایک بار یہاں کیوں نہیں آئے؟ یہاں اس سلسلہ میں ان کے ۲۷؍ستمبر ۱۹۴۴ء کے ایک طویل خط سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:۔

> ’’میں اب کام کو اتنا بڑھا چکا ہوں کہ جو بھی نیا گوشہ سامنے آتا ہے، اس کے ذرہ ذرہ کو سمیٹ لیتا ہوں، افسوس ہے کہ اب تک شاہ علم اللہ کے حالات بھی تفصیلاً روشنی میں نہ آسکے، حالانکہ وہ بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے، اور مجددیوں میں تو اس پیمانہ کا نقشِ اتباعِ سنت کہیں نظر نہیں آتا، اللہ اکبر! کیا لوگ تھے، جو شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد میں ہندوستان کی خاک سے پیدا ہوئے اور ان کی سیرتیں قرنِ اول سے متصل نظر آتی ہیں۔

......عالمگیر نے ایک مکتوب میں غالبًا اپنے بیٹے کو لکھا تھا کہ ؎

آنچہ بر جستیم وکم دیدیم بسیار است ونیست
نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار ست ونیست

لیکن جب عالمگیر کے عہد میں افراد کا یہ حال تھا، حالانکہ اسلامی شوکت وسطوت اوج کمال پر تھی تو اس عہد کے متعلق کیا عرض کیا جائے، جس میں مسلمان دنیا کی ہر چیز کھو کر محض ''خشبٌ مسندۃ'' رہ گئے تھے، لیکن اسی عہد میں سید صاحب نے آدم گری اور'' آدم سازی'' کے وہ کمالات دکھائے جو کم از کم میرے تاریخی مطالعہ میں تو ایسی ایک شخصیت بھی نہیں ملتی، مولانا ولایت علی صاحب، سید صاحب کے کمالات آدم گری کا محض ایک نمونہ ہیں، میں جب ناواقف تھا تو سمجھا کرتا تھا کہ چند ایسے آدمی سید صاحب نے جمع کر لئے، لیکن اب تو حلف اٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ایسے سیکڑوں آدمی اس بزرگ ہستی نے پیدا کئے اور انشاء اللہ حانث نہیں ہوں گا، سید صاحب کی اس فضیلت یگانہ کا مظہر میری کتاب کی وہ جلد ہے، جس میں حضرت کے رفقاء کے حالات مرقوم ہیں، اسے بھی شروع کر دیا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تکمیل تک پہنچائے، جب بیمار ہوتا ہوں تو ہمیشہ اقبال کا یہ شعر پڑھتا ہوں ؎

حرف ناگفتہ بحال نفسے می خواہد
ورنہ مارا بہ جہاں تو سروکار کجاست''

مہر صاحب کی سید صاحب کی سیرت کے ساتھ اس شغف وانہماک کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کو (باوجود اس کے کہ وہ کوئی ضعیف الاعتقاد اور شخصیت پرست شخص نہیں تھے بلکہ امام ابن تیمیہؒ اور شاہ اسماعیل شہید کے مکتب خیال کے سلفی المسلک مسلمان تھے) سید صاحب کو خواب میں دیکھنے کی آرزو رہتی تھی، خدا نے بھی ان کی یہ آرزو پوری کر دی، اسی تاریخی مکتوب میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

''اب ایک بات راز کی بھی سن لیجیے، میں مدت سے آرزو ودعا کرتا تھا کہ سید صاحب کی زیارت نصیب ہو، ۲۵و۲۶ر رمضان المبارک کی رات کو بھی یہی دعا مانگ کر سویا، حقیقت یہ ہے کہ اتنی مدت تک لیل ونہار کے ہر لمحۂ فرصت کو سید صاحب کے احوال وتلاش کی تحقیق میں بسر کرنے کے باوجود زیارت نصیب نہ ہونے سے میرے دل پر یہ اثر پڑا تھا کہ میرا کام بے برکت ہے، دعا یہ تھی کہ مجاہدین کے بڑے گروہ کے ساتھ نہیں تو کم از کم مولانا محمد یوسف پھلتی، مولانا عبدالحی وشاہ اسماعیل کے ساتھ زیارت سے مشرف فرمائیں''۔

اس کے بعد انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ پہلے اپنے گاؤں کا نقشہ کھینچا ہے، جس میں انھوں نے خواب میں سید صاحب کی زیارت کی، انھوں نے قلم سے اس کا جغرافیائی نقشہ حدود اربعہ کا نقشہ خط میں درج کیا، پھر سید صاحب کی زیارت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا:۔

''جب بتایا گیا کہ آپ سید صاحب ہیں تو میں چند قدم آگے بڑھا، اس وجود کے چہرہ پر شفقت آمیز تبسم دوڑ رہا تھا، میں نے بات کرنی چاہی تو بڑی محبت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ جو کچھ لکھ رہے ہو، اس میں میرے کام یعنی جہاد کو نمایاں کرنے کا خاص خیال رکھنا، یہ فرماتے ہی سارا منظر غائب ہو گیا، میری آنکھ کھل گئی، ایک دم اٹھ بیٹھا دیکھا تو سحری کا کھانا پک رہا تھا''۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:۔

''یہ بھی عرض ہے کہ آپ اس کائنات میں پہلے انسان ہیں، جن کے سامنے میں نے یہ خواب بیان کیا، اس غرض سے نہیں کہ اس کی اشاعت ہو، بلکہ آپ پر میرے استفسار وضرورت کی اہمیت واضح ہو جائے''۔

خط کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

''کتاب کا انتظار فرمایئے، جس کی آخری تسوید کا کام بالاکوٹ کا

حصہ طے ہو جانے پر شروع ہو جائے گا، اور اس پر انشاء اللہ ایک دو مہینہ
سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا، پھر خدا کو منظور ہوا تو ارادہ ہے کہ آپ کی
اور بھائی صاحب(۱) کی زیارت کروں، اور اس ناچیز خدمت کو آپ
حضرات کے ملاحظہ گرامی سے گزار کر شرف اندوزی کا آرزومند بنوں''۔

لیکن مہر صاحب کا اندازہ صحیح نہ نکلا، اور اکثر ان مصنفین کا اندازہ غلط ہوتا ہے، جو اپنی تصنیف کو تحقیق کے بلند سے بلند معیار پر دیکھنا چاہتے ہیں، اور اپنی تحریر کی نوک پلک درست کرتے رہتے ہیں، یہ کتاب ۱۹۵۵ء کے اوائل میں یعنی ٹھیک دس برس بعد منظر عام پر آسکی، اس عرصہ میں دو تین بار لاہور جانا ہوا، ہر مرتبہ مہر صاحب نے اپنے مکان پر جو مسلم ٹاؤن میں سالک صاحب کے مکان کے بغل ہی میں تھا، بڑے اہتمام سے مدعو کیا اور بڑی خاطر مدارات کی، قدرتاً دیر تک سید صاحب، ان کی جماعت اور اپنی کتاب کا ذکر کرتے رہے۔

سید صاحب کے کام کی مقبولیت کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ اس کی تاریخ کو مرتب ومحفوظ اور ان کے کارنامہ کو روشن وا جاگر کرنے کے لیے مہر صاحب جیسے کہنہ مشق، شہرۂ آفاق اور پختہ کار ادیبوں اور مؤرخوں کے قلم قدرت خداوندی کی طرف سے مسخر کیے گئے "وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اور اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، اور انشاء اللہ جاری رہے گا، یہ "بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ" کی ایک تفسیر ہے، ناقص معلومات اور بیگانوں کے مغالطوں، مستشرقین اور ان کے فریب خوردہ مشرقی ومغربی مسلمان وغیر مسلم مقلدین کی بہتان طرازیوں اور فریب انگیزیوں، پھر ملت کی مسلسل بے اعتنائی اور نا آشنائی کے کہر سے ان کی عظمت کا آفتاب اس طرح طلوع ہوا کہ ساری تاریکیاں چھٹ گئیں، اور حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوگئی، خود مہر صاحب نے اپنے اس ذوق وانہماک کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

''میں نے زندگی کے بہترین اوقات بے تامل صرف کیے، نہ ہمت
نے ساتھ چھوڑا، نہ صبر کی پیشانی پر کوئی شکن نمودار ہوئی، نہ طلب وجستجو کی

---

(۱) میرے برادر معظم ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب مراد ہیں، جن سے مہر صاحب کو غائبانہ عقیدت تھی۔

آنچ مدھم ہونے پائی، نہ محنت وکاوش کے حوصلوں پر افسردگی چھائی، ہزاروں صفحات کی ایک ایک سطر کے پیچ وخم میں میری نظریں بار بار دوڑی ہیں، مختلف عقدوں کی کشائش میں میرے دماغ کی صلاحیت غور وفکر برسوں جولانیوں میں سرگرم رہی ہے''۔

آگے چل کر انکسار واعترافِ قصور سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''میں اپنے علم وعمل کی بے بضاعتی کے پیش نظر اس اہم کام کی تکمیل کا اہل نہ تھا، جو کچھ ہوا یہ محض خدائے لایزال کا فضل تھا، ایک قرن کے لیل ونہار، ان پاک نفس ہستیوں کے ذکر وفکر میں گزار چکا ہوں، جن کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، جاگنا سونا، جینا مرنا، صرف خدا کی رضا سے وابستہ رہا، شاید مجھ آلودہ داماں اور سراپا جرم وعصیاں کے لیے یہی مشغولیت وسیلۂ مغفرت بن جائے''۔(۱)

مہر صاحب اپنے طرز نگارش، فارسی کے اعلیٰ ذوق اور انشا پردازی میں مولانا آزاد کے دور آخر کے کامیاب ترین متبعین میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں، لیکن وہ اپنے تحقیقی ذوق، مؤرخانہ احتیاط اور مدلل طریقہ پر بات کہنے میں کچھ فائق ہی ہیں، اور یہ غالباً مشاغل زندگی کی نوعیت کے فرق کا اثر ہے، تاریخ وتصنیف کی بادیہ پیمائی، سیاست کے ہفت خواں کو طے کرنے سے بہت مختلف ہے، اول الذکر کے لیے فراغ خاطر، حالات کا اعتدال، اور علمی ماحول ضروری ہے، اور سیاست کے بیڑے کو طوفانوں اور آندھیوں سے مفر نہیں، ان ناہموار حالات اور طوفانی موسم میں بھی مولانا آزاد نے جتنا کام کرلیا، اور جو نقوش چھوڑے وہ ان کی اعلیٰ ذہنی صلاحیت اور غیر معمولی قوتِ ارادی کی دلیل ہے، مہر صاحب فارسی کے برمحل اشعار کا جتنا صحیح استعمال کرتے ہیں، اور جیسے اشعار انھوں نے اساتذہ ایران کے کلام سے انتخاب کیے ہیں، اور ان کو انگشتری میں نگینہ کی طرح اس کتاب میں جڑ دیا ہے، وہ کسی طرح ''تذکرہ'' اور ''غبار خاطر'' کے فارسی اشعار کے انتخاب سے کم نہیں، بلکہ اس حیثیت

(۱) دیباچہ سید احمد شہیدؒ، ص:۱۳

سے ان میں زیادہ برجستگی اور بے ساختگی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ان کے لیے پہلے سے زمین تیار نہیں کرتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اسی موقع کے لیے یہ شعر کہا تھا۔

مہر صاحب غالب واقبال کے بھی بڑے رمز آشنا اور ان کے حالات، تاریخ اور ان کے کلام کے مطالب اور ان کی تلمیحات کی شرح وتحقیق میں سند کا درجہ رکھتے ہیں، اور اس بارے میں ان کی تحریریں اس موضوع کے طالب علموں کے لیے بڑی مددگار ورہنما ہیں، لیکن اس موضوع میں ان کو سید صاحب کے ایک سوانح نگار اور ان کی جماعت وتحریک کے مؤرخ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اور ان کے خطوط کے آئینہ اور ذاتی واقفیت ہی کے حدود کے اندر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، افسوس ہے کہ ۱۶/نومبر ۱۹۷۱ء کو اس کہنہ مشق صحافی وبلند پایہ انشاپرداز" اور صاحب نظر مؤرخ وسوانح نگار نے اس جہانِ فانی سے رحلت کی اور برصغیر کی بزم صحافت وانشاء میں ایک باوقار کرسی اس طرح خالی ہوئی کہ اس کا پُر ہونا اس زمانہ میں دشوار نظر آتا ہے ؂

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

❑❑❑

ماہر القادری صاحب

ماہر القادری صاحب سے تعارف ان کے رسالہ ''فاران'' ہی کے ذریعہ سے ہوا، میں شاعر نہ تھا کہ کبھی ان سے کسی مشاعرہ میں یکجائی ہوتی، رات کے جاگنے کا ہمیشہ سے چور رہا، اس لیے اپنے گاؤں کے مشاعروں کے علاوہ جو میرے بچپن میں ہوئے، اور جن میں بچوں کا شریک ہونا، بزرگوں کو پسند نہ تھا، میں لکھنؤ کے ایک مشاعرہ کے سوا کسی مشاعرہ میں شریک نہ ہوا، یہ مشاعرہ ہمارے محلّہ ہی کے قریب مولوی عبدالرؤف عباسی مرحوم مدیر ''حق'' لکھنؤ کے اہتمام میں ان کے دفتر وقیام گاہ مرشد آباد پیلس گولہ گنج میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی صدارت میں ہوا تھا، مولانا کچھ دیر بیٹھ کر تشریف لے گئے، اور نواب جعفر علی خاں اثرؔ کو صدارت سپرد کر گئے، ماہر صاحب پاکستان منتقل ہوئے تو میری ۱۹۵۶ء سے پہلے ملاقات نہیں ہوئی، وہ مجھ کو میرے مضامین اور بعض تصنیفات کے ذریعہ جانتے تھے، اور میں ''فاران'' خاص طور پر اس کے ناقدانہ تبصروں اور ان کی نظموں کے ذریعہ جانتا، پہچانتا تھا، ۱۹۵۰ء کے بعد کا کوئی سال تھا کہ انھوں نے ''فاران'' کا ''سیرت نمبر'' نکالنے کا فیصلہ کیا اور مجھ سے مضمون کی فرمائش کی، یہ فرمائش کچھ ایسے اصرار اور اشتیاق کے ساتھ تھی کہ میں انکار نہ کر سکا، نواح لکھنؤ کا ایک تبلیغی سفر تھا، کہ میں نے اسی میں کچھ وقت نکال کر ''سیرت محمدی دعاؤں کے آئینہ میں'' کے عنوان سے ایک مضمون قلم برداشتہ لکھ دیا، سفر کی حالت میں ایسا ہی مضمون لکھا جا سکتا تھا، جس کے لیے بار بار کتابوں کی طرف رجوع کرنے، عبارتیں نقل کرنے اور حوالہ دینے کی ضرورت نہ ہو، مسنون دعائیں جو مجھے یاد تھیں ان کو ذہن میں رکھ کر یہ مضمون مرتب کر لیا، ماہرؔ صاحب نے یہ مضمون ''فاران'' کے

''سیرت نمبر'' جنوری ۱۹۵۶ء میں شائع کیا، بعض دوستوں نے اس کے پڑھنے کے بعد مجھ سے اس کے علیٰحدہ رسالہ میں شائع کرنے کی اجازت لی، اور وہ کئی بار مستقل کتاب کی شکل میں شائع ہوا، یہ مضمون ایسا مقبول ہوا کہ عربی میں بھی اس کا ترجمہ گزشتہ سال قاہرہ سے شائع ہوا، میرا خیال ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چھپے گا، اور اس سے کسی بندۂ خدا کو فائدہ ہوگا، اور اس کو دعا کی توفیق ہوگی، اس میں ماہر صاحب کا ضرور حصہ ہوگا، غالباً ایک آدھ خصوصی نمبروں میں اور بھی ان کی فرمائش سے مضمون لکھنے کی نوبت آئی، لیکن نہ مدیر ''فاران'' نے اس وقت تک مضمون نگار کو دیکھا تھا، نہ مضمون نگار نے مدیر ''فاران'' کی زیارت کی تھی۔

اسی عرصہ میں ایک مرتبہ علاقۂ برار کا تبلیغی دورہ تھا، اس نواح کے ایک دور افتادہ دشوار گزار مقام پیپل گاؤں راجہ جانا ہوا، راستہ بہت خراب اور طویل تھا، میں کئی دن کا تھکا اور جگا ہوا، سڑک بہت خراب، بس یا لاری کا سفر، مغرب کے بعد وہاں پہنچنا ہوا، تھک کر چور ہو گیا تھا، عشا کے بعد جلسہ تھا، میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں معذرت کر دوں گا کہ میں اس حال میں نہیں ہوں، اور دوسرے علمائے کرام و مقررین ہیں، وہ کافی ہیں، لیکن جلسہ جما تو وہاں سے پیغام آیا کہ لوگوں کو اشتیاق وانتظار ہے، تھوڑی دیر کے لیے ضرور آجائیں، ''قہر درویش برجانِ درویش'' میں وہاں پہنچا تو ایک نعت پڑھی جارہی تھی، یہ نعت کچھ ایسی مؤثر اور دل آویز تھی کہ تکان جاتا رہا اور جسم میں ایک نئی طاقت محسوس ہوئی، میں نے یہ نعت پہلے کبھی نہیں سنی تھی، اور ابھی مقطع نہیں آیا تھا کہ دل نے کہا یہ نعت ماہر صاحب کی ہے، بالآخر خوش الحان پڑھنے والے نے مقطع پڑھا۔

اے نام محمد صلی علی ماؔہر کے لیے تو سب کچھ ہے
ہونٹوں پہ تبسم بھی آیا، آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے

میں نے دیکھا کہ مجھ میں تقریر کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے، تازہ دم ہوں، یہ اس نعت کی مسیحائی تھی کہ میں سارا تکان بھول گیا، اور میں نے پورے جوش ونشاط کے ساتھ تقریر کی۔

۱۹۵۶ء کی جولائی یا اگست کے مہینہ میں جب دمشق سے واپسی میں دو روز کے

لیے کراچی ٹھہرا تو ماہر صاحب میری آمد سن کر برادر محترم سید محمد جمیل صاحب کی قیام گاہ گرین ہاؤس فاطمہ جناح کالونی ملنے تشریف لائے، سید جمیل صاحب اس وقت پورے پاکستان کے اکاؤنٹنٹ جنرل (Accountant General) تھے، ان کے والد مرحوم الحاج سید محمد خلیل صاحب جو میرے والد ماجد کے مخلص دوستوں میں تھے، بھی حیات تھے، میں نے وہیں پہلی مرتبہ ماہر صاحب کو دیکھا، دیر تک نشست رہی، اس کے بعد ایک مرتبہ ماؔہر صاحب مشاعرہ پڑھنے ہندوستان آئے، اس دورہ میں وہ بمبئی بھی گئے، میں اتفاق سے وہیں تھا، صابوصدیق مسافر خانہ میں میری تقریر کا پروگرام تھا کہ اچانک مولوی حامد انصاری غازی صاحب نے اعلان کیا کہ حسن اتفاق ہے کہ ماہر صاحب بھی یہاں تشریف لے آئے ہیں، اور وہ تقریر سے پہلے اپنا کلام سنائیں گے، بے اختیار میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنی وہی نعت سنائیں جو میں نے برار کے ایک گاؤں میں دوسرے کی زبان سے سنی تھی، اب اس کو محض اتفاق کہئے یا جذب دل کی، ماؔہر صاحب نے بلا کسی فرمائش کے وہی نعت پڑھی، ان کی زبان سے اس نعت کے سننے میں لطف ہی کچھ اور آیا، ایک تو ان کی محبوب و پسندیدہ نعت، پھر ان کا پڑھنے کا طریقہ اور اثر میں ڈوبی ہوئی آواز جن لوگوں نے ان کا کلام ان کی زبان سے نہیں سنا ہے، ان کو معلوم نہیں کہ وہ جس طرح بہت اچھا کہتے تھے، ویسے ہی بہت اچھا پڑھتے تھے، اور اس میں ان کو اپنے عہد کے رئیس المتغزلین حضرت جگر سے خاص مماثلت تھی، جلسہ کے بعد ایک ہی موٹر پر واپسی ہوئی، میں نے ان سے ان دونوں واقعات کا ذکر کیا جو محض اتفاق پر محمول نہیں کیے جاسکتے، تیسری ملاقات دلّی سے کراچی جاتے ہوئے ہوائی جہاز پر ہوئی، میں رابطہ کے جلسہ میں شرکت کے لیے مکہ معظمہ جارہا تھا، اور وہ کراچی واپس ہورہے تھے۔

''فاران'' وہ ازراہِ مہربانی میرے نام رائے بریلی کے پتہ پر پابندی سے بھیجتے تھے، میں خصوصیت کے ساتھ کتابوں پر اور خاص طور پر شعراء کے کلام اور دیوانوں پر ان کے تبصرے پڑھتا تھا، وہ زبان و بیان کی جن فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلاتے تھے وہ بڑی

اہم ہوتی تھیں، اگر شاعر، ادیب یا مصنف نے اردو زبان کے
طریق ادا کے خلاف کسی جملہ کا استعمال کیا ہے تو اس پر وہ ضرور ٹوکتے تھے، اور ان
کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے، بعض اوقات ان سے خوردہ گیری کی
تھی، اور ان سے اختلاف کرنے کی گنجائش بھی ہوتی تھی، لیکن اس سے کے طالب علم
اور اہل قلم بہت فائدہ اٹھا سکتے تھے، میں بڑے غور اور دلچسپی سے ان کی تنقیدوں کو پڑھتا تھا،
میری بعض عربی کتابوں کے اردو تراجم پر جو بعض رفیقوں کے قلم سے نکلی ہیں، انھوں نے
ایسے ہی تبصرے کئے، مجھے ان کی بہت سی اصلاحات اور تنقیدوں سے اتفاق ہوا اور میں نے
وہ شمارہ محفوظ رکھا، اور دوسرے ایڈیشن کے موقع پر اس سے فائدہ اٹھایا، میری کتاب
''روائع اقبال'' کا ترجمہ ''نقوش اقبال'' کے نام سے ۱۹۷۱ء میں نکلا تو انھوں نے ''فاران''
میں اس پر بڑا اچھا تبصرہ کیا، اور یہاں تک لکھ دیا کہ ''کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا
ہے، جیسے شبلی کا قلم، غزالی کی فکر اور ابن تیمیہ کا جوش و اخلاص اس تصنیف میں کارفرما ہے''
اور یہ کہ ''نقوش اقبال میں خود اقبال کی فکر اور روح اس طرح گھل مل گئی ہے، جیسے پھول
میں خوشبو اور ستاروں میں روشنی''۔(۱)

۱۹۶۹ء میں مَیں جب لندن میں تھا کہ اچانک میری قیام گاہ پر ماہر صاحب
تشریف لائے، وہ افریقہ کے ایک سفر سے واپس ہو رہے تھے، اور انگلستان کے صاحب
ذوق اور ادب نواز احباب کی دعوت پر لندن آئے تھے، دیر تک بیٹھے علمی، ادبی باتیں ہوتی
رہیں، ہم لوگ اس دیار غیر میں ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوئے، مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا
کہ وہ بعض اردو محاورات کے بارے میں مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ کے خیال میں کیا صحیح
ہے، اور آپ کس طرح بولتے ہیں ے پاکستانی، ہندوستانی احباب نے ان کے
اعزاز میں پیکاڈلی ہوٹل میں ایک ادبی محفل ترتیب دی تھی، جس میں ان کا استقبال کیا
جانے والا تھا، اور وہ اپنا کلام سنانے والے تھے، میرے نام بھی دعوت نامہ آیا، مجھے اس

---

(۱) ''فاران'' مئی ۱۹۷۱ء

وقت آنکھوں کی تکلیف تھی، اور سرجنوں سے مشورہ کر رہا تھا، لیکن ماہر صاحب کی آمد کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کرلیا، عزیزی مزمّل حسین صدیقی ندوی نے جلسہ کو کنڈکٹ (Conduct) کیا، اور مجی ڈاکٹر خورشید احمد نے ماہر صاحب کی شاعری اور ادب پر فاضلانہ مقالہ پڑھا، میری تقریر کا بھی اعلان کر دیا گیا، میں نے اپنی تقریر کا آغاز جگر کے اس مشہور شعر سے کیا۔

کامل رہبر، قاتل رہزن

دل سا دوست نہ دل سا دشمن

میں۔ ادب و شاعری کا معاملہ بھی کچھ دل کا سا ہے، یہ کامل رہبر بھی ہے، اور قاتل رہزن بھی، اس کا انحصار اس شمشیر زن پر ہے، جس کے ہاتھ میں دودھاری تلوار ہو، ماہر صاحب انھی خوش قسمت شاعروں اور ادیبوں میں ہیں، جنھوں نے اس تلوار سے دین کی حمایت کا کام لیا ہے، انھوں نے اس کو قاتل رہزن بننے کے بجائے کامل رہبر بنا دیا ہے، اس کے بعد ماہر صاحب نے اپنا کلام سنایا، کچھ اپنی طرف سے کچھ دوستوں کی فرمائش سے، اب کیا تھا، تھوڑی دیر کے لیے لوگ بھول گئے کہ وہ لندن میں ہیں، یا لکھنؤ، کراچی یا ... میں، کلام کی چستی و روانی پھر ان کی زمزمہ سنجی، ایک سماں بندھ گیا۔

ماہر صاحب نے جو جنوبی افریقہ کی سیاحت کر کے آئے تھے، اور انگلستان کی بھی، کئی قابل دید مقامات دیکھے تھے، مجھ سے لیک ڈسٹرکٹ (Lake District) کے دیکھنے کی بڑی تاکید کی، اور ایسا بیان کیا کہ جس نے وہ نہیں دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا، میں انھی کے شوق دلانے پر اپنے رفقائے سفر مولوی معین اللہ صاحب ندوی، مولوی عبداللہ عباس ندوی کی معیت میں لیڈس (Leeds) سے جہاں کی یونیورسٹی میں میرا پروگرام تھا، اس کو دیکھنے کے لیے گیا، سفر طویل تھا، اور وقت کم، لیکن محنت وصول ہوگئی، اور معلوم ہوگیا کہ وہ فطری مناظر اور قدرتی حسن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

میرا معمول ہوگیا کہ جب میری کوئی کتاب چھپتی تو ماہر صاحب کو ضرور بھیجتا، وہ

ان گنے چنے ادیبوں اور مدیرانِ رسائل میں سے تھے، جو پوری کتاب پڑھنے کی زحمت گوارہ کرتے ہیں، پھر اس پر ناقدانہ ومبصرانہ تبصرہ کرتے ہیں، اس بارے میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی (جب تک کے صدق میں ''رسید کتب'' کے بجائے تنقید وتبصرہ کا باب تھا) اور ماہرالقادری صاحب بہت ممتاز تھے، اور مصنف حقیقت میں ایسا ہی تبصرہ چاہتا ہے، جس سے اس کو اندازہ ہو کہ تبصرہ نگار نے اس کی محنت اور کتاب کی خصوصیات کا اندازہ کیا، ایک حقیقی مصنف جس کو اپنے موضوع اور تصنیف سے دلی لگاؤ اور وابستگی ہوتی ہے، محض ان فیاضانہ تعریفی الفاظ سے خوش نہیں ہوتا جو مضمون بہار کی طرح ہر ممدوح کی مدح کے قصیدہ کے ساتھ لگ سکے، وہ فطری طور پر یہ جاننا چاہتا ہے کہ تبصرہ نگار نے اس کی کتاب پڑھی، اس کی محنت وجستجو کا اس کو کچھ اندازہ ہوا، اور اس کی انفرادیت (اگر اس کتاب میں کوئی انفرادیت ہے) اس کی نظر کے سامنے آئی؟ بلکہ ایک حقیقی مصنف ان تنقیدوں اور مشوروں سے خوش ہوتا ہے، جو کتاب کو بہتر بنانے میں مدد کرتے ہیں، اور ان سے فائدہ اٹھا کر کتاب کے آئندہ ایڈیشن کو زیادہ وقیع اور قیمتی بنایا جا سکتا ہے، میں نے اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' بھی ان کو بھیجی، میں اس کتاب کو اپنی دوسری تصنیفات کے مقابلہ میں کم اہم اور تفریح طبع کا سامان سمجھتا ہوں، اس کی ہندوستان وپاکستان میں جو پذیرائی ہوئی، وہ توقع اور قیاس کے خلاف تھی، اس کتاب میں کئی مقامات ایسے تھے کہ ماہر صاحب کو کھٹکے اور وہ ان کو قابل تنقید نظر آئے، لیکن کتاب پہنچنے پر انھوں نے جو خط لکھا وہ ان کی محبت وشرافت کا آئینہ دار ہے، افسوس ہے کہ میرے پاس ان کا صرف یہی ایک خط محفوظ رہ گیا ہے، اس لیے ایک عزیز یادگار اور سند کے طور پر نقل کیا جاتا ہے۔

ماہنامہ ''فاران''

ناظم آباد کراچی

مخدومی ومکرمی۔ السلام علیکم

''پرانے چراغ'' نے پرسوں آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشا، خاصہ حصہ پڑھ

ڈالا، آپ کی تحریروں میں اخلاص اور ادبیت کی کوئی حد و نہایت نہیں، ''فاران'' میں مفصل تبصرہ آئے گا، اپریل کا شمارہ آج ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

مولانا سید رشید الحسن خطیب جامع مسجد نیو ٹاؤن سے سخت شکایت ہے کہ وہ آپ کے کراچی سے گزرنے کی اطلاع مجھے نہیں دیتے، حالانکہ میں نے بارہا تاکید کے ساتھ ان سے التجا کی ہے، اس دفعہ بھی ان کی غفلت کی وجہ سے میں آپ کی زیارت سے محروم رہا جس کا مجھے قلق ہے۔

آپ سے جو تعلق خاطر اور نیازمندی ہے، اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا، میرا دل کہتا ہے کہ اس خاکسار سے بھی آپ کو لگاؤ ہے۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

والسلام

طالب دعا ماہر القادری

۱۹/اپریل ۷۷ء

ماہر القادری صاحب صرف ادیب ونقاد ہی نہ تھے، وہ اسلامی فکر اور اسلامی انقلاب کے ایک پُر جوش داعی اور نقیب بن گئے تھے، انھوں نے اپنی ساری تحریری وادبی صلاحیت وتوانائی اس کے لیے وقف کردی تھی، اور ان کا پرچہ اس کا مستقل ترجمان بن گیا تھا، خاص طور پر وہ پاکستان کے حالات سے بڑے دل گیر اور آشفتہ خاطر رہتے تھے، ذوالفقار علی صاحب بھٹو کی قیادت وسربراہی کا زمانہ ان کے لیے خاص طور پر نہایت صبر آزما تھا، اس زمانہ میں بھی وہ اپنے احساسات وجذبات کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کا قلم ''نقش اول'' میں خون کے آنسو روتا رہا، ان کا ہر افتتاحیہ پاکستان کا ایک مرثیہ اور اس کی صورت حال کا ایک حقیقت پسندانہ اور جرأت مندانہ تجزیہ ہوتا، خدا نے ان کو اس دنیا سے اٹھنے سے پہلے جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی شکل میں امید کی کرن بھی دکھادی، اور انھوں نے اپنے افتتاحیوں میں اپنی مسرت واطمینان اور اچھی توقعات کا بھی اظہار کیا، وہ جماعت اسلامی کے پرجوش حامی اور اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے

قدر شناسوں اوران کی خدمات، ان کے فکر، ان کے علم ومطالعہ کے نہ صرف معترف بلکہ اس کے بڑے معرّف تھے، راقم سطور کے نزدیک ہر پڑھے لکھے، اور صاحب فکر کو رائے قائم کرنے اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے لیے انتخاب کرنے کا حق حاصل ہے، اور اس میں کسی شعور اور صاحب ضمیر آدمی کے اخلاص و نیک نیتی پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں، ماہر صاحب کو بھی اس کا حق تھا، اور انھوں نے اسی کے ذریعہ اپنی دینی حمیت اور حق کی حمایت کے جذبہ کا اظہار کیا، لیکن کبھی کبھی اس جذبہ کی شدت میں ان کے ہاتھ سے احتیاط اور اعتدال کا دامن چھوٹ جاتا، اور ان کے قلم سے بعض مرتبہ واجب الاحترام اور مسلّم دینی شخصیتوں کے بارے میں سخت تنقید کے الفاظ نکل جاتے، جن کے حدود کبھی کبھی تنقیص سے مل جاتے، ان کے بہت سے دوستوں اور قدردانوں کے لیے اس کی ایک تکلیف دہ مثال ان کا وہ تبصرہ تھا جو انھوں نے ہم سب کے مخدوم ومحترم شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی کتاب ''فتنہ مودودیت'' اور اس کی وضاحتی مضمون پر کیا، کاش کہ وہ اس کی اشاعت سے پہلے اس پر نظر ثانی کر لیتے اور اس کے ان بعض جملوں کو حذف کر دیتے جن کو پڑھ کر ان بہت سے لوگوں کو تکلیف پہنچی جو شیخ الحدیث کے مقام اور علم وفضل سے واقف ہیں۔

یک حرف کاشکیست کہ صدجا نوشتہ ایم

دنیا سے ہر ایک کو جانا ہے، لیکن ماہر صاحب جس طرح دنیا سے گئے، اور ان کو اپنی برزخی زندگی گزارنے کے لیے جو جگہ ملی، وہ ہزاروں کے لیے قابل رشک ہوگی۔

۱۲، ۱۳ / مئی ۱۹۷۸ء کی درمیانی شب میں جدّہ کے ایک مشاعرہ میں انھوں نے حفیظ جالندھری کو ان کے ایک ایسے شعر پر ٹوکا جس میں ان کے نزدیک دین ومذہب کے ساتھ ایک شوخی اور بیباکی تھی، تھوڑی دیر کے بعد ان پر قلبی دورہ پڑا اور وہ راہی ملک بقا ہو گئے، مکہ معظمہ میں جنۃ المعلیٰ میں ان کی تدفین ہوئی اور اس طرح اس جوارِ رحمت میں انھوں نے جگہ پائی جس کی آرزو بڑے بڑے علماء اور صلحاء کرتے ہیں۔

□□□

چند علمائے کبار

- مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی
- علامہ بہجۃ البیطار
- مولانا عبدالعزیز میمن
- مولانا محمد اویس ندوی

مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی

مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کے ہمارے خاندان اور اس کے بزرگوں سے بڑے گہرے روحانی روابط تھے، ان کے والد محترم مولوی ناظر علی صاحب تحصیلدار حضرت مولانا سید عبدالسلام صاحب ہنسوی (خلیفہ حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی دہلوی) کے مرید و مجاز اور عاشق صادق تھے، مولانا سید عبدالسلام صاحب میرے والد ماجد مولانا سید حکیم عبدالحی صاحب کے ماموں تھے، وہ اپنے وقت کے مشائخ کبار اور اہل اللہ میں سے تھے، شاہ احمد سعید صاحب اور ان کے بھائی شاہ عبدالغنی صاحب کے ہندوستان سے ہجرت کر جانے کے بعد سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ میں مولانا عبدالسلام صاحب سے بلند پایہ اور عالی مرتبت شیخ اس وقت ہندوستان میں نظر نہیں آتا، والغیب عند اللہ، اسی کا نتیجہ تھا کہ جب اس سلسلہ کے متوسلین نے ہندوستان سے شاہ عبدالغنی صاحب کو خط لکھا کہ ''آپ دونوں بھائیوں کے چلے جانے کے بعد دلی (چتلی قبر) کی مجددی خانقاہ جس کی مسند ارشاد پر کبھی حضرت مرزا مظہر جان جاناں، شاہ غلام علی اور آخر میں حضرت شاہ احمد سعید رونق افروز تھے، اب سونی پڑی ہے، اور اس کی مسند ارشاد خالی ہے، تو شاہ صاحب نے مدینہ منورہ سے لکھا کہ تم ہنسوہ (۱) سے مولانا عبدالسلام صاحب کو لے جا کر اس مسند پر بٹھاؤ، اب وہی اس کے اہل ہیں، میں نے اس خط کا جواب مولانا عبدالسلام صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا، ہنسوہ میں دیکھا ہے، جس میں انھوں نے اس اہم اور رفیع ذمہ داری کو قبول کرنے . .

(۱) ہنسوہ ضلع فتح پور کا ایک قصبہ ہے جو شہر فتح پور سے جانب مشرق ۸، ۱۰ میل پر واقع ہے، یہاں سادات حسینی واسطی کی ایک شاخ ساتویں صدی ہجری سے مقیم ہے، ضلع رائے بریلی کے ساتھ حسنی قطبی کی جس سے راقم سطور کا تعلق ہے اس خاندان سے قرابتیں اور قدیم رشتہ داریاں ہیں۔

سے معذرت کی ہے، مولانا نے جواب میں لکھا کہ "میں کسی طرح اس کے قابل نہیں ہوں" اور انھوں نے پوری زندگی اسی قصبہ میں فقر و توکل، تجرید و تفرید، ذکر و عبادت اور ارشاد و تربیت میں گزار دی اور ۱۴ رشوال ۱۲۹۹ھ کو ۵۰ سال کی عمر میں سفرِ آخرت اختیار کیا اور وہیں اپنے خاند... قبرستان میں مدفون ہوئے، ان کے مناقب و فضائل کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔(۱)

مولانا عبدالشکور صاحب کے والد اپنے شیخ مولانا سید عبدالسلام صاحب کی عقیدت میں سرشار تھے، انھوں نے بچپن میں ان کی زیارت بھی کی تھی، اور مولانا ہی نے ان کی تسمیہ خوانی کرائی، مجھ سے کئی بار کہا کہ میرے ذہن میں حضرت کا حلیہ اس طرح مرتسم ہے کہ اگر میں مصور ہوتا تو ان کی ہو بہو تصویر کاغذ پر کھینچ دیتا، مولانا ان کی فنائیت و بے نفسی ان کی تواضع و خاکساری اور ان کی مقبولیت عند اللہ کے واقعات مزے لے لے کر بیان کرتے، اس وقت معلوم ہوتا کہ ان کے کام و دہن بھی اس سے لذت یاب ہو رہے ہیں، روایت کرنے میں بڑے محتاط تھے، وہ نپے تلے لفظ بولتے، حشو و زوائد کا ان کے یہاں کچھ کام نہ تھا، وہ مبالغہ اور تکلف سے مبرّا تھے، آج جن الفاظ میں جو روایت بیان کی دس برس بعد بھی تقریباً انھی الفاظ میں ان سے سن لیجیے گا، مولانا شاہ عبدالسلام کی عقیدت و عظمت کا ایسا غلبہ تھا کہ کسی بزرگ کا ان کے سامنے تذکرہ کیجیے اور کسی بات کو دریافت کیجیے وہ چند لفظ کہہ کر مولانا عبدالسلام صاحب کا ذکر چھیڑ دیتے ان کا حال اس بارے میں وہی تھا جو کسی عربی شاعر نے بیان کیا ہے۔

أعد ذكر نعمان لنا ان ذكره

هو المسك ما كرّرته يتضوع

میری پہلی زیارت ۱۹۲۷ء کی گرمیوں میں ہوئی، خاندانی تعلقات کی بنا پر یہ

---

(۱) مختصر تذکرہ نزہۃ الخواطر" جلد ہشتم میں دیکھا جا سکتا ہے، عزیز القدر مولوی محمد الحسنی نے ... لکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر ان کی ناگہانی وفات سے وہ تشنۂ تکمیل رہا۔

بات ہر طرح قرین قیاس ہے کہ اس سے پہلے کئی بار ان کو دیکھا ہو، لیکن اب حافظہ پر زور ڈالنے سے بالکل یاد نہیں آتا کہ اس سے پہلے ان کی زیارت ہوئی ہے، غالباً جون کا مہینہ تھا، خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی گرمی کی چھٹیوں میں جامعہ سے لکھنؤ اپنے رفیق درس ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے یہاں آئے ہوئے تھے، اسی زمانہ میں مَیں نے ان سے قرآن مجید کا کچھ حصہ پڑھا، انھوں نے بھائی صاحب سے مولانا عبدالشکور صاحب کی ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا، بھائی صاحب نے مجھے ان کے ساتھ کردیا، ہم دونوں پاٹانالہ گئے، وہاں ایک چھوٹی سی مسجد میں جو مولانا کے مکان کے قریب ہے عصر کی نماز کے بعد ملاقات ہوئی، جسم ولباس کسی سے نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ وہ مولانا عبدالشکور صاحب ہیں، جن کا لکھنؤ میں طوطی بولتا ہے، اور جن کی شہرت ہندوستان سے لے کر ایران تک پھیلی ہوئی ہے، اور جو اس وقت اپنے موضوع خاص میں حضرت شاہ عبدالعزیز اور مولانا حیدر علی فیض آبادی کے جانشین ہیں، تھوڑی دیر بیٹھ کر ہم لوگ واپس آگئے۔

پھر وہ زمانہ آیا کہ مولانا نے اہل سنت کو صحابہ کرام کے مقام، ان کے حقوق اور ان کے فضائل ومناقب سے واقف کرانے اور ان اثرات کو زائل کرنے کے لیے مواعظ کا سلسلہ شروع کیا، جو ہندوستان میں عہد مغلیہ کے دور آخر میں علی العموم اور نوابانِ اودھ کی سلطنت کے اثر سے لکھنؤ اور اس کے اطراف میں علی الخصوص اہل سنت کے ذہنوں، مزاجوں اور ان کے تمدن ومعاشرت میں داخل وجاری وساری ہوگئے تھے، ان مواعظ نے لکھنؤ اور اس کے اطراف میں اصلاح وانقلاب کا وہ کام کیا جو ان کے ان مناظروں نے اور مناظرانہ رسائل نہیں کیا، جن کی ہندوستان کے سنی حلقوں میں دھوم مچی ہوئی ہے، ان کے یہ مواعظ بڑے موثر اور دل پذیر ہوتے، نپے تلے الفاظ، سادہ زبان، مغز کی بات، اندرونی جذب، غرض کہ ''ہر چہ از دل می خیزد بر دل می ریزد'' کے مصداق، صحابہ کرام کے فضائل وحقوق بیان کرنے کے ساتھ مولانا قرآن مجید کے محفوظ اور غیر محرف ہونے اور اس کے اعجاز پر بھی روشنی ڈالتے، ان کی تقریروں میں نماز کی تبلیغ کا عنصر ضرور ہوتا، خدا ہی کو معلوم ہے کہ کتنے بندگان خدا کو ان

مواعظ سے نفع پہنچا اوران کی زندگیاں بدل گئیں، کم سے کم ہمارے شہر لکھنؤ میں حضرت سید احمد شہید کے دورہ ۱۲۳۴ھ کے بعد ایسی اصلاحی وانقلابی لہر نہیں آئی، چکمنڈی جو مولانا کے معتقدین کا خاص محلّہ ہے، چونکہ ہمارے محلّہ سے قریب تھا، اوردونوں محلوں میں ایک ہی (قریشی) برادری رہتی ہے، جو مولانا کی خاص طور سے حلقہ بگوش اوران کی تحریک ودعوت میں پیش پیش تھی، اس لیے مجھے ان اثرات کے مطالعہ کرنے اورمولانا کی شخصیت کی دلآویزی اورمواعظ کی دلپذیری سے واقف ہونے کا زیادہ موقع ملا۔

پھر وہ وقت آیا کہ لکھنؤ میں "مدح صحابہ" کی تحریک شروع ہوئی اور ۱۹۳۹ء میں مولانا حسین احمد مدنی صدر جمعیۃ العلماء اورشیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اس کی رہنمائی کے لیے لکھنؤ تشریف لائے اورہمارے ہی مکان پر قیام فرمایا، اس سلسلہ میں مولانا کی باربار زیارت ہوئی، اس معاملہ میں ان کا سوز دروں، جذب کامل اوران کا استغراق دیکھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو صحابہ کرام کے ذکر اورایک ایسے ماحول ومعاشرہ میں جو مختلف اسباب کی بنا پر ان کے حقیقی مقام سے نا آشنا ہوگیا تھا، اس کو روشن واجاگر کرنے کے لیے پیدا کیا ہے، اس کے سوا ان کی زندگی کا کوئی مقصد اورمشغلہ نہیں۔

مجھے مولانا کے ساتھ دو مرتبہ سفر کی سعادت بھی حاصل ہوئی، ایک مرتبہ وہ اپنے پیر بھائی اورمحبّ حاجی مشتاق علی خاں صاحب کی دعوت پر ان کے مدرسہ کے جلسہ میں شرکت کے لیے علی آباد ضلع بارہ بنکی تشریف لے جارہے تھے، میں بھی مدعو تھا، لکھنؤ سے علی آباد تک معیت کا شرف حاصل ہوا، علی آباد میں مَیں نے موقع پا کر مولانا سے دریافت کیا کہ کیا، حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے بارے میں انھوں نے کچھ سنا یا دیکھا ہے، میں اس زمانہ میں حضرت مولانا کا تذکرہ (۱) لکھ رہا تھا، مولانا نے چند جملے کہے اور پھر حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ہنسوی کا ذکر شروع کردیا، ایک مرتبہ دہلی تک معیت

---

(۱) یہ کتاب "تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی" کے نام سے مکتبہ ندوۃ العلماء سے شائع ہوئی اوراس کے کئی ایڈیشن نکلے۔

حاصل ہوئی، مولانا سونی پت کے کسی جلسہ میں تشریف لے جا رہے تھے، میں نے موقعہ غنیمت سمجھا، عرصہ سے تمنا تھی کہ مولانا عبدالشکور صاحب کبھی نظام الدین تشریف لے چلیں اور مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہو، اور اپنے زمانہ کی یہ دو عظیم المرتبت داعی جن کو اپنی اپنی دعوت میں پورا انہماک اور ان کی اہمیت وعظمت پر پورا یقین ہے ایک دوسرے سے ملیں، مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ مولانا سے پوری طرح واقف تھے، ان کے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری خود مولانا کا بڑا احترام کرتے تھے، اور ان کے قدر شناس تھے، امروہہ کے مناظرہ میں دونوں ایک جگہ جمع تھے، اور ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے، میں نے مولانا سے عرض کیا کہ سونی پت جاتے ہوئے آپ تھوڑی دیر کے لیے نظام الدین بھی تشریف لے چلیں اور مولانا محمد الیاس صاحب سے ملیں، مولانا ہمارے گھر کے بچہ بچہ کا بڑا لحاظ کرتے تھے، بارہا دیکھا ہے کہ لکھنؤ کے کوئی معزز شخص بیماری کے زمانہ میں آئے اور مولانا نے ملنے سے معذرت کر دی، لیکن ہمارے گھر کا یا ہنسوہ کے خاندان کا کوئی بچہ چلا گیا تو فوراً بلا لیا، اور بڑے اعزاز کے ساتھ ملے، مولانا نے میری درخواست منظور فرمائی، اس سفر میں میرے ساتھ مولانا محمد ناظم صاحب ندوی اور شاہ ہادی عطا مرحوم بھی تھے، مولانا کے پاس سکنڈ کلاس (اس زمانہ کا فرسٹ کلاس) کا ٹکٹ تھا، ہم لوگوں کے پاس تھرڈ کلاس کے ٹکٹ تھے، مولانا کو جب معلوم ہوا کہ ہم تھرڈ کلاس میں بیٹھے ہوئے ہیں، تو وہ تشریف لے آئے، اور کسی طرح راضی نہیں ہوئے کہ فرسٹ کلاس میں جائیں، ہر بار فرمایا کہ جہاں تم ہو وہاں میں، مجھے یاد ہے کہ رات بڑی بے آرامی سے گزری، سونے کا تو کیا ذکر لیٹنے کا بھی موقع بہت مشکل سے ملا لیکن مولانا خوش تھے، اور کوئی حرف شکایت زبان پر نہ آیا، دہلی پہنچے نظام الدین گئے، مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا کا بڑا اکرام فرمایا، اور ان کی آمد سے بہت خوش ہوئے، دونوں نے ایک دوسرے کی پوری رعایت کے ساتھ اپنے اپنے ذوق کی بات کہی جس پر جس چیز کا غلبہ ہوتا ہے، اس کا ضرور اظہار ہو جاتا ہے، کہ جام جب لبریز ہوتا ہے تو ہزار احتیاطوں کے باوجود چھلک پڑتا ہے۔

پھر وہ وقت آیا کہ مولانا محمد الیاس صاحب خود لکھنؤ تشریف لائے، مجھے یاد ہے

کہ دارالعلوم کی مسجد کے وضوخانہ میں وضو کرتے ہوئے، مولانا نے فرمایا کہ "مولانا عبدالشکور صاحب کا یہاں وہی درجہ ہے جو ہمارے اطراف میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا" مولانا نے دارالمبلغین میں مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کے رفقاء کی دعوت کی، مولانا بڑے شوق سے تشریف لے گئے، دعا کی درخواست کی گئی تو ان الفاظ سے دعا کا آغاز کیا کہ "أولیائی تحت قبائی لایعرفهم سوائی" جس سے اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مولانا کا جو مقام ہے، وہ سب کو معلوم نہیں، مولانا رحیم آباد کے عظیم تبلیغی اجتماع میں بھی جو مئی ۱۹۴۶ء میں ہوا تھا، شریک ہوئے اور تقریر بھی فرمائی، یوں بھی تبلیغی جماعت اور اس کے ذمہ داروں کے ساتھ ان کا معاملہ تعاون اور اکرام کا تھا۔

ایک مرتبہ مولانا رائے بریلی تشریف لے گئے، دائرہ کی مسجد میں مدح صحابہ کا کوئی جلسہ تھا، کچھ دیر کے لیے ہمارے مسکن دائرہ شاہ علم اللہ بھی تشریف لائے، میں نے مولانا کو وہ مرقع خطوط دکھایا جس میں حضرت مولانا سید عبدالسلام صاحب ہنسوی کے کئی درجن خط تھے، بعض خطوط میں جو ان کے والد ماجد کے نام تھے، ان کا ذکر خیر بھی تھا، بڑی خوشی سے مولانا نے یہ مکتوبات پڑھے اور ان خطوں کو دیکھا، جہاں ان کا ذکر خیر تھا۔

مولانا اپنے زمانہ کے مشہور مجدّدی شیخ حضرت پیر ابواحمد صاحب بھوپالی کے مرید و مجاز تھے، خانقاہ مجددیہ بھوپال اور اس کے صاحب سجادہ حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب سے ان کے نیازمندانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے، اور اس سلسلہ اور اس خانقاہ کی ہر چیز ان کی نظر میں عزیز و وقیع تھی، مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب بھی ان کا بڑا احترام کرتے اور بلند الفاظ میں ان کا ذکر کرتے، ایک مرتبہ فرمایا کہ "دینی چیزوں کی قدر اور ان کا احترام کوئی مولانا عبدالشکور صاحب سے سیکھے" ایک سفر حج کی واپسی پر وہ بھوپال اترے اور خانقاہ میں ٹھہرے، ہمارے یہاں "مُد" (۱) کا پیمانہ ہے، جو قدیم مدنی مد کے ناپ کا ہے، اور اس کی ہمارے یہاں سند بھی ہے، جو باقاعدہ سند حدیث کی طرح دی جاتی ہے، مولانا کی موجودگی میں ایک صاحب نے مجھ سے سند لی، مولانا خاموش بیٹھے سنتے رہے،

(۱) مُدِ مدنی ایک پیمانہ ہے جس میں تقریباً ۱۰ چھٹانک سوا تین تولہ آتا ہے۔

کچھ فرمایا نہیں، لکھنؤ جا کر کچھ دن قیام کر کے پھر بھوپال تشریف لائے، اور سند لینے کی خواہش ظاہر کی، میں نے کہا کہ آپ تو اس وقت موجود تھے، جب میں فلاں صاحب کو سند دے رہا تھا، آپ نے بھی اشارہ فرما دیا ہوتا تو اس سفر کی زحمت سے بچ جاتے، فرمایا نہیں اس وقت یہ بات ضمناً ہوتی، جو اس عظیم نعمت کے شایانِ شان نہیں تھی، اس کے لیے مستقل سفر کر کے آنے کی ضرورت تھی، میں اس وقت خاص اسی مقصد کے لیے آیا ہوں۔

حضرت شاہ صاحب مولانا کی بے نفسی کے واقعات بھی سناتے تھے، فرمایا کہ ایک مرتبہ میرے کہنے پر جمعہ کی نماز پڑھائی، سورہ والتین کے آخر میں بجائے "فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْن" کے "لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْن" پڑھ دیا، مقتدیوں میں ایک صاحب بڑے سادہ لوح اور جلد باز تھے، پوری طرح سے سلام بھی نہیں پھیرا تھا کہ پکار کر کہا صاحبو! ٹھہر جاؤ نماز دوبارہ ہوگی، مولانا نے میری طرف دیکھا اور فرمایا دوبارہ نماز پڑھاؤں؟ میں نے کہا آپ ان کی باتوں کا کچھ خیال نہ کریں، یہ بڑے بھولے آدمی ہیں، شاہ صاحب فرماتے تھے کہ مولانا ایسے جلیل القدر عالم اور "علم الفقہ" کے مصنف تھے، لیکن بے نفسی اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ یہ نہیں فرمایا کہ بھائی میں بھی کچھ پڑھا لکھا ہوں، نماز ہوگئی۔

مولانا کے طبعی ذوق اور اس کام نے جو حکمت الٰہی نے ان کے سپرد کیا تھا، ان کے علم اور سلوک پر پردہ ڈال رکھا تھا، مولانا بلند پایہ اور متبحر عالم تھے، انھوں نے بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ معقول و منقول کی کتابیں "فخر المتأخرین" مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے ممتاز و معتمد شاگرد مولانا سید عین القضاۃ حیدرآبادی لکھنوی سے پڑھی تھی، ان کے علمی پایہ کا اندازہ ان کے رسائل تفسیر اور علم الفقہ سے کسی قدر ہو سکتا ہے، علم الفقہ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو فقہ سے خصوصی مناسبت تھی، اور وہ اس پر گہری اور وسیع نظر رکھتے تھے، بعض اہل نظر اس کتاب کو بعض مشاہیر علماء کی مشہور و مقبول کتابوں کا ہم پلہ سمجھتے ہیں، اور بعض اس کو ترجیح دیتے ہیں، جہاں تک اثنا عشری لٹریچر سے واقفیت کا تعلق ہے، میرے خیال میں اس عہد میں ان کی کوئی نظیر نہ تھی، میں نے ایک مرتبہ بہت ذوق وشوق سے ان کو ڈاکٹر احمد امین کی کتاب "ضحیٰ الاسلام" کا وہ حصہ دیا جو مذاہب و فرق اسلامیہ پر مشتمل ہے، انھوں نے

فرقہ امامیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کی اس وقت مصر و عراق میں دھوم مچی ہوئی تھی، میں سمجھا کہ مولانا اس کو پڑھ کر مصنف کی وسعت نظر اور مطالعہ کی داد دیں گے، لیکن مولانا نے یہ کہہ کر کتاب واپس کی کہ کوئی خاص بات نہیں ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے وہ ضرور قائل تھے، اور منہاج السنہ کی تعریف کرتے تھے کہ "مطاعن صحابہ کی تردید میں یہ کتاب خاص طور پر ممتاز ہے، اس بارے میں ان کی نظیر ملنی مشکل ہے"۔

تصوف کا اثر کہئے یا مولانا کی سلامت طبع اور حقیقت پسندی کہ فرقہ اثنا عشریہ سے طویل مناظرہ کے باوجود حضرت علی مرتضیٰؓ اور امیر معاویہؓ کے بارے میں انھوں نے ہمیشہ فرق مراتب کا لحاظ رکھا، وہ بڑے جوش کے ساتھ حضرت علیؓ کی فضیلت و منقبت بیان کرتے تھے، ان کا نام لیتے وقت معلوم ہوتا تھا کہ ان کا دل ان کی عقیدت و عظمت سے معمور بلکہ مخمور ہے، اہل بیت کرام کے بھی پورے مرتبہ شناس اور ان کی محبت میں سرشار تھے، مولانا نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی معرکۃ الآراء کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" کا فارسی میں اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی بے نظیر کتاب "ازالۃ الخفاء" کا اردو میں ترجمہ بھی کیا، میں نے کئی معتبر آدمی سے سنا ہے کہ مرزا حیرت دہلوی کے نام سے جو ترجمہ قرآن مشہور ہے وہ اصلاً مولانا ہی کا لکھا ہوا ہے۔

مولانا فراغت کے بعد کچھ عرصہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جو اس وقت نیا نیا قائم ہوا تھا، مدرس بھی رہے، اور نہایت قلیل تنخواہ پر یہ خدمت انجام دی، آخری حیات میں وہ مسلسل ندوۃ العلماء کے رکن انتظامی منتخب ہوتے رہے، ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید ڈاکٹر عبدالعلی صاحب سے بالکل عزیزانہ اور خاندانی قسم کے تعلقات تھے، ڈاکٹر صاحب کی نماز جنازہ بھی انھی نے پڑھائی۔

آخر میں ۱۷/ ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ مطابق (۲۳/ اپریل ۱۹۶۲ء) کو پانچ مہینے کی علالت کے بعد اپنے خالق سے جا ملے، اور امید ہے کہ اپنی دینی خدمات کی بدولت اور مقام رسالت، مقام قرآن اور مقام صحابہ کو روشن اور اجاگر کرنے کے صلہ میں مقام قرب و رضا سے نوازے گئے ہوں گے، امین آباد پارک میں ایک مجمع کثیر نے ان کی نماز جنازہ پڑھی، ان کے بڑے فرزند مولانا عبدالسلام صاحب فاروقی نے امامت کی، لکھنؤ میں کسی کے جنازہ میں اتنا ازدحام کم دیکھا گیا ہوگا۔

□□□

شیخ محمد بہجۃ البیطار

میری طالب علمی کا آخری زمانہ اور معلمی کا ابتدائی عہد تھا کہ شیخ محمد بہجۃ البیطار دمشقی (جن کے نام کے ساتھ بے تکلف علامہ کا لقب لگانے کو جی چاہتا ہے) کا نام اس طرح سننے میں آنے لگا جیسے پچھلی صدی کے ممتاز ترین عالموں کا نام لیا جاتا ہے، اس نام کے دو عالم بیک وقت بلاد عربیہ میں موجود تھے، ایک شام میں شیخ محمد بہجۃ البیطار دوسرے عراق میں شیخ محمد بہجۃ الاثری دونوں متبحر عالم، دونوں علوم عربیت اور زبان وادب میں سند کا درجہ رکھنے والے، دونوں نہایت صحیح وفصیح عربی لکھنے اور بولنے والے، دونوں اپنے وقت کے جید اساتذہ اور ائمہ فن کے شاگرد، ایک (اول الذکر) علامۂ وقت شیخ عبدالرزاق البیطار، استاذ العصر علامہ سید خضر حسین تونسی اور فخر شام علامہ جمال الدین القاسمی کے شاگرد، دوسرے (ثانی الذکر) فخر عراق علامہ خیرالدین نعمان آلوسی صاحب ''بلوغ الأرب'' کے شاگرد تھے، اس وقت کیا معلوم تھا کہ جن کا نام اس طرح سنتا اور رسالوں میں دیکھتا ہوں، جیسے دور سے افق پر طلوع ہونے والے ستارے کو دیکھا جاتا ہے، ان سے نہ صرف ملاقات میسر ہوگی، بلکہ ان کے ساتھ کمیٹیوں میں کام کرنے اور علمی وادبی مباحث پر تبادلۂ خیال کرنے کی عزت بھی حاصل ہوگی۔

۱۳۵۴ھ، ۱۹۳۵ء میں علامہ سید رشید رضا کا انتقال ہوا، ان کے انتقال کی خبر کے ساتھ یہ بھی شائع ہوا کہ وہ اپنی شہرۂ آفاق ''تفسیر المنار'' میں آیت ''رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِىْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِىْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ، فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِىْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ'' تک پہنچے تھے کہ روح نے قفص

عنصری سے پرواز کی، اہل علم کو اس عظیم تفسیر کے نامکمل رہ جانے کا بڑا قلق ہوا، کچھ دنوں کے بعد یہ خبر آئی کہ علامۂ مرحوم کے تلامذہ اور معتقدین نے اس کی تکمیل اور رسالہ "المنار" کی ادارت کا کام علامہ محمد بہجۃ البیطار کے سپرد کیا ہے، اور انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے(۱)، عام طور پر اس انتخاب کو پسند کیا گیا، اور لوگوں نے کہا کہ "حق بحقدار رسید" میری نگاہ میں اس سے علامۂ موصوف کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی کہ ع

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

جنوری ۱۹۵۰ء میں قیام حجاز کے دوران جب میں نے مصر و شام کے سفر کا ارادہ کیا تو حجاز کے مشہور رئیس عالم اور فخر جدہ شیخ محمد نصیف سے عرض کیا کہ شام کے ممتاز علماء اور فضلاء کے نام تعارفی خط لکھ دیں، انھوں نے شیخ محمد بہجۃ البیطار کے نام خط لکھ کر عنایت فرمایا۔

میرا قیام مصر میں تقریباً چھ مہینے رہا، لیکن میں نے اس خط کو حرز جان بنائے رکھا، ۲۰ ررمضان المبارک ۱۳۷۰ھ (۲۵ رجون ۱۹۵۱ء) کو دمشق پہنچا، اگلے ہی دن شیخ سے ملنے کے لیے سراپا شوق بنا ہوا میدان (فوقانی) پہنچا جو دمشق میں علماء کا محلّہ ہے، اور اس کی وہاں وہی حیثیت ہے، جو ہمارے یہاں لکھنؤ میں فرنگی محل کی ہے(۲) معلوم ہوا...... کہ وہ محلّہ کی مسجد "جامع الدقاق" میں نماز پڑھتے اور جمعہ کا خطبہ دیتے ہیں، اور وہیں ان کا روزانہ کا درس ہوتا ہے، ایک مرتبہ گیا تو وہ نہیں ملے، اگرچہ رمضان کا زمانہ تھا، لیکن شوق نے اجازت نہ دی، دوبارہ گیا، معلوم ہوا کہ کسی جنازہ میں گئے ہوئے ہیں، محلّہ کے ایک دیندار بزرگ نے دعوت دی کہ انتظار کا یہ وقت ان کے مکان میں گزارا جائے، ان کا مکان شیخ کے مکان کے بالکل بالمقابل تھا، وہ جس وقت بھی آئیں گے، معلوم ہو جائے گا، وہیں روزہ افطار کیا

---

(۱) معلوم ہوا ہے کہ علامۂ موصوف نے سورہ یوسف تک کی تفسیر کی حد تک اس کام کو مکمل کر دیا، اور کتاب اسی زمانہ میں مصر سے شائع ہوگئی، موصوف نے علامہ رشید رضا کی دوسری اہم لیکن ناتمام کتاب "المعاملات فی الاسلام و تحقیق ماورد فی الربا" کی بھی تکمیل کی اور اپنے مقدمہ و خاتمہ کے ساتھ اس کو شائع کیا۔

(۲) دمشق کے اکثر علماء اسی محلّہ کے رہنے والے تھے، مثلاً شیخ ابوالخیر میدانی، شیخ حسن الحبنکہ، شیخ عبدالرزاق البیطار، الشیخ بہاؤ الدین البیطار، اول الذکر شیخ بہجۃ البیطار کے نانا ثانی الذکر ان کے والد تھے۔

اور کھانا کھایا، مگر شیخ سے ملاقات نہ ہوسکی، اور ہم لوگ بے نیلِ مرام واپس آئے۔

اسی دن پارلیمنٹ میں ایک بڑا ہنگامہ خیز مباحثہ ہونے والا تھا، شام کا دینی عنصر خصوصیت سے تحریک اخوان المسلمین سے تعلق رکھنے والے چاہتے تھے کہ طبقۂ علماء سے تعلق رکھنے والے افراد زیادہ سے زیادہ تعداد میں گیلری میں نظر آئیں، اور شامی کابینہ کے ارکان وممبران پارلیمنٹ یہ محسوس کریں کہ اس مسئلہ کا تعلق ملک کی دینی واخلاقی حالت اور عام مسلمانوں کے احساسات وجذبات سے کس قدر گہرا ہے، ان لوگوں نے میرے لیے بھی (Visitor) کے ایک پاس کا انتظام کردیا، اور میں بھی وہاں پہنچ گیا، گیلری میں دمشق کے تقریباً تمام ممتاز علماء اور مشائخ موجود تھے، وہاں سے فارغ ہوکر جب باہر نکلا تو شیخ سے جو گیلری میں تشریف رکھتے تھے، پہلی ملاقات ہوئی، جمال وتناسب اعضاء میں ڈھلا ہوا جسم، میانہ قد، شامیوں کی طرح گورا رنگ جس میں سرخی جھلکتی ہوئی، صاف ستھرا علماء کا لباس، سر پر ترکی ٹوپی اور لقہ جو مشرق وسطیٰ میں علماء کا شعار ہے، بڑی بشاشت وخندہ جبینی سے ملے، جیسے پرانی ملاقات ہو، غائبانہ کتابوں کے ذریعہ واقفیت تھی، جن میں "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" سب سے نمایاں تھی، اگلے دن اپنے گھر پر ملاقات کی دعوت دی، ۲۷ رجون ۱۹۵۱ء کو ان کے گھر پر ان سے مفصل ملاقات ہوئی، منھ سے پھول جھڑنا جسے کہتے ہیں وہ ان پر صحیح معنی میں صادق آتا تھا، میں نے ابھی تک چار آدمیوں کو ہمیشہ صحیح اور فصیح عربی بولتے ہوئے سنا ہے، جو اگر لفظ بلفظ لکھ لی جائے تو اس میں ذرا تغیر وتبدل کی ضرورت نہ ہو، کہا جاسکتا ہے کہ وہ اوائل عہد عباسی کی منجھی ہوئی زبان ہے، ایک یہ دونوں ہم نام بہجۃ البیطار اور بہجۃ الاثری تیسرے ہمارے استاد ڈاکٹر تقی الدین الہلالی، چوتھے ملک عبداللہ بن حسین سلطنت ہاشمیہ اردنیہ کے بانی وسربراہ، گلفشانی کے ساتھ سبک روحی وسبک جانی، زندہ دلی اور شگفتگی بات بات سے عیاں جس میں ظرافت کی ہلکی چاشنی ملی ہوئی، تفسیر، حدیث، نحو وادب اور تاریخ ہر میدان کے شہسوار، ان میں سے جس مسئلہ پر گفتگو کرتے، یہ معلوم ہوتا کہ معلومات کا ایک دفتر ان کی آنکھوں کے سامنے کھلا

ہوا ہے، ہر چیز مستحضر، امام ابن تیمیہ کا ذکر چھڑا اور مشہور سیاح ابن بطوطہ کی اس مشہور روایت کا تذکرہ آیا کہ ''امام ابن تیمیہ نے ایک مرتبہ اس کے سامنے اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزول کی تشریح کرتے ہوئے جامع دمشق میں خطبہ دیتے ہوئے ایک زینہ سے دوسرے زینہ پر قدم رکھا اور کہا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نزول فرماتا ہے، شیخ نے فرمایا کہ اس روایت کے بے اصل ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ جب ابن بطوطہ دمشق پہنچا ہے تو امام اس وقت جیل میں تھے، پھر تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ کبھی جامع اموی کے خطیب نہیں رہے، ان ایام میں شیخ جلال الدین قزوینی جامع اموی کے خطیب تھے۔

اسی روز ان کی معیت ورفاقت میں شام کی مشہور عالم اکیڈمی المجمع العلمی (جس کا نام اب مجمع اللغۃ العربیۃ ہے) کی زیارت کی، طالب علمی کے زمانہ سے اس کا نام عزت وعظمت کے ساتھ سنا کرتا تھا، اس کی رکنیت کسی فاضل ومحقق کے لیے بڑے اعزاز کی بات اور ایک طرح کی علمی سند سمجھی جاتی تھی، میری طالب علمی اور مدرسی کے زمانہ میں ہمارے ملک (غیر منقسم ہندوستان) کے دو فاضل اس کے اعزازی ممبر تھے، ایک علامہ عبدالعزیز میمن دوسرے مسیح الملک حکیم اجمل خاں، یہ رکنیت حین حیاتی ہوتی ہے، اور صدر جمہوریہ اس کی منظوری دیتا اور سند عطا کرتا ہے، مشرق وسطیٰ کے مشہور صاحب طرز ادیب اور مصنف علامہ کرد علی اس وقت اس کے صدر اور مشہور شاعر ومحقق استاذ خلیل مردم بک اس کے سکریٹری تھے، ارکان میں مشہور محقق وادیب علامہ عبدالقادر مغربی، شیخ محمد بہجۃ البیطار، اور باہر کے لوگوں میں ڈاکٹر طہٰ حسین، ڈاکٹر احمد امین، عباس محمود العقاد وغیرہ اور یورپ کے نامور مستشرقین اس کے ارکان تھے، اکیڈمی اس تاریخی عمارت میں تھی جو تاریخ میں مدرسہ عادلیہ(۱) کے نام سے مشہور ہے، اور جہاں ''الفیہ نحو'' کے شہرۂ آفاق مصنف ابن مالک، ''وفیات الاعیان'' کے عظیم مصنف ابن خلکان اور ''مقدمہ'' کے نامور مصنف ابن خلدون اپنے اپنے وقت میں ٹھہرے ہیں، وہاں جو ارکان موجود تھے، شیخ نے ان سے تعارف کرایا،

(۱) سلطان صلاح الدین ایوبی کے فرزند الملک العادل کے نام سے منسوب۔

تھوڑی دیر علمی مجلس رہی، پھر مکتبہ ظاہریہ میں آئے جس کا قدیم مخطوطات میں دنیا کے ممتاز ترین کتب خانوں میں شمار ہے، یہ عمارت خود بڑی تاریخی ہے، اس میں سلطان الظاہر بیبرس کی قبر ہے، جس نے پہلی مرتبہ تاتاریوں کو شکست دی تھی، اور بڑی شان وشوکت سے عرصۂ دراز تک مصر وشام پر حکومت کی ہے، شیخ نے اس کتاب خانہ کے خاص خاص نوادرات دکھائے، اور بتایا کہ اس میں کیسے کیسے علم کے موتی اور اسلاف کے وہ گراں بہا تبرکات اور متروکات ہیں، جنھوں نے ابھی تک باہر کی روشنی نہیں دیکھی۔

مکتبہ ظاہریہ سے نکل کر ہم اسلام کے اس شیر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وفادار غلام کی قبر پر آئے جس نے تاریخ اسلام کے نازک ترین وقفہ میں مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ اسلام کی عزت وآبرو رکھ لی، روح مبارک نبوی کی خوشنودی کا باعث بنا اور صدیوں تک کے لیے مشرق وسطیٰ اور عالم اسلام کو فرنگی ''تاتاریوں'' اور صلیبی ''مجاہدوں'' کی یلغار سے محفوظ کر دیا اور صرف اپنی شمشیر کی خارا شگافی ہی نہیں اپنے اخلاق وانسانیت کی دل نوازی کا سکہ بھی بیٹھا دیا، یعنی سلطان صلاح الدین ایوبی، اللہ کی لاکھوں کروڑوں رحمتیں ہوں، اس کے جسد خاکی اور مرقد افلاکی پر۔

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زبان کے لیے

کچھ دیر ایک بڑے مؤرخ کے پہلو میں کھڑے ہو کر، ماضی وحال کا مقابلہ کرتا رہا اور اسی شہر کے شاعر ومؤرخ خیر الدین الزرکلی کا یہ شعر پڑھتا رہا۔

هاتي صلاح الدين ثانية فينا
وجددي حطين أو شبه حطينا(۱)

معلوم ہوا کہ جب فرنچ جنرل گورو فاتحانہ دمشق میں داخل ہوا تو اس شیر اسلام کی

---

(۱) اے امت پھر صلاح الدین کو دوبارہ ہم میں پیدا کر اور معرکہ حطین کو (جس نے صلیبی حملہ آوروں کی کمر توڑ دی تھی) کو تازہ کر دیا، اس کا کوئی نمونہ ہی دکھا۔

قبر پر بھی آیا، پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور بڑے تکبر کے ساتھ کہا کہ "لو صلاح الدین ہم یہاں تک آگئے اور ہم نے شام فتح کرلیا، تم کب تک سوتے رہو گے؟"

صلاح الدین کے مرقد مبارک سے ہم لوگ جامع اموی میں داخل ہوئے، ظہر کی نماز پڑھی، وہاں کچھ دیر قبۃ النسر کے نیچے جہاں سرآمد روزگار علماء ہی درس دے سکتے تھے، کھڑے ہوکر برکۃ الشام "آیة من آیات اللّٰہ" علامہ بدرالدین حسنی کا ذکر خیر سنتے رہے، ان کا علمی تبحر، تدریس سے عشق، دنیا سے بے تعلقی، ان کا دائم الصوم ہونا، اور اپنے قابل فخر و صاحب اقتدار فرزند سید تاج الدین حسنی وزیر اعظم شام سے بھی استغنا اور زہد کا معاملہ کرنا، ان کا ذوقِ عبادت اور تقدس و معصومیت اور ان کی عام محبوبیت و وجاہت ان کا محض اپنے حفظ و استحضار سے بخاری و مسلم کا درس دینا، دیر تک یہ دلآویز و عطر بیز ذکر جاری رہا، پھر ہم دارالحدیث النوریہ میں آئے، جہاں شارح مسلم امام نووی درس دیتے تھے، اور جہاں شیخ تقی الدین السبکی اس تمنا میں جگہ جگہ سجدہ ریز ہوتے کہ شاید ان کی پیشانی ایسی جگہ پڑ جائے جہاں امام نووی کے قدم پڑے ہیں۔

اگلے دن شیخ خود ہوٹل آکر ملے، جب تک بیٹھے رہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بلبل چہک اور علم و ادب کا ایک باغ کا باغ مہک رہا ہے ع

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

پھر تو بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں، اور دمشق کے قیام کا کم وقفہ ایسا گزرا کہ ان سے نیاز نہ حاصل ہوا ہو۔

یکم جولائی ۱۹۵۱ء کو دمشق کو عارضی طور پر خیرباد کہا اور بیت المقدس کا رخ کیا، قدس، الخلیل اور عمان ٹھہرتے ہوئے اور بیت المقدس میں رمضان کا آخری دن گزار کر اور عید کی نماز پڑھ کر دو ہفتے کے بعد پھر دمشق واپسی ہوئی، اور پھر دمشق کے علماء و احباب سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا، جن میں سرحلقہ شیخ محمد بہجۃ البیطار ہی تھے، مجھے ۲۳ رجون کو دمشق یونیورسٹی کے ہال میں فلسطین کے موضوع پر تقریر کرنی تھی، میں نے اپنا مضمون تیار کرلیا تھا،

مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میرا عربی زبان وادب سے کیسا ہی اشتغال ہو، میں بہرحال عجمی نژاد ہوں، میری ساری تعلیم عربی زبان کے مرکز سے دور ہندوستان کے ایک خطہ میں ہوئی ہے، نطق وادا میں عربی زبان کا معاملہ بڑا نازک ہے، ہر شخص کا کام نہیں کہ اس کی نوک پلک درست رکھے، اور کہیں غلطی یا لحن نہ ہو، کتنے الفاظ ہیں، جو ہم عجمیوں کی زبان پر غلط چڑھے ہوئے ہیں، جن حروف کو متحرک پڑھنا چاہیے ان کو ساکن پڑھتے ہیں، جن کو ساکن پڑھنا چاہیے، ان کو متحرک، صرف اعراب ہی کا معاملہ نہیں، جس کا محل لفظ کا آخری حرف ہوتا ہے، اور بھی نازک مراحل پیش آتے ہیں، میں نے مناسب سمجھا کہ فضلاء واعیان کے ایک منتخب مجمع کے سامنے اپنا مضمون پڑھنے سے پہلے شیخ کو ایک مرتبہ یہ مضمون پڑھ کر سنا دوں، اور ان سے درخواست کروں کہ وہ جہاں غلطی محسوس کریں بے تکلف ٹوک دیں، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ میں جامعۂ دمشق میں مضمون پڑھنے والا ہوں، آپ ہمارے استاذ ومربی مولانا سید سلیمان ندوی کے دوست اور ہمارے اساتذہ کی صف میں ہیں، آپ پہلے سن لیں تا کہ میں اطمینان سے جلسۂ عام میں مضمون پڑھ سکوں، شیخ نے اپنی کریم النفسی واخلاق وتواضع سے معذرت کی اور کہا کہ اس کی ہرگز ضرورت نہیں ہے اور میں اپنا یہ مقام نہیں سمجھتا، میں نے اصرار کیا تو وہ بمشکل تیار ہوئے، میں نے پورا مضمون پڑھ کر سنایا(۱) الحمد للہ کہیں ان کو ٹوکنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، مضمون سننے کے بعد فرمایا، شہروں اور ملکوں کے نام پر ال داخل کرنے میں غیر عرب علماء بڑی غلطی کرتے ہیں، تم نے اس بارے میں بڑی احتیاط کی ہے، اس پر لطیفہ سنایا کہ ایک ہندوستانی عالم نے مکہ مکرمہ میں اپنے کسی عرب دوست سے کہا کہ "أنا أذهب من المكة إلى مدينة فهل لك حاجة (أو كما قال) انھوں نے مدینہ پر ال داخل کرنے کے بجائے مکہ پر داخل کر دیا، جو غیر منصرف ہے، اور اس پر ال نہیں آتا، ان عرب فاضل نے جواب دیا کہ میرا صرف اتنا کام ہے کہ آپ مکہ

---

(۱) یہ مضمون "العوامل الأساسية فى كارثة فلسطين" کے عنوان سے علیحدہ رسالہ کی شکل میں، پھر فلسطین سے متعلق میرے مجموعہ مضامین "المسلمون وقضية فلسطين" میں شائع ہو چکا ہے۔

کے سر سے ال اٹھا کر لے جائیں اور مدینہ چھوڑ آئیں، شیخ کو ایسے بہت سے لطائف یاد ہیں، اس لیے ان کی مجلس باغ و بہار ہوتی تھی۔

۲۴/ جولائی کو دمشق کے فضلاء و اعیان، ممبران پارلیمنٹ اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی میں میرا لکچر ہوا، ہال بھرا ہوا تھا، شیخ نے میرا تعارف کرایا، اور اس سلسلہ میں ہندوستان کے علماء کی عربی زبان سے دلچسپی، ان کے علمی شغف، اور تصنیفی و تحقیقی خدمات کا تذکرہ کیا، ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی (اخوان المسلمین کے نگراں اور صدر) کے تبصرہ اور آخری تقریر کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

دمشق کے قیام میں شیخ سے برابر رابطہ قائم رہا، دمشق چھوڑا تو برسوں شیخ سے ملاقات نہیں ہوئی، لیکن تحریری طور پر رابطہ قائم رہا، ان کے متعدد گرامی نامے جوان کی محبت و تعلق اور عربی ادب و انشاء کا ایک نمونہ ہیں، ہمارے مرقع خطوط کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی مساعی سے جن کی معرکۃ الآراء کتاب "السنہ و مکانتها فی التشریع الاسلامی" علماء عرب و عجم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے، دمشق یونیورسٹی میں "کلیۃ الشریعۃ" (شریعت کالج) کا اضافہ ہوا، جو اس وقت شام کے مخصوص حالات میں علمی و دینی حلقہ میں ایک بڑی کامیابی سمجھی گئی، ڈاکٹر سباعی مرحوم نے راقم سطور کو بھی اس کے تعلیمی اسٹاف میں داخل ہونے کی دعوت دی، میں نے مستقل تعلق سے تو معذرت ظاہر کی لیکن استاذ زائر (وزیٹنگ پروفیسر) کی حیثیت سے کسی علمی و دینی موضوع پر طلبہ کے سامنے خطبات کا ایک سلسلہ شروع کرنے کی ذمہ داری لی، ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کو بڑی خوشی سے منظور کیا، اور صدر جمہوریہ شام عالی مرتبت شکری القوتلی کی طرف سے تقرر کا پروانہ بھجوادیا، شعبان ۱۳۷۵ھ سے ۱۹/ شوال ۱۳۷۵ھ تک ان خطبات کا سلسلہ جاری رہا(۱) بیچ میں رمضان بھی پڑا، خطبات مغرب و عشاء کے

---

(۱) ان خطبات کا مجموعہ "رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام" کے نام سے پہلی مرتبہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوا، اب تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

درمیان ہوتے تھے، لیکن شیخ اور دمشق کے اہل علم اور اہل ذوق بڑی پابندی سے اس میں شریک ہوتے رہے، خطبات کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد بھی میں دمشق میں ٹھہرا، شیخ سے برابر رابطہ قائم رہا، شیخ اس وقت یونیورسٹی میں تفسیر کے استاذ تھے، اور یونیورسٹی کے حلقہ میں اور باہر ان کا بڑا احترام تھا، شیخ کی معیت میں دمشق کی بہت سی اہم شخصیتوں سے ملنا ہوا، وہ اکثر ایسی علمی مجلسوں میں میرے ساتھ تشریف لے جاتے تھے، اور برابر اپنی علمی تحقیقات اور ادبی نکتوں سے اہل مجلس کو مستفید اور محظوظ فرماتے تھے۔

۱۹۵۶ء کے بعد سے مسلسل پانچ سال دمشق کی حاضری سے محرومی اور شیخ سے جدائی رہی۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ۱۹۶۲ء میں مدینہ طیبہ میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا، اس کی مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لیے ہندوستان سے میرا اور شام سے شیخ بہجۃ البیطار، عراق سے شیخ بہجۃ الاثری اور مختلف ملکوں سے مختلف ماہرین تعلیم اور یونیورسٹیوں اور دانشگاہوں کے سربراہوں کا انتخاب ہوا، برسوں کے بعد ہم بچھڑے ایک دوسرے سے ملے، کمیٹی میں اکثر وہ میرے نقطۂ نظر کی تائید فرماتے، کبھی شیخ بہجۃ الاثری کوئی بات کہتے جن سے ان کو اختلاف ہوتا تو فرماتے کہ محمد بہجۃ کا جواب محمد بہجۃ دیتا ہے، جوارِ رسول میں یہ مبارک دن، جو علمی و دینی مشاغل اور تذکروں سے معمور تھے، بڑے اچھے گزرے، ان کی یادیں دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہیں۔

پھر اس کے بعد ان سے ۱۹۶۵ء میں اس وقت ملاقات ہوئی جب یورپ کی سفر سے واپسی میں تین دن کے لیے دمشق ٹھہرا، وہی تر و تازہ اور نورانی چہرہ، وہی پُر بہار اور زعفران زار مجلس، وہی معلومات کا دریا موجیں مارتا ہوا، مجلس سے اٹھنے کو جی نہ چاہے اور جب تک مجلس جاری ہو ایک منٹ کے لیے خاموشی گوارا نہ ہو، غرض اردو کا یہ شعر ہر طرح سے برمحل وحسب حال ہے

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں

۱۹۶۵ء کی ملاقات کے بعد پھر ملاقات میسر نہ آئی، ۱۹۷۳ء میں جب رابطہ کے وفد کے ساتھ دمشق جانا ہوا تو صرف ڈیڑھ دن قیام رہا، قبل اس کے کہ مخصوص احباب اور بزرگوں سے ملاقات ہو، نصف شب میں ڈرامائی طریقہ پر وفد کو سرحد پار کردیا گیا، جمادی الثانیہ ۱۳۹۶ھ کی کسی تاریخ کو عزیزی قاضی فاروق ندوی کا (جو دمشق میں استفادہ علمی کے لیے مقیم تھے) خط آیا کہ یکم جمادی الثانیہ ۱۳۹۶ھ کو علمائے سلف کی یہ یادگار اور فخر روزگار علامہ بہجۃ البیطار سفر آخرت پر روانہ ہوگیا، اور علمی وادبی دنیا میں ایک ایسا خلا چھوڑ گیا، جس کا بظاہر حالات عرصہ دراز تک پُر ہونا نظر نہیں آتا۔

یہاں نہ ان کے حالات لکھنے مقصود ہیں، اور نہ ان کی تحقیقات وتصنیفات پر تبصرہ پیش نظر ہے، اس کے لیے قارئین کو ان کے شاگرد رشید استاذ محمد راتب النفاخ کا وہ مفصل مضمون دیکھنا چاہیے جو انھوں نے "مجمع اللغة العربية" کے لیے اپنی رکنیت کے انتخاب کے موقع پر پڑھا تھا، اور اکیڈیمی کے مجلّہ میں محرم ۱۳۹۸ھ (جنوری ۱۹۷۸ء) میں شائع ہوا، یہاں پر تو "پرانے چراغ" کے اسلوب اور دائرہ کے اندر رہ کر چند نقوش وتأثرات ہی کا ذکر کرنا تھا، جو اب میرے لیے سرمایۂ فخر ہیں۔

□□□

مولانا عبدالعزیز میمن

مولانا عبدالعزیز میمن کا نام جہاں تک یاد ہے سب سے پہلے اپنے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب سے سنا جو اورینٹل کالج لاہور میں ان کے ساتھ تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، اور جو ادب ولغت عربی میں ان کے ہم مذاق اور الفاظ کی صحت و تحقیق، عربی اشعار و قصائد کے حفظ میں (سن وسال کے تفاوت کے ساتھ) رفیق و شریک تھے، اس واقفیت کی تاریخ ۱۹۲۶ء سے شروع ہو جاتی ہے، جب میرے علم و تاریخی شعور نے پر و بال نکالنے شروع کر دیئے تھے، اور کچھ اچھا برا سمجھنے لگا تھا، عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب مولانا میمن کا تذکرہ اس انداز سے کرتے تھے کہ اس میں ان کے علم و فضل کا اعتراف بھی تھا، اور کچھ ان کے اپنے علم و محنت کے (ضرورت سے زائد) احساس و خود اعتمادی پر ہلکی سی معاصرانہ و رفیقانہ تنقید بھی، میرے نزدیک یہ ہر ایسے صاحب فضل و محقق کی طبیعت کا خاصہ ہے جو اپنے معاصرین سے واضح طریقہ پر فائق ہو اور جس کی دنیا علم و تحقیق کے اندر محدود اور اہل قلوب و تزکیہ نفس کے استاذوں کے حلقہ سے دور ہو، اس زمانہ میں عربی لغت و ادب کے دو عالموں کا ساتھ نام سنتا تھا، جو اس میدان کے شہسوار اور ایک دوسرے کے ہم پلّہ مانے جاتے تھے، واقفین حال میں سے بعض اصناف ادب و لغت میں کسی کو ترجیح دیتے تھے اور بعض کسی کو، یہ دونوں وطنی طور پر بھی ایک دوسرے کے قریب، استادوں میں بھی ایک دوسرے کے شریک اور مسلک (عمل بالحدیث) میں بھی متفق تھے، ان میں ایک مولانا عبدالعزیز میمن تھے، دوسرے ابو عبداللہ مولانا محمد سورتی، سورتی صاحب کی زیارت تو جلد میسر آ گئی، اس لیے کہ وہ ہمارے استاد مولانا خلیل عرب صاحب کے دوست تھے، لکھنؤ

آتے اور کئی کئی دن ان کے ہاں ٹھہرتے، ٹونک میں ان کی شادی ہوئی تھی، جو ہمارے اعزہ کا وطن اور ایک خاندانی مسکن تھا، مولانا میمن اورینٹل کالج کے تعلق سے زیادہ تر لاہور رہتے تھے، مئی ۱۹۲۹ء میں جب میرا لاہور کا پہلا سفر ہوا تو وہ ترک تعلق کر کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستہ ہو چکے تھے، قرب مکانی اور گوناگوں تعلقات کے باوجود میرا عرصہ تک علی گڑھ جانا نہیں ہوا، البتہ عربی ادب کے ادنی طالب علم اور اس کا شیدائی ہونے کی وجہ سے ان سے ایک قرب و مناسبت محسوس ہوتی تھی، اس وقت ہندوستان میں ''المجمع العلمی العربی'' دمشق کے دو ہی رکن تھے، ایک حاذق الملک حکیم اجمل خاں، دوسرے مولانا عبدالعزیز میمن، شام کی اس علمی اکیڈیمی کو مشرق وسطیٰ میں...... اولیت اور بعض حیثیتوں سے بڑی اہمیت حاصل تھی، اس کے بانی اور مستقل صدر شام کے مشہور فاضل وادیب علامہ کرد علی تھے، اس کی رکنیت بہت بڑا علمی اعزاز سمجھا جاتا تھا، جو نامور اور سر برآوردہ یورپین مستشرقین اور گنے چنے مشرقی فضلاء وادباء کو حاصل تھا، مولانا میمن کے مضامین بڑے آب و تاب کے ساتھ المجمع العلمی کے سہ ماہی رسالہ میں شائع ہوتے تھے، وہ زیادہ ترفنی و تحقیقی ہوتے تھے، جو میرے سن و ذوق کے لحاظ سے کسی قدر خشک اور غیر دلچسپ ہوتے۔

مولانا سے براہ راست علمی و کتابی تعارف ان کی شاہکار تصنیف "أبو العلاء وما إليه" کے ذریعہ ہوا، میں بھی ابوالعلاء المعری کے مداحوں میں تھا، اس کا دیوان "سقط الزند" میں نے خلیل عرب اور مولانا عبدالحلیم صدیقی مرحوم سے بڑی محنت سے پڑھا تھا، اور اس کا بڑا حصہ زبانی یاد اور مستحضر تھا، جس کا نتیجہ تھا کہ جب مولانا کا رسالہ "فائت شعر أبی العلاء" (۱) نکلا تو میں نے اس پر استدراک کیا اور الضیاء کے ایک مضمون کے ذریعہ ان کی خدمت میں بڑے ادب سے عرض کیا کہ اس میں متعدد شعر ایسے آگئے ہیں جن کے متعلق مصنف علاّم نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ معری کے کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے حالانکہ وہ ''سقط الزند'' میں موجود ہیں، یہ اسی شیفتگی اور حفظ کا نتیجہ تھا، ابوالعلاء کے سلسلہ میں مصر

(۱) وہ شعر جو ابوالعلاء معری کے مطبوعہ دیوانوں میں درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔

کے مشہور صاحب طرز ادیب وانشاء پرداز ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو آخری سند سمجھا جاتا تھا، جن کو جسمانی وذہنی کئی طریقوں سے ابوالعلاء سے مناسبت تھی، ان کی کتاب "ذکری أبی العلاء" کی مشرق وسطیٰ میں دھوم مچی ہوئی تھی، عربی ادب کے طالب علم اس کو پڑھ کر جھوم جھوم جاتے تھے، لیکن میمن صاحب کی کتاب "أبو العلاء و ما إليه" نے اس کو بہت پیچھے چھوڑ دیا، طٰہٰ حسین لفظ واسلوب کا جادوگر ہے، لیکن لغت وشعر کی نوک پلک درست کرنے، قدیم قلمی وکرم خوردہ نسخوں کی تصحیح ومقابلہ، روایات وبیانات کے تقابل وترجیح اوراغلاط ومسامحات کی تصحیح کا مرد میدان نہیں، اس کے لیے بصارت وبصیرت، دیدہ ریزی وجگرکاوی اور بڑے صبر وتحمل کی ضرورت ہے، اور طٰہٰ حسین اپنے دوسرے کمالات کے ساتھ اس سے عاری تھے(۱)"أبو العلاء و ما إليه" کو مولانا سید سلیمان ندوی نے مصنف سے لے کر دارالمصنفین اعظم گڑھ کی طرف سے استاذ محب الدین الخطیب کے المطبعۃ السلفیہ قاہرہ ۱۳۴۴ھ میں چھاپا، اس پر سلسلہ دارالمصنفین کا نمبر ۲۹ درج ہے۔

میں نے بڑے شوق سے ایک دن شبلی بک ڈپو جاکر جو لکھنؤ میں مصر وبیروت کی عربی مطبوعات کا واحد مکتبہ تھا "أبو العلاء و ما إليه" خریدی اور پڑھی، اور مولانا کی تحقیق ومطالعہ اور کاوش ومحنت کا قائل ہوگیا، ان کے اسلوب وطرز انشا سے تو کچھ زیادہ مناسبت نہیں ہوئی کہ انھوں نے اپنی انشاء وتحریر میں ابوالعلاء کے اس اسلوب کی تقلید کی ہے، جو اس نے اپنے "رسالۃ الغفران" میں اختیار کیا ہے، مشہور مصری فاضل ومصنف شیخ عبدالوہاب النجار نے ان کی معری کی، اس کے سجع واسلوب میں تقلید کرنے پر تنقید کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر وہ اپنے قلم کو اس تقلید اور قوافی وسجع کی پابندی سے آزاد رکھتے تو بہتر ہوتا۔

کتاب پر "علامہ احمد تیمور" "شیخ أحمد الاسکندری" "شیخ عبدالوہاب" "علامہ احمد شاکر" نے بڑی اچھی تقریظیں لکھی ہیں، اور مصنف کی وسعت مطالعہ، دیدہ ریزی اور علمی

---

(۱) ملحوظ رہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین پیدائشی طور پر نظر سے معذور تھے، ادبی حلقوں کی داد وتحسین اور مصر کے مخصوص حالات نے ان کے اندر اپنے افکار وخیالات کی اشاعت میں عجلت وبے صبری پیدا کردی تھی۔

تحقیقات کی داد دی، میں کچھ اپنی علمی بے بضاعتی کی بنا پر اور کچھ شروع سے متقدمین میں ابن المقفع، متوسطین میں عبدالقاہر جرجانی اور متاخرین میں ''النظرات'' کے مصنف مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کے اثر سے سلیس غیر مقفی اور رواں عربی لکھنے کی کوشش کرتا تھا، جس میں قدیم عہد عباسی کی نثر کا رنگ نمایاں ہو، لیکن اس کے باوجود مولانا بہر حال استاد، عربی زبان کے محقق اور کہنہ مشق و مسلم نقاد اور مورخ تھے۔

لیکن ''ابوالعلاء وماالیہ'' سے بھی بعض حیثیتوں سے بڑھ کر مولانا کا تحقیقی و علمی کارنامہ ''سمط اللآلی'' ہے، اس کا تعلق ابوعلی القالی کی معرکۃ الآراء کتاب ''الأمالی'' سے ہے جو مولانا کی محبوب ترین عربی کتابوں میں تھی، اور وہ اس کو نوادر لغت و شعر کا بہترین ذخیرہ سمجھتے تھے، اس کتاب میں ان کی دیدہ وری اور دیدہ ریزی کی داد اس زمانہ کے اچھے اچھے ادیبوں نے دی، اصل میں مولانا نے وزیر ابی عبید البکری کی کتاب ''اللآلی فی شرح أمالی القالی'' کو ایڈٹ کیا ہے، اور اپنی تحقیقات وافادات اور مفید اور قیمتی حواشی کا اضافہ کیا ہے، اس کتاب کو لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر'' نے ۱۹۳۶ء میں تین ضخیم جلدوں میں قاہرہ سے شائع کیا۔

غالباً اکتوبر ۱۹۴۱ء تھا کہ میں کسی تقریب سے علی گڑھ گیا، مولانا کی خدمت میں حاضری کا اشتیاق اور عربی زبان کے اس فاضل محقق کو دیکھنے کا شوق تھا، جس نے فضلاء عرب و محققین زبان سے اپنے مطالعہ و تحقیق کا لوہا منوالیا تھا، اور جس سے ہندوستان کو عزت و شرف حاصل ہوا تھا، ۱۹۴۰ء سے ہم لوگوں نے رسالہ ''الندوہ'' میں ''میری محسن کتابیں'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا، جس میں ہندوستان کے مشاہیر اہل علم، اپنی ان محسن کتابوں کا ذکر کر کے جنھوں نے ان کی ذہن و سیرت کی تشکیل و تعمیر میں خاص حصہ لیا، قارئین اور ''تازہ واردان بساط علم'' کی رہنمائی فرما رہے تھے، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا عبیداللہ سندھی اور متعدد مشاہیر اہل علم کے مضامین شائع ہو چکے تھے، مجھے خیال ہوا کہ مولانا سے بھی اس عنوان پر

مضمون لکھنے کی فرمائش کی جائے کہ عربی لغت وادب میں وہ اس وقت سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی کے جانشین اور کم سے کم ہندوستان میں اس باب میں فرد فرید ہیں، میں ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوا، میری کتاب "مختارات من أدب العرب" جو قرن اول سے قرن حاضر تک کے عربی نثر کے نمونوں پر مشتمل ہے، اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلباء کے لیے لکھی گئی تھی (۱)، تازہ تازہ چھپ کر نکلی تھی، میں نے کسی قدر شرم اور کسی قدر خوف کے ساتھ مولانا کی خدمت میں پیش کی کہ معلوم نہیں، مولانا اس پر کیا تبصرہ فرمائیں، اور وہ ان کی نظر میں جچے یا نہیں لیکن مولانا کی (جو اپنے حلقۂ احباب وتلامذہ میں تعریف میں بڑے محتاط مشہور تھے) بزرگانہ شفقت اور فراخدلی تھی کہ مقدمہ پر اسی وقت نظر ڈال لی اور فرمایا کہ "مولوی صاحب آپ عربی بڑی خوبصورت لکھتے ہیں" زبان وانشا کے بارے میں خوبصورت کا لفظ میں نے سب سے پہلے انھی کی زبان سے سنا اور ایک مسلم الثبوت استاد کی زبان سے اتنا فقرہ سن کر یہ محسوس ہوا کہ ؂

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

میں نے موقع پا کر ان سے محسن کتابوں پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی جو انھوں نے بلاتردد قبول فرمالی، مجھے انھوں نے شام کو اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی، حاضر ہوا تو خاصا تکلف تھا، انھوں نے مضمون ڈکٹیٹ کرایا، یہ پُر مغز اور معلومات افزا مضمون "الندوہ" نومبر ۱۹۴۱ء کے شمارہ میں شائع ہوا، آج بھی یہ مضمون عربی زبان وادب، نحو وبلاغت کے طلبہ نہیں بلکہ فضلاء کے لیے رہنما اور چشم کشا اور معلومات کا خزانہ ہے، اسی سے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ اردو کے مشہور ادیب ڈپٹی نذیر احمد کے شاگرد ہیں، اور اگرچہ ان سے زیادہ دن نہیں بنی، لیکن وہ اب بھی ان کی قابلیت اور عربی نظم پر ان کی قدرت کے قائل ہیں، اس مضمون سے بہت سی ایسی کتابوں اور مصنفین کا تعارف ہوتا ہے، جو برصغیر

---

(۱) اب یہ کتاب ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں، اور سعودی عرب کے مدارس ثانویہ کے نصاب میں داخل ہے، ایک زمانہ میں دمشق کے کلیۃ الشریعۃ کے نصاب میں بھی داخل تھی۔

کے علمی و مدرسی حلقوں میں اب بھی غیر معروف ونامانوس ہیں، اس صحبت سے واپس آیا تو علی گڑھ کے طلبہ واحباب کو مضمون کی فرمائش قبول کرنے اور ایسا فاضلانہ مضمون لکھانے سے زیادہ ان کی پُر تکلف دعوت کرنے پر تعجب تھا، اس لیے کہ حلقۂ احباب وتلامذہ میں ان کی کم آمیزی اور کفایت شعاری معروف ومسلم تھی، وہ اس کو میری بڑی خوش قسمتی اور اعزاز سمجھ رہے تھے، کم لوگوں کو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کتنے متضاد اوصاف وخصائص کا مجموعہ ہے، وہ کسی چیز میں اور کسی وقت بڑا فیاض، فراخ چشم ثابت ہوتا ہے، بادشاہوں سے لے کر علماء اور درویشوں تک کی زندگی اس تضاد کا عجیب وغریب نمونہ اور مدوجزر کا عجیب وغریب مظہر ہوتی ہے، مولانا میمن صاحب کے متعلق علی گڑھ میں ایسے بہت سے لطائف مشہور تھے، ان کی جزرسی، سفروں میں بھی کفایت شعاری، طلبہ کو اپنے معلومات سے مستفید کرنے میں بھی کسی قدر بخل واستغناء، اپنے کتب خانہ کے قلمی کتابوں اور نوادر کے بارے میں احتیاط وحفاظت مشہور تھی، لیکن بعد کے واقعات بتائیں گے کہ ان کی اس انسانی شخصیت کے اندر ایک دوسری شخصیت خوابیدہ تھی، جس کا علم ان کے قریبی دوستوں کو بھی نہیں ہوا، اور جو اپنے مناسب وقت پر بیدار ونمایاں ہو کر اپنی فیاضی، علم دوستی اور اولوالعزمی سے قریب ترین عزیزوں اور شاگردوں کو محو حیرت بنا گئی۔

تقسیم ہند کے بعد یا اس سے کچھ پہلے وہ لاہور چلے گئے، اورینٹل کالج اور کراچی یونیورسٹی خوش نصیب تھی کہ ان سے فائدہ اٹھانے اور ان کے ذریعہ طلباء کو فائدہ پہنچانے کا اس کو موقع ملا، اس عرصہ میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے، ملک کی تقسیم ہوئی تو میں حجاز میں تھا، یہ میرا پہلا سفر حج تھا، مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک سوڈانی عالم میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھا کہ پاکستان کا صدر کس کو بنایا گیا؟ میں نے کہا کہ مسٹر جناح کو، کہنے لگے کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جس ملک میں علامہ عبدالعزیز میمن جیسا یگانۂ روزگار فاضل موجود ہو وہاں کسی دوسرے کو صدر بنایا جائے، میں نے ان سے بحث مناسب نہیں سمجھی اور مسکرا کر خاموش ہو گیا، معلوم نہیں اس لطیفہ کی خبر مولانا کو کیسے پہنچی کہ جب میں جولائی

۱۹۷۸ء میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے یہ لطیفہ سنا کر ان کو اور حاضرین کو مسرور و محظوظ کرنا چاہا تو انھوں نے فرمایا کہ مجھے یہ لطیفہ پہنچ چکا ہے، حیرت ہے کہ اس وقت میرے اور خواہر زادہ عزیز مولوی سید محمد ثانی سلمۂ کے سوا کوئی اور نہ تھا، ممکن ہے، میں نے کسی پاکستانی دوست سے تفریحاً اس کا ذکر کیا ہو اور شدہ شدہ یہ روایت ان تک پہنچ گئی ہو، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شہرت کہاں کہاں تک پہنچ چکی تھی، اور عرب ممالک کے اہل علم اور اہل ذوق کے دل میں ان کی کیا قدر و منزلت تھی۔

عرصہ تک ہندوستان میں ان کی صحت، مشاغل اور تصنیفی و تحقیقی سرگرمیوں کے بارے میں مطلقاً لاعلمی و بے خبری رہی، کبھی کوئی جاننے والا پوچھ لیتا کہ مولانا زندہ ہیں یا نہیں؟ اچانک ان کے عزیز و نامور شاگرد ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب کا خط میرے نام آیا کہ مولانا ایک خطیر رقم کتب خانہ ندوۃ العلماء کے لیے دینا چاہتے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ اس سے کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ رقم محفوظ رہے، اور اس سے مستقل فائدہ اٹھایا جاتا رہے، میں نے لکھا کہ اس کی سب سے زیادہ موزوں و محفوظ شکل یہ ہے کہ اس سے وہ اہم کتابیں اور جدید مطبوعات خریدی جائیں، جو کتب خانہ میں نہیں ہیں، اور مولانا کے نام کا ایک گوشہ (Corner) قائم کر دیا جائے جس میں یہ سب کتابیں رہیں، اور طلبہ و فضلاء اور تحقیقی کام کرنے والے اس سے فائدہ اٹھائیں، مولانا نے اس تجویز کو پسند کیا اور رقم حوالہ کر دی۔

خوش قسمتی سے ۶، ۷، ۸؍ جولائی کو رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے کراچی میں ایک ایشیائی اسلامی کانفرنس کا فیصلہ کیا گیا، میں اپنے عزیز رفیق کار مولوی معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء کی معیت میں جدہ سے کراچی شرکت کے لیے گیا، لکھنؤ سے عزیزان محمد الحسنی اور مولوی اسحاق جلیس ندوی شرکت کے لیے آئے، معلوم ہوا کہ مولانا علیل ہیں، اور ملنا چاہتے ہیں، میں بھی اپنے رفقاء کے ساتھ سراپا شوق بنا ہوا ان کی خدمت میں حاضر ہوا، بڑی محبت اور گرمجوشی سے ملے، میں نے اس گرانقدر عطیہ کا شکریہ ادا کیا، فرمایا اتنی ہی رقم اور پیش کروں گا۔

اثنائے گفتگو میں میں نے عرض کیا کہ اگر بے ادبی نہ ہو تو اتنا پوچھوں کہ جناب

کو عربی کے کتنے اشعار یاد ہوں گے؟ چند سکنڈ توقف کرنے کے بعد فرمایا کہ پون لاکھ سے ایک لاکھ تک...... مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا، اس لیے کہ میں نے مولانا سید طلحہ صاحب سے ان کے محفوظ اشعار کی ہزاروں کی تعداد سنی تھی، اور علی گڑھ کی مجلس میں انھوں نے خود ''دیوان حماسہ'' کے متعلق کہا تھا کہ ان کو پورا یاد ہے، علمائے متقدمین وادبائے سلف میں تو اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی، لیکن غالباً اس عہد میں یہ تحتی برِاعظم تو الگ رہا ممالک عربیہ میں بھی شاید اس کی کوئی دوسری مثال ملے، مولانا نے اپنا یہ دوسرا وعدہ بھی پورا کر دیا اور معلوم ہوا کہ ان کے عزیزوں، شاگردوں اور دوستوں نے ان کے اندرون میں اتر کر ان کی فیاضی و دریا دلی کا انکشاف نہیں کیا تھا، جو ان کے عام حالات سے کوئی میل نہیں رکھتی تھی، اور ان کو بہت سے اہل علم اور اہل دل کی طرح یہ کہنے کا حق ہے ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درون من نجست اسرار من

میں ابھی لاہور ہی میں تھا کہ عزیزی قاری سید رشید الحسن صاحب کے خط سے یہ معلوم کر کے بڑا صدمہ ہوا کہ ابھی کچھ روز ہوئے لندن سے ان کے عزیز ترین مایۂ ناز شاگرد ڈاکٹر سید محمد یوسف کے انتقال کی خبر آئی، اور ان کی نعش کراچی لائی جا رہی ہے، کراچی کی اس صحبت میں بھی برادر محترم سید محمد جمیل صاحب سابق اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان سے جو ان کے عزیز بھی ہیں، ان کی متوقع آمد کے متعلق دریافت کر رہے تھے، اور ان کے لیے چشم براہ تھے، مجھے اندازہ تھا کہ اس روح فرسا خبر کا ان پر کیا اثر پڑا ہوگا، میں نے وہیں سے ان کو تعزیتی خط لکھا، کیا معلوم تھا کہ چند ہی مہینوں کے بعد ان کے ارتحال کی خبر سننی پڑے گی، یوں تو ان کی عمر نوے سے تجاوز کر چکی تھی، لیکن ان کے ہوش وحواس، نگاہ اور دماغ اب بھی کام کر رہے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ اس عزیز شاگرد کی مفارقت نے جو اُن کا قوت بازو بنا ہوا تھا، ان کی صحت پر گہرا اثر ڈالا، بہر حال وقت موعود آ پہنچا تھا، میں بمبئی میں تھا کہ ۶ یا ۷ رنومبر کو ہمارے عزیز میزبان جو ان کے اس عطیہ سے واقف تھے دعوت کا

پرچہ لے کر آئے جس میں ان کی وفات کی خبر تھی، ہزاروں پڑھنے والوں میں سے چند ہی کو اس کا اندازہ ہوا ہوگا کہ یہ برصغیر ہی نہیں، یہ عہد اور عالم عربی کیسے عظیم المرتبت ادیب اور عربی زبان کے مبصر و محقق سے محروم ہوگیا، زمانہ کے حالات، تعلیمی نظام اور قدیم وجدید مدارس کی جو کیفیت اس وقت دیکھنے میں آرہی ہے، اس سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ ان کا جیسا متبحر، مستند اور صاحب نظر عربی زبان وادب کا عالم پیدا ہوگا، میں نے ان کو تعزیتی خط میں جو الفاظ لکھے تھے، ان میں ذرا مبالغہ نہیں سمجھتا اور اسی پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں "حجة اللغة العربية ومفخرة القارة الهندية" (اس عہد میں عربی زبان وادب میں سند کا درجہ رکھنے والے اور اس تحتی براعظم ہندوپاک کے لیے سرمایۂ فخر و نازش)

□□□

مولانا محمد اویس ندوی

ایک ایسے رفیق اور دوست پر قلم اٹھاتے وقت جس سے تقریباً ۴۰ سال کسی نہ کسی طرح کی رفاقت کا رشتہ قائم رہا دل کے داغ کہن تازہ ہو جاتے ہیں، اور یادوں کا ایک ایسا لشکر امنڈ آتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کس کو لیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے، مگر دل کا تقاضا اور ایک عزیز اور مخلص رفیق کا حق ہے کہ یہ کہانی کسی نہ کسی طرح سنائی جائے، وہ اب جس عالم میں ہیں، وہاں ان کو اس کی ضرورت نہیں، لیکن ہم جس عالم میں ہیں، اس کا یہ دستور ہے کہ جانے والوں کی یاد اور تذکرہ سے قلب حزیں کو تسکین دی جائے اور جو نہیں جانتے یا بہت کم جانتے ہیں، ان کو جانے والے کے محاسن و کمالات سے واقف کرانے کی کوشش کی جائے، کیا عجب ہے کہ بساط علم کے تازہ واردوں کے لیے ان میں کوئی سبق اور ترغیب و تشویق کا کوئی سامان ہو۔

مولانا نے میری کتاب ''پرانے چراغ'' اپنی طویل اور پر اذیت علالت میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی تھی، اس کی اکثر شخصیتیں ہمارے ان کے درمیان مشترک تھیں، اور اکثر چراغ وہی تھے، جن سے ہم نے اور انھوں نے یکساں روشنی حاصل کی تھی، اور واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض سے ان کا تعلق اور ان کی واقفیت مجھ سے زیادہ تھی، مثلاً ان کے شیخ و مرشد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، ان کے استاذ و مربی مولانا سید سلیمان ندویؒ اور ان کے عزیز دوست اور ایک طرح کے شاگرد سید صدیق حسن آئی سی ایس، باقی شخصیتوں میں سے بعض ان کے استاد اور بعض ان کے بزرگ اور بعض ان کے دوست تھے، میں ایک مرتبہ ان سے ملنے گیا تو وہ کتاب کے مطالعہ سے اپنے لطف و مسرت کا اظہار

کرنے لگے اور بعض ایسی شخصیتوں کی نشاندہی کی کہ ان کا تذکرہ اس کتاب میں آنا چاہئے تھا، نہ انھیں خبر تھی، نہ مجھے کہ خود ان کے تذکرہ...... کی اتنی جلدی نوبت آئے گی۔

''نگرام'' اودھ کا ایک نامی گرامی مردم خیز قصبہ ہے، جو ہندوؤں کے عہد میں بھی ایک بڑا علمی مرکز رہا ہے، اور مسلمانوں کے عہد میں بھی اس کی خاک سے بڑی جلیل القدر ہستیاں اٹھی ہیں، شاید بہت لوگوں کو معلوم ہو کہ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے محبوب مرید بلکہ خلیفہ اور جانشین حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی اسی قصبہ اور اس نواح کے ایک خاندانِ سادات کے چشم و چراغ تھے، پھر اسی سلسلہ کے چراغ کو بارہویں صدی ہجری میں جب کہ یہ سلسلہ (چشتیہ نظامیہ) چراغ سحری ہو رہا تھا، بڑی آب وتاب سے روشن کرنے والے حضرت شیخ نظام الدین اورنگ آبادی (خلیفہ حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی و والد نامدار حضرت شاہ فخر دہلوی) اسی سرزمین سے وطنیت کا تعلق رکھتے تھے۔

تیرہویں صدی ہجری کے آخر میں اس قصبہ میں اللہ نے رشد و ہدایت اور اصلاح عقائد کا چراغ روشن کیا، یوں تو اودھ میں بڑے بڑے روحانی و علمی مرکز تھے، اور ان سے ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کو فیض باطنی اور علم ظاہری کی دولت حاصل ہوئی، لیکن اصلاح عقائد و اصلاح رسوم اور توحید و اتباع سنت کی دعوت کے اس جوار میں دو خاندان علم بردار تھے، ا۔ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان جس کا مرکز ضلع رائے بریلی تھا، ۲۔ یہ خاندان جس کا مرکز ضلع لکھنؤ کا یہ قصبہ نگرام تھا، اول الذکر خاندان کے ایک شیخ طریقت و داعی الی اللہ مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی نصیر آباد میں پوری سرگرمی کے ساتھ ارشاد و تربیت کے کام میں مشغول تھے، اور دور دور تک ان کا رشد اور دینی اثرات پھیلے ہوئے تھے، دوسری طرف نگرام میں ایک عالم ربانی اور داعی حق مولانا عبد العلی صاحب نگرامی (۱۲۳۱-۱۲۹۶ھ) تھے، وہ علوم ظاہری میں مولانا عبد الحکیم (نبیرہ حضرت بحر العلوم) سے تلمذ اور سلوک و تصوف میں قاضی عبد الکریم نگرامی سے نسبت روحانی رکھتے تھے، اور ان کے خلیفہ گلزار شاہ صاحب کشتوی کے تربیت یافتہ و مجاز تھے، مصنف ''نزہۃ الخواطر'' کے

بیان کے مطابق ان کو اس سلسلہ علم الٰہی میں حضرت مولانا سید خواجہ احمد صاحب نصیر آبادی سے بھی اجازت تھی، مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی اور مولانا عبدالعلی صاحب دونوں میں مسلک و مذاق کے اتحاد کی وجہ سے بڑے گہرے برادرانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے، دونوں نامور معاصر اپنے وقت کے بڑے ناشر سنت اور ماحی بدعت بزرگ تھے، ان اطراف ونواح اور ضلع رائے بریلی اور ضلع لکھنؤ کے بہت سے قصبات میں توحید وسنت کا جو ذوق اور اصلاحی رنگ نظر آتا ہے، وہ انہی دونوں بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

مولانا عبدالعلی صاحب بلند پایہ عالم بھی تھے، ان کو مولانا انور علی مرادآبادی اور شیخ اوحدالدین بلگرامی سے بھی تلمذ حاصل تھا، احکام القرآن پر ایک کتاب جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے، اور مولانا محمد اویس صاحب مرحوم اس میں اضافہ اور تکمیل کرنا چاہتے تھے، ان کی علمی پختگی اور تجربہ کی شاہد ہے، رسوم مروجہ کی مخالفت اور تردید میں ان کے متعدد رسائل ہیں، مولانا محمد اویس صاحب اکثر بہت مزہ لے لے کر ایک مناظرہ کا حال سناتے تھے، اس میں فریق مقابل کی طرف سے مولوی الف خاں رائے بریلوی مناظر تھے، مولانا عبدالعلی صاحب کے علمی ایرادات کی وجہ سے جو وہ ان کے ہر جملہ پر کرتے تھے، وہ لاجواب ہو گئے، مولانا عبدالعلی صاحب کے فرزند (مولانا محمد اویس صاحب کے دادا) مولانا محمد اویس صاحب نگرامی (۱۲۷۵-۱۳۳۰ھ) فخر المتاخرین مولانا عبدالحی صاحب کے شاگرد اور اویس زمانہ مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے مرید و مسترشد تھے، وہ جید عالم اور صاحب قلم تھے، ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی فرمائش پر معاصر علماء کا تذکرہ ''تطییب الاخوان بذکر علماء الزمان'' کے نام سے مرتب کیا، جس سے ان کی وسعت قلب اور سلامت طبع کا اندازہ ہوتا ہے، مصنف ''نزہۃ الخواطر'' نے ان کی تیرہ اور تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے، جو زیادہ تر فقہ وحدیث کے مسائل و مباحث پر ہیں۔

ان کے صاحبزادہ مولانا محمد انیس صاحب، صاحب علم وفضل بزرگ تھے، فقہ پر خاص طور سے ان کی گہری نظر تھی اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب، شیخ

الاسلام ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیم کی کتابوں کا مذاق رکھتے تھے، اور سختی سے اہل سنت کے اس مسلک اور مکتب خیال کے عامل وداعی تھے، جس کے امام ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور آخر میں حضرت سید احمد شہید اور ان کی جماعت تھی۔

اس خاندان میں علمی مذاق اور اہل حق سے برابر تعلق قائم رہا، متعدد افراد نے اپنے علمی وادبی ذوق یا اپنے تبلیغی ودعوتی شغف کی وجہ سے قرب وجوار میں نام پیدا کیا اور کئی سربرآوردہ ہستیاں بھی پیدا ہوئیں، جن میں مولوی محمد احسن صاحب وحشی نگرامی، مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب اور ڈپٹی علی متقی صاحب وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے، لیکن جس ہستی نے دور آخر میں اس خاندان کا سب سے زیادہ نام روشن کیا اور جو اس دور اور ملک کے بڑے بڑے اہل نظر کی توجہات وتوقعات کا مرکز بن گیا، اور جس نے چوٹی کے علماء وزعماء سے اپنی ذہانت، خطابت، علم وزہد اور تقویٰ کا لوہا منوالیا وہ جواں مرگ صاحب کمال مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی تھے، جن سے نہ صرف اس خاندان وقصبہ بلکہ اس درس گاہ اور حلقہ کا نام بھی روشن ہوا، جس کو ان کی تعلیم وتربیت کا شرف حاصل ہوا تھا، ان کی وفات پر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ''معارف'' میں ایک بڑا اولدوز اور غم انگیز مضمون لکھا تھا، جس کا عنوان تھا ''ہماری جماعت کا گوہر شب چراغ گم ہوگیا'' اللہ نے اس جواں سال عالم کو عجب متنوع بلکہ متضاد قسم کے کمالات سے نوازا تھا، وہ ایک طرف مفسر، ادیب، انشا پرداز، خطیب، کامیاب معلم، محبوب ہر دلعزیز استاد بھی تھے، اور میدانِ سیاست وحریت کے شہسوار اور دار ورسن کو دعوت دینے والے بھی تھے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ اور ان کی درس گاہ کو بھی ان پر ناز تھا، اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بھی وہ قوتِ بازو اور رفیق کار تھے، دوسری طرف حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے بھی مسترشد اور (اگر روایت صحیح ہے تو) مجاز بھی تھے، اللہ نے ان کی شخصیت وگفتگو میں عجب موہنی رکھی تھی، میں نے اپنی طالب علمی میں دارالعلوم کے طلبہ وفضلاء کو کسی استاد کا ایسا گرویدہ اور ان کے فضل وکمال اور زہد واخلاص کا ایسا معترف نہیں دیکھا جتنا

مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے شاگردوں کو ان کا، افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ ۲۷-۲۸ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کر گئے، اگر وہ زندہ رہتے اور خدا کو منظور ہوتا تو وہ فضل وکمال اور دینی وعلمی ارتقاء کی بلندی پر نظر آتے، موصوف مولانا محمد اویس صاحب ندویؒ کے ماموں زاد بھائی تھے۔

مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب ندوی اور مولانا محمد اویس صاحب ندوی اسی خاندان کے چشم وچراغ تھے، اول الذکر میرے رفیق درس تھے، اور غالباً انھیں کے ذریعہ سے مولانا محمد اویس صاحب سے صاحب سلامت شروع ہوئی، وہ مجھ سے عمر میں ایک دو سال چھوٹے تھے، جب یہ ارتباط شروع ہوا تو میں دارالعلوم کے درجہ ہفتم میں شریک تھا اور وہ درجہ ششم کے طالب علم تھے، سال غالباً ۱۹۳۰ء تھا، قدیم خاندانی روابط کی وجہ سے اور ان کے علاوہ ان تعلقات ومناسبتوں کی وجہ سے جن کا اوپر ذکر آیا (مولانا کے والد مولانا محمد انیس صاحب کو میرے والد ماجد مولانا سید عبدالحی سے تلمذ تھا) یہ دور بھائی صاحب مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی عملاً نظامت کا تھا، عملاً اس وجہ سے کہتا ہوں کہ ضابطہ سے ناظم نواب سید علی حسن خاں صاحب مرحوم تھے، لیکن کام زیادہ تر بھائی صاحب کرتے تھے، خاندانی تعلق کی بناء پر ناظم ندوۃ العلماء کے رشتہ سے اور طبیب شہر ہونے کی بنا پر بھی اس خاندان کے افراد کا بھائی صاحب کے یہاں برابر آنا جانا تھا، اس وقت نظیر آباد میں قیصر باغ کو جاتے ہوئے بائیں طرف کسی مکان پر ایک بالاخانہ تھا، جو اس خاندان کے افراد کی لکھنؤ میں قیام گاہ تھی، اور نگرام ہاؤس کے نام سے مشہور، ندوہ جاتے آتے، مولوی مطلوب صاحب یا مولانا محمد اویس صاحب کے وہاں آنا جانا ہوتا، کبھی مولانا محمد انیس صاحب تشریف لائے ہوئے ہوتے تو بزرگانہ شفقت کے ساتھ پیش آتے، جس دن سے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا قیام ہمارے مکان واقع گوئن روڈ ہونے لگا، ان حضرات کی بکثرت آمد ورفت شروع ہوگئی، مولانا محمد اویس صاحب نے جلد ہی حضرت مولانا سے اصلاح وتربیت کا تعلق پیدا کرلیا اور بالآخر وہ اجازت سے مشرف ہوئے، بھائی

صاحب مرحوم شروع سے ان پر نگاہ رکھتے تھے، اوران کی جوہر شناس نگاہ نے ان کو بھانپ لیا تھا، مولانا محمد اویس صاحب نے بارہا بڑی ممنونیت وتشکر کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا کہ شیخین (ابن تیمیہ وابن قیم) کی تصنیفات کے مطالعہ کی طرف سب سے پہلے توجہ دلانے والے ڈاکٹر صاحب ہی تھے، انھوں نے کتاب "التفسیر القیم" کے مقدمہ میں بھی اس کا ذکر کیا ہے، بھائی صاحب کا ذکر کرتے وقت اکثر ان کی آنکھیں آبدیدہ اور آواز گلوگیر ہو جاتی، وہ ان کو اپنے اولین علمی ودینی سرپرستوں میں شمار کرتے اور اکثر ان کی عنایتوں وشفقتوں کا مزہ لے لے کر تذکرہ کرتے، اس وقت ان کی آنکھوں میں ایک چمک اور چہرہ پر شرافت وتشکر کا ایک نور ہوتا۔

طالب علمی کے دور میں یا اس کے بعد جب ہم لوگ دارالعلوم کے سلک تدریس سے منسلک ہوئے، زیادہ قرب ویکجائی کے مواقع ملے، اکثر صبح ٹہلنے ساتھ جانا ہوتا، اس وقت مولانا نہایت نحیف الجثہ اور لاغر تھے، اکثر بیمار رہتے اور بھائی صاحب کے زیر علاج، مطالعہ کا ذوق واہتمام اسی وقت سے تھا، شیخین وشاہ ولی اللہ صاحب اوران کے خاندان کی تصنیفات کے علاوہ ہر قسم کی علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی کتابیں پڑھتے، مذاق سلیم اور ثقافت کا تنوع، عام واقفیت وباخبری اور تحریر وتقریر کی شگفتگی، خاندانی ورثہ میں ملی، وہ شرفاء اودھ کی تہذیب اور ندوہ کی تعلیم کا بھی فیضان تھا، ان میں خشکی وتنگ نظری نام کو نہ تھی، اس لیے وہ احباب کی کسی مجلس میں اجنبی ونامانوس معلوم نہ ہوتے، ہر علمی، ادبی گفتگو وتذکرہ میں حصہ لیتے اور کبھی بارِ خاطر نہ بنتے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مجلس میں اپنے اسی علمی ذوق ومطالعہ کی وجہ سے ان کو بہت جلد اختصاص حاصل ہو گیا، سید صاحب مرحوم دارالعلوم کے ہونہار فضلاء اور صاحب صلاحیت نوجوانوں کی بڑی قدر کرتے تھے، اور چاہتے تھے کہ ان کی علمی اور تحریری صلاحیتیں پروان چڑھیں، اور وہ مدرس یا مصنف یا محقق کی حیثیت سے نمایاں ہو کر بڑوں کی جگہ لیں، ان کی نگاہِ انتخاب مولانا محمد اویس صاحب پر پڑی، انھوں نے ان کو اپنے پاس دارالمصنفین بلا لیا، اور براہِ راست ان کو اپنی تربیت میں لے لیا، ہندوستان میں بہت کم لوگوں کو معلوم

ہے کہ سید صاحب اگرچہ مؤرخ وادیب کی حیثیت سے مشہور ومتعارف ہیں، اور بعض دینی حلقوں کا ابھی تک ان کو مؤرخ وادیب ہی کہنے پر اصرار ہے، لیکن جیسا کہ میں نے ’’پرانے چراغ‘‘ میں ان کے تذکرہ میں لکھا ہے، میرے نزدیک ان کا اصل موضوع اور ان کے امتیاز واختصاص کا میدان فہم قرآن اور علم کلام تھا، مولانا حمید الدین صاحب فراہی کی زیارت اور ان سے استفادہ کا شرف مجھے حاصل نہیں ہوا، ان کا تعمق فی القرآن مشہور ومسلم ہے، میرے محدود علم میں ان کے بعد تدبر قرآن، قرآن مجید کے بلاغتی ادبی اور کلامی دقائق ونکات کی واقفیت اور اس کے معانی ومطالب میں غوّاصی کا جہاں تک تعلق ہے، سید صاحب کا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا، یہ بیان محض گروہی عصبیت اور نری عقیدت کی بنا پر نہیں ہے، میں نے بارہا ان کا قرآن مجید کا درس اور متعدد سورتوں اور آیات پر ان کی تقریر سنی ہے، اور متعدد بار دار العلوم میں میرے درس قرآن کے گھنٹہ میں تشریف لے آئے اور تقریر شروع فرمادی، جس کا سلسلہ دو دو تین تین گھنٹہ مسلسل جاری رہا، ایک مرتبہ ہم لوگوں کے سامنے جب ہم ان کی عیادت کے لیے اعظم گڑھ گئے تھے، اور جب وہ ایک طویل بیماری سے اٹھے تھے، سورۂ جمعہ پر تقریر فرمائی، میں نے قرآن مجید کے سلسلہ میں ایسی عمیق، مربوط اور فکر انگیز تقریر نہیں سنی۔

مولانا محمد اویس صاحب نے سید صاحب سے خاص طور پر قرآن مجید اور علم کلام وعقائد کے سلسلہ میں استفادہ کیا، یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس آخری دور میں فضلاء دار العلوم میں سے کسی کو ان دو علوم میں سید صاحب سے اتنے طویل اور منظم اور مفصل استفادہ کا موقع نہیں ملا، اس طرح ان کو اِن دو مضامین میں سید صاحب کا اصل شاگرد اور ان کے خرمن کمالات کا خوشہ چین کہنا صحیح ہوگا، یہ خوش نصیبی تھی، جس پر ان کے رفقاء واحباب کو ہمیشہ رشک آئے گا، اور اسی چیز نے ان کو وہ امتیاز بخشا کہ بالآخر دار العلوم کی مسند تفسیر کو آباد کرنے کے لیے ناظم ندوۃ العلماء اور دار العلوم کے ذمہ داروں کی نظر انتخاب انھی پر پڑی اور ان کے چھوٹے بڑے ساتھیوں نے اس عظیم وجلیل موضوع پر ان کے امتیاز وتفوق کو تسلیم کیا۔

مولانا اویس صاحب جب دارالمصنفین گئے، سید صاحب اس زمانہ میں ''سیرۃ النبیؐ'' پر نظرثانی کا کام کر رہے تھے، انھوں نے مولانا سے بھی اس سلسلہ میں اصل مآخذ سے مقابلہ اور تخریج احادیث کا کام لیا، بحث وتحقیق اور سید صاحب کی مجالس اور علمی مذاکرات سے بھی ان کو بڑا علمی فائدہ ہوا، جس کا وہ اکثر تذکرہ کرتے تھے۔

مولانا کی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے دبستانِ فکر کے ساتھ شغف، شیفتگی وحمیت کی حد تک پہنچا ہوا تھا، وہ ان پر کوئی تنقید برداشت نہیں کرسکتے تھے، ان میں سب سے زیادہ نازک موقع اس وقت پیش آیا جب انھوں نے یہ جانتے ہوئے کہ ان کے محبوب شیخ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ علامہ ابن تیمیہؒ کو زیادہ پسند نہیں کرتے، ایک ذی علم ناقد کے جواب میں جنھوں نے علامہ ابن تیمیہؒ پر ناروا حملے کیے تھے، ان کی حمایت ودفاع میں ایک پُرزور اور مدلل مضمون لکھا جو ''الفرقان'' میں شائع ہوا، انھوں نے اپنے شیخ کی ناراضگی اور کم سے کم شکایت کا خطرہ مول لے کر یہ اقدام کیا، جو اُن کے جیسے منقاد ومعتقد مرید کے لیے ایک بڑا امتحان تھا، انھوں نے یہ نازک خدمت بڑی خوبی اور قابلیت سے انجام دی، اور اس پورے حلقہ سے داد وتحسین حاصل کی جو امام ابن تیمیہؒ کی عظمت وجلالت شان کا قائل تھا، معلوم نہیں ان کو اس سلسلہ میں کتنے مخلصین کی دعائیں حاصل ہوئیں، یہ ان کے خلوص کا نتیجہ اور ان کے طرز تحریر کی متانت وشائستگی تھی کہ جہاں تک مجھے علم ہے، مولانا مدنیؒ کو اس سے کوئی کبیدگی نہیں ہوئی اور ان کے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا۔

اپنے رفقاء اور ہم عصر فضلاء میں مولانا کا دوسرا امتیاز یہ تھا کہ علمی طور پر تصوف کے ذخیرہ پر ان کی گہری نظر تھی، وہ تصوف وشریعت کی مطابقت پر پختہ عقیدہ بھی رکھتے تھے، اور اس کو ثابت کرنے کی ان میں خصوصی قابلیت تھی، اس کا نمونہ ان کا وہ فاضلانہ مضمون ہے، جو مولانا منظور صاحب نعمانی کی مرتب کی ہوئی کتاب ''تصوف کیا ہے؟'' کی زینت ہے، اور جس نے بہت سے دماغوں کی پھانسیں نکالنے میں کامیابی حاصل کی اور تصوف سے وحشت کو دور کرنے کے قابل قدر کام میں نمایاں حصہ لیا ہے، تصوف کے سلسلہ میں وہ

دو کتابوں کے بہت قائل تھے، اور طلبہ کو اکثر ان کے پڑھنے کا مشورہ دیتے اور بعض مرتبہ انھوں نے درساً پڑھایا بھی، ا۔ قاضی ثناء اللہ صاحب کی کتاب ''ارشاد الطالبین''، ۲۔ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے افادات وملفوظات کا مجموعہ ''صراط مستقیم''۔ افسوس ہے کہ صحت کی خرابی اور تدریسی مشغولیت نے ان کو اس کا موقع نہ دیا کہ وہ ان دونوں کتابوں پر کوئی بڑا علمی کام کرتے اور ان کو اس زمانہ کی زبان واسلوب میں منتقل کر دیتے۔

تفسیر ان کا خاص موضوع تھا، اور ان کی نگاہ اس میں روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی جارہی تھی، کتب خانہ ندوۃ العلماء کے ذخیرۂ تفسیر میں سے مشکل سے کوئی اہم کتاب نظر سے بچی ہوگی، ایک زمانہ میں تفسیر قرطبی کا ان کو بڑا شوق اور اس کی طباعت کا بڑا انتظار تھا، بالآخر اُن کو اس کے مطالعہ کا موقع ملا، بعض ایسی تفاسیر جو ابھی ہندوستان میں عام اور متداول نہیں ہوئی ہیں، انھوں نے بڑے اہتمام سے حاصل کیں اور بڑے شغف سے ان کا مطالعہ کیا، مثلاً علامہ جمال الدین قاسمی دمشقی کی ''تفسیر قاسمی'' اردو میں تفسیر پر جو کام ہوا ہے، اس میں وہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی ''تفسیر ماجدی'' کے بڑے قائل اور معترف تھے، اور اپنے شاگردوں کو اس کے مطالعہ کا مشورہ دیا کرتے تھے۔

وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' کے بڑے قدر شناس اور اس کے داعی ومبلغ تھے، انھوں نے اس پر بڑے مفید اور قیمتی حواشی لکھے جس کو پاکستان کے مشہور عالم مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب نے مکتبہ سلفیہ لاہور کی طرف سے بڑی قدر واہتمام کے ساتھ شائع کیا، میرے خیال میں ''الفوز الکبیر'' کی توضیح وتشریح اور اس کے نہایت مختصر ہونے کی بنا پر اس کے اجمال کی تفسیر پر بہت کم لوگ ایسے قادر ہوں گے جیسے مولانا اپنے وسیع مطالعہ اور طویل درس وتدریس کی وجہ سے ہوگئے تھے، الفوز الکبیر کے علاوہ انھوں نے شاہ صاحب کی دوسری کتاب ''العقیدہ الحسنۃ'' جو عقائد اہل سنت میں ایک مختصر متن ہے، پر بھی مفید حواشی اور توضیحات کا اضافہ کیا، جو ''العقیدۃ السنیۃ'' کے نام سے مطبع ندوۃ العلماء کی طرف سے شائع ہوا اور ندوہ کے نصاب میں داخل ہوا۔

ہندوستان سے باہر کے علمی حلقوں میں ان کے تعارف کا بڑا ذریعہ ان کی کتاب ''التفسیر القیم'' ہے، جس میں انھوں نے وہ تمام تفسیری مواد و مضامین ترتیب کے ساتھ جمع کردیئے ہیں، جو علامہ حافظ ابن قیم کی تصنیفات کے وسیع ذخیرہ میں بکھرے ہوئے تھے، یہ کتاب خوبصورت عربی ٹائپ میں ''مطبع السنۃ المحمدیہ'' کی طرف سے شائع ہوئی اور سعودی عرب اور نجد و حجاز میں قدر کے ہاتھوں لی گئی، ان کا ارادہ تھا کہ وہ اسی انداز پر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے تفسیری مضامین و تحقیقات بھی جمع کر کے شائع کردیں، غالباً اس کا بڑا حصہ انھوں نے مرتب بھی کردیا تھا، مگر اس کی طباعت کی نوبت نہ آئی، اسی طرح وہ بلاغت قرآن اور نحو قرآن کے سلسلہ میں بھی اپنے شاگردوں سے کام لینا چاہتے تھے، اور اپنی نگرانی میں اس موضوع پر کتابیں مرتب کروانا چاہتے تھے، مگر صحت کی خرابی نے ان کو اس کا موقع نہ دیا۔

قرآن مجید کی اس طویل خدمت کے علاوہ جس کا مرکز دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس کے مخاطب دارالعلوم کے اونچے درجہ کے طلبہ تھے، جہاں مولانا کا تفسیر کا درس ہوتا تھا، ان کی قرآنی خدمت کا ایک بڑا میدان اور ان کا ایک بہت بڑا تبلیغی و اصلاحی کارنامہ شہر کا وہ درس تھا جس میں اعلیٰ مسلمان، سرکاری عہدہ دار اور اونچے درجہ کے انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے، اس درس کی بنیاد ہمارے محترم دوست اور حکومت یوپی کے ایک اعلیٰ سرکاری افسر سید صدیق حسن آئی سی ایس سینیر ممبر بورڈ آف ریونیو لکھنؤ نے اپنی کوٹھی میں رکھی تھی، یہ درس پابندی سے ہر ہفتہ سنیچر بعد مغرب ہوتا تھا، اور اس کا سلسلہ سالہا سال جاری رہا، سید صاحب کی وفات (۱۹۶۳ء) کے بعد بھی انھی کی کوٹھی پر یہ سلسلہ قائم رہا، اس درس میں قرآن مجید کا ذوق رکھنے والے افسروں اور اعلیٰ ملازمین کا جوہر (Cream) شامل ہوتا تھا، اور سب مولانا کی وسعت نظر، جدید ذہنوں کی رعایت اور نئے قسم کے شبہات کو رفع کرنے کی قابلیت کے قائل تھے، اس حلقہ میں میں نے شیخ ظہور الحسن صاحب سابق ریونیو سکریٹری حکومت یوپی سے زیادہ پڑھنے والا اور علمی مذاق رکھنے والا آدمی نہیں دیکھا، وہ پابندی سے اس درس میں شریک ہوتے تھے، وہ ایک دن مجھ

سے کہنے لگے کہ مولانا محمد اویس صاحب نے اس چھوٹی سی عمر میں بڑی فضیلت وقابلیت پیدا کرلی ہے، قرآن فہمی میں ان کا پایہ بہت بلند ہے، اس درس سے شہر کے تعلیم یافتہ حلقے میں بھی قرآن مجید کے پڑھنے اور سمجھنے کا ذوق پیدا ہوا، مولانا کا اس طبقہ میں بڑا اخلاقی اثر اور علمی وقار تھا، اور اس وجہ سے بہت سے اہل حاجت کے کام نکلتے تھے، مجھے بھی بارہا اس سلسلہ میں مولانا کو زحمت دینے کی نوبت آئی اور ضرورت مندوں کی کاربراری ہوئی، افسوس ہے کہ مولانا کی طویل اور پیچیدہ علالت سے جس کا سلسلہ تقریباً دو سال ......قائم رہا، یہ مبارک سلسلہ منقطع ہوگیا، جس کا ان کے تمام تلامذہ، احباب اور شرکاء بزم کو اخیر تک قلق رہا۔

مولانا اگرچہ تمام تر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ اور سلوک وتربیت میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے دست گرفتہ اور ان کے دامن سے وابستہ تھے، اپنے سیاسی خیالات ومسلک میں بھی انھیں کے متبع تھے، لیکن ان کے اندر تنگ نظری اور جماعتی عصبیت نہ تھی، وہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی کے بڑے معتقد اور ان کی اصلاحی وتربیتی کوششوں اور ان کے نتائج کے بڑے قائل اور معترف تھے، لکھنؤ کے قیام میں ان کی مجالس میں نیازمندانہ اور معتقدانہ حاضر ہوتے، ان سے مراسلت بھی رہی تھی، حضرت کے متعدد خلفاء سے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے، مولانا ہی کے ایک مسترشد مولوی نجم احسن صاحب جو عرصہ تک پرتاپ گڑھ میں رہے، اور ابھی حال ہی میں ان کا کراچی میں انتقال ہوا ہے، ان کے عزیز قریب اور ہم زلف تھے، مولانا کے مسترشدین میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، مولانا عبدالباری صاحب ندوی مرحوم اور مولانا مسعود علی صاحب ندوی سے ان کے خوردانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے، اور مولانا سید سلیمان ندوی تو ان کے محبوب استاد اور مربی ہی تھے، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری جب لکھنؤ تشریف لاتے اور دارالعلوم اور لکھنؤ کے تبلیغی مرکز میں ہفتوں قیام کرتے تو مولانا اس اہتمام اور پابندی سے ان کی مجالس میں شریک ہوتے کہ دیکھنے والا ان کو ان کا مرید رشید ہی سمجھتا، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے ان کو گہری عقیدت تھی، اور شیخ کو بھی ان سے

تعلق خاطر تھا، ان کی وفات پر حضرت نے اپنے گہرے رنج وتأثر کا اظہار کیا۔

مولانا مرحوم اپنے دوستوں کی خوشی سے خوش ہونے والے تھے، اور اپنے جذبات ومسرت کے اظہار اور تعریف واعتراف میں بڑے فراخ دل واقع ہوئے تھے، میری کوئی کتاب پسند آتی تو دل کھول کر داد دیتے اور اپنے دوستوں اور شاگردوں کو اس کے مطالعہ کی تاکید فرماتے، یہ سب ان کے خلوص کی دلیل تھی، اسی طرح ان کے اہل تعلق میں کوئی حادثہ یا غمی پیش آتی تو اس پر عزیزوں کی طرح رنج وغم کا اظہار کرتے اور اس غم میں ذاتی طور پر شریک معلوم ہوتے، کسی کی کامیابی سنتے تو دل سے مبارک باد دیتے، اس خاندان کے بچوں پر بزرگوں کی طرح شفقت فرماتے، مفید ہدایات دیتے، سستی اور بدذوقی پر سرزنش فرماتے، یہ سب قدیم شرفاء کی خصوصیات تھیں، ایک مرتبہ کچھ عرب مہمانوں کے اعزاز میں سلیمانیہ ہال میں جلسہ تھا، میں نے تقریر میں بہت صفائی سے کہا کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی قسمت اور اپنا دینی مستقبل عربوں کے ساتھ وابستہ نہیں کیا ہے، اور ہم ان کے ہر حال میں تابع نہیں ہیں کہ وہ صحیح غلط جو راستہ اختیار کریں، ہم اس پر آنکھ بند کر کے ان کے پیچھے ہولیں، ہماری اسلامیت ودینداری کے لیے ان کی اسلامیت ودین داری شرط نہیں ہے، ہمارا معاملہ براہ راست اللہ سے اور اس کے عطا کیے ہوئے دین وشریعت اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر سے ہے، مولانا اس تقریر سے اتنے خوش ہوئے کہ وہیں برسر اجلاس اپنی محبت کا اظہار کیا اور کھڑے ہو کر حاضرین کے سامنے اپنے جذبات اور تأثرات ظاہر کیے، یہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کو خدا نے خلوص ومحبت اور اخلاقی جرأت کا جوہر عطا کیا ہو۔

افسوس ہے کہ عین اس وقت جب کہ ان کے علمی وتعلیمی فیوض کا سلسلہ سرگرمی سے جاری تھا، وہ علمی ودینی طور پر ارتقاء کے منازل طے کر رہے تھے، اور قریب تھا کہ کم سے کم ہندوستان میں (جہاں تک علوم قرآن اور تفسیر کا تعلق ہے) وہ اس دور قحط الرجال میں طلبہ اور شائقین علم کا مرجع بن جاتے، ان کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا، شروع میں یہ سمجھا گیا کہ یہ وجع الفواد (انجائینا) ہے، پھر اس میں نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں، بار بار

میڈیکل کالج میں داخل ہوئے اور گھر آئے لیکن ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ان کے علاج ومعالجہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا، یہ سلسلہ دو سال جاری رہا، اشتہا بالکل مفقود ہوگئی، بے خوابی کی سخت شکایت تھی، غذا بالکل برائے نام رہ گئی تھی، جو دوا کی طرح وہ استعمال کرتے تھے، اس سے ایسی ناطاقتی پیدا ہوئی کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوگیا، لیکن حادثہ کے قرب کا اتنا خطرہ نہ تھا، مہینوں سے یہ کیفیت چل رہی تھی، اور اہل تعلق بربنائے محبت وتعلق مایوس نہ تھے کہ ۲۹ رشعبان ۱۳۹۱ھ کو ظہر وعصر کے درمیان وقت موعود آپہنچا، اور انھوں نے جانِ جان آفریں کے سپرد کی، اسی دن رمضان مبارک کا چاند طلوع ہوا، جس کا ان کو ہمیشہ بڑا اہتمام رہتا تھا، اگلے دن یکم رمضان مبارک کی صبح کو مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے اپنے ہاتھوں سنتوں کی پوری پابندی کے ساتھ غسل دیا، جو لوگ مولانا کے اس اہتمام کو جانتے ہیں، ان کے نزدیک وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے، جس کو مولانا غسل دیں، میں ایک فوری ضرورت سے دہلی اور سہارن پور گیا ہوا تھا، یکم رمضان مبارک ۲۸ راگست ۱۹۷۱ء کو صبح نو بجے جب میں نے لکھنؤ اسٹیشن پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو اچانک معلوم ہوا کہ مولانا کل اس دار فانی سے سفر کر گئے، جنازہ عیش باغ پہنچ چکا ہے، ان کے اس رفیق کو جو ۴۰-۴۵ برس سے ان کا کسی نہ کسی طرح رفیق اور دوست رہا ہے، نماز جنازہ کی آخری خدمت انجام دینی ہے، صبر ورضا اور امتثال امر کے سوا کیا چارہ تھا، عیش باغ میں محبین ومعتقدین اور تلامذہ کا ایک بڑا مجمع تھا، دیکھتے دیکھتے خدا کی یہ امانت خدا کے سپرد اور قرآن کے اس خادم کو سپرد خاک کردیا گیا، بڑے خوش نصیب تھے، ان کو رمضان کی پہلی تاریخ نصیب ہوئی، مولانا منظور صاحب کا بیان ہے کہ غسل دیتے وقت چہرہ تر وتازہ اور شاداب تھا، اور یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اتنی طویل علالت اٹھائی ہے، وہ کہتے تھے کہ یہ عقیدہ توحید میں مولانا کی پختگی کی برکت ہے، افسوس ہے کہ علمی انحطاط اور پست ہمتی کے اس دور میں ان کی اس جگہ کا پُر ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے، جوان

کی وفات سے خالی ہوگئی ہے، علوم قرآن کے تلامذہ کو ابھی ان سے بہت فائدہ اٹھانا اور رہنمائی حاصل کرنا تھا، بہت سے علمی کام انھوں نے ادھورے چھوڑے، ان کے بہت سے علمی عزائم اور آرزوئیں تشنۂ تکمیل رہ گئیں، جہاں تک ہم قدیم رفیقوں اور دوستوں کا تعلق ہے، اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ ؎

اے ہم نفسانِ محفلِ ما۔ رفتید و لے نہ از دل ما

❑❑❑

چند محترم احباب اور معاصر

- صوفی عبدالرب صاحب ایم۔اے
- مولانا سید ابوبکر غزنوی
- مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی
- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

صوفی عبدالرب صاحب ایم.اے

صوفی صاحب کا ذکر خیر غالباً سب سے پہلے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی سے سنا، ان کی صوفی صاحب سے مناسبت اور اتحاد کے متعدد وجوہ واسباب تھے، عقیدہ و مسلک میں دونوں ہم مذہب ہی نہیں، ہم مشرب وہم خیال ہی نہیں ہم مذاق تھے، توحید خالص حمایت سنت وشریعت، اور ردّ بدعت میں دونوں ہم رنگ اور ہم آہنگ، فرق جو کچھ تھا وہ یہ تھا کہ صوفی صاحب کی ساری تعلیم انگریزی اور اردو کی تھی، انھوں نے یہ مسلک حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی کتابوں اور مواعظ وملفوظات سے اخذ کیا تھا، وہ ان کے سلسلۂ بیعت وطریقت میں منسلک بھی تھے، اور علمائے دیوبند کے متبع وپیرو بھی، اس میں بھی حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کی شہرۂ آفاق کتاب ''تقویۃ الایمان'' کا رنگ لیے ہوئے، اس نشہ کو بھی ان کی فطری اور دینی صلابت وحمیت نے دو آتشہ کر دیا تھا، وہ دین میں مداہنت اور مروّت کے بالکل قائل نہ تھے، اور کسی بات کو حق سمجھ لینے کے بعد اس سے ایک قدم پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھے، مولانا منظور ایک عالم، صاحب قلم اور کتاب وسنت سے براہ راست واقفیت رکھنے والے بزرگ، غالباً الفرقان کے مطالعہ نے جو بریلی سے نکلتا تھا، اور صوفی صاحب اس کے مضامین اور دعوت سے پوری مناسبت رکھتے تھے، ان دونوں کو باہم ذاتی طور پر متعارف کرانے کا فرض انجام دیا، صوفی صاحب ایک مرتبہ امتحان دینے کے لیے بریلی گئے، اور مولانا کے یہاں قیام کیا، ان سے میری واقفیت کا ایک دوسرا ذریعہ ان کے حقیقی بھتیجے ماسٹر عبدالحق صاحب بھی تھے، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انگریزی پڑھانے پر مقرر ہوئے تھے، میرا بھی وہی تدریس کا زمانہ تھا، ہم دونوں ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، تفریح میں ساتھ جاتے تھے، یقیناً ان سے بار بار صوفی صاحب کا ذکر خیر سنا ہوگا، اور ان کی خصوصیات وکمالات کا علم ہو گیا ہوگا۔

جہاں تک یاد آتا ہے، پہلی ملاقات اپنے ہی محلّہ بازار جھاؤلال میں ہوئی، زمانہ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۸ء کا ہوگا، وہ غالباً مولانا حمیدالدین صاحب سے ملنے آئے تھے، جو دارالعلوم میں حدیث کے استاذ تھے، اور ہمارے محلّہ میں رہتے تھے، مولانا عرصہ تک دارالعلوم بہرائچ میں مدرس رہے، صوفی صاحب بھی وہاں گورنمنٹ اسکول میں مدرس تھے، اور دینی رشتہ ومسلک ومزاج کے اتحاد کی وجہ سے ان کے پاس آتے جاتے رہتے تھے، صوفی صاحب کی وضع ولباس بالکل مولویانہ بلکہ ایک حد تک سپاہیانہ تھی، سر پر عمامہ، پوری شرعی داڑھی، ٹخنے سے ایسا اونچا پائجامہ جو خاص متشرع حضرات یا علماء کا ہوتا ہے، جوتا بھی غالباً سلیم شاہی نری کا، ہاتھ میں سنت کے مطابق عصا، چال ڈھال گفتگو کسی چیز سے شعر وشاعری کے ذوق کا اظہار نہیں ہوتا تھا، خود قادر الکلام شاعر اور شعر کا نقاد ہونا تو الگ رہا یہ بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ خود شعر بھی موزوں پڑھ سکتے ہیں، بلکہ اس سراپا لہجہ، اور آواز سے ڈر معلوم ہوتا تھا کہ شعر سننا بھی گوارا کریں گے یا نہیں؟ کوئی ایک مخصوص صحبت تھی جس میں شاید سرسری تعارف ہوا ہو، میری کتاب سیرت سید احمد شہیدؒ جو حال ہی میں شائع ہوئی تھی، ان کی نظر سے ضرور گزری ہوگی، الفرقان میں انھوں نے میرے مضامین بھی پڑھے ہوں گے، قدرتاً وہ میرے خاندان سے واقف تھے، ان کے ایک بھائی...... حکیم علی حسن صاحب میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے طب میں شاگرد بھی تھے۔

رفتہ رفتہ صوفی صاحب سے ربط ضبط بڑھتا گیا، ان کی آمد ورفت بھی لکھنؤ زیادہ ہونے لگی، الفرقان میں ان کا کلام برابر شائع ہوتا رہتا تھا، اور اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ان کے طرز زندگی، معمولات، مذاق طبیعت، حلیہ اور اس شعر وشاعری میں کیا جوڑ ہے؟ اشعار کی روانی وبرجستگی، ترکیب وبندش کی چستی اور اصناف شاعری پر قدرت، میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا، وہ غزل، قصیدہ، نظم، مثنوی سب کچھ کہتے تھے، اور ان کے اس جوہر کے مجذوب صاحب اور جگر صاحب بھی قائل تھے، ان کی ان کے ساتھ صحبتیں رہتی تھیں، مجذوب صاحب تو خیر ان کے پیر بھائی اور خواجہ تاش تھے، جگر صاحب اس وقت خالص شاعر اور غزل کے امام تھے، اللہ نے ان کو طہارت قلب وجگر کا جو مقام عطا فرمایا تھا، وہ بعد

کی بات ہے، اس وقت تو ان کی زبان حال اور کبھی زبان قال یہی پکارتی رہتی تھی ۔

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شئی لا

پھر معلوم نہیں اتنا مختلف المشرب ہونے کے باوجود دونوں کس طرح ایک دوسرے کے معترف وقدرداں تھے، شاید جس چیز نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے قریب ومانوس کر رکھا تھا، وہ دل کی صفائی تھی، جو صوفی صاحب کا بھی سرمایہ ہے، اور جس نے جگر کو بھی اس مقام پر پہنچا دیا کہ انھوں نے ایک شاعر بادہ خوار کو مخاطب کر کے کہا ۔

تو بہت پہلے جہاں تھا، وہیں ہے اب بھی
دیکھ رندانِ خوش انفاس کہاں تک پہنچے

اس زمانہ میں صوفی صاحب نے شہدائے بالاکوٹ پر ایک بڑی طویل، پرجوش اور مؤثر نظم کہی تھی، جو انھوں نے خوشخط لکھ کر مجھے عنایت فرمائی، شاید اب بھی وہ میرے کاغذات میں موجود ہو، غالباً الفرقان میں شائع بھی ہوئی، اس میں آمد ہی آمد ہے، صوفی صاحب کی وہ عقیدت جو ان کو حضرات شہیدین، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ سے تھی، وہ اس میں چھلکی پڑتی ہے، مجاہدین کے تذکرہ میں ان کی تیغ زبان کا جوہر اور واقعات کے بیان کرنے میں قوافی لشکر کی طرح امڈتے نظر آتے ہیں، اسی زمانہ میں یا اس سے کچھ پہلے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے دبستانِ علم وفکر اور ان کی دعوت وتحریک پر ان کی ایک نظم نکلی جس کا ایک شعر اس وقت اس حالت سفر میں جب یہ مضمون محض حافظہ کی مدد سے لکھوایا جا رہا ہے یاد آ گیا ۔

یہی ہے مختصراً حکمت ولی اللہ
جسے تو مدرسہ وخانقاہ اٹھے تو سپاہ

اس ایک شعر میں انھوں نے کتنی بڑی حقیقت، اور کیسی طویل تاریخ بیان کر دی، اب وہ زمانہ آیا کہ صوفی صاحب کا تبادلہ لکھنؤ کے قریب کے اضلاع میں ہونے لگا، اس تبادلہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صوفی صاحب اپنے دینی تصلّب، جوش تبلیغ اور اپنی سمجھوتہ نہ کر سکنے والی افتادِ طبع کی وجہ سے کسی ضلع میں زیادہ دن ٹھہرنے نہیں

پاتے تھے، وہ اگر "من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ" (جو تم میں سے کوئی خلاف شرع چیز دیکھے تو اس کو ہاتھ سے بدلنے یا روکنے کی کوشش کرے) پر اگر کسی مجبوری سے عمل نہیں کر سکتے تھے تو "فبلسانہ" (تو پھر زبان سے اس کی تردید اور اس سے روکنے کی کوشش کرے) پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اس لیے اکثر افسران بالا تک ان کی شکایتیں پہنچتی رہتی تھیں، اور محکمۂ تعلیم ان کا تبادلہ کر دیتا تھا، اس تبادلہ سے ان کو جو کچھ جسمانی اور ذہنی تکلیف پہنچتی ہوگی، وہ ظاہر ہے مگر ان اضلاع اور ان شہروں کے محلوں میں ضرور ایک دینی رنگ پیدا ہو جاتا تھا، جہاں وہ تبدیل ہو کر جاتے تھے، محلّہ کی مسجد کی رونق اور آبادی میں اضافہ ہو جاتا تھا، کچھ لوگ سنتوں کا اہتمام کرنے لگتے، صوفی صاحب وہاں کچھ وعظ و پند کا سلسلہ بھی شروع کر دیتے، جس کو دیکھتے تھے کہ وہ قرآن صحیح نہیں پڑھتا ہے، اس کو تجوید کی مشق، یا اس کے قرآن کی تصحیح کا فرض انجام دیتے، اکثر جگہ اہل محلّہ امامت کے لیے انھیں سے درخواست کرتے اور وہ قبول فرما لیتے، ان کی موجودگی میں دین کا استہزاء یا بے دینی کی کوئی بات کہنا مشکل ہو جاتا، بعض لوگوں میں تلاوت کا ذوق پیدا ہو جاتا، اور لوگ مولانا تھانوی اور علمائے دیوبند کی کتابوں اور تذکروں سے مانوس ہو جاتے، اسکول میں بھی سلیم الطبع مسلمان طلبہ ان سے مانوس و متاثر ہوتے اور کچھ اساتذہ اور اسٹاف کے لوگ بھی ان سے فائدہ اٹھاتے۔

صوفی صاحب سیتاپور کے گورنمنٹ اسکول میں تبدیل ہو کر آئے، اس زمانہ میں میں عربی زبان کا ایک نصاب تیار کر رہا تھا، اس کی ریڈریں لکھ رہا تھا، مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی، جہاں میں یکسوئی اور انہماک کے ساتھ اپنا کام کر سکوں اور جہاں محکمۂ تعلیم کی تیار کرائی ہوئی ریڈریں موجود ہوں، جن سے فائدہ اٹھا سکوں، صوفی صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے سیتاپور کی دعوت دی، اور اطمینان دلایا کہ وہاں سب کچھ سہولتیں میسر ہوں گی، میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جن میں ایک عربی کے خوشخط کاتب بھی تھے، سیتاپور گیا، اور صوفی صاحب کا مہمان بن گیا، صوفی صاحب نے تمام سہولتیں مہیا کیں اور بڑی خوشدلی اور بشاشت کے ساتھ میزبانی کے فرائض انجام دیتے رہے، غالباً ہفتہ دو ہفتہ قیام رہا "القراءۃ الراشدۃ" (جواب ہندوستان کے بہت سے مدارس کے نصاب

میں داخل ہے) کا دوسرا حصہ وہیں تیار ہوا، میرے خیال میں اس پورے سلسلہ میں یہ حصہ امتیاز رکھتا ہے، اس وقت اس کا بالکل اندازہ نہ تھا کہ سیتاپور جہاں آنکھ کا مشہور اسپتال ہے، اور کہا جاتا ہے کہ ایشیا کے بڑے اسپتالوں میں اس کا شمار ہے، بار بار آنا پڑے گا، اور مہینوں اس اسپتال میں رہنا پڑے گا، یہ اس کے بعد کی بات ہے۔

کچھ عرصہ سیتاپور رہنے کے بعد حسب معمول صوفی صاحب کا تبادلہ ہوگیا، وہ کئی اضلاع میں رہے جہاں تک یاد آتا ہے، شاہ جہانپور ان کا زیادہ رہنا ہوا، محلّہ چمکنی میں ان کا قیام رہا، اس زمانہ میں لکھنؤ سے ایک تبلیغی جماعت یو، پی کے مغربی اضلاع کے دورہ پر نکلی، اس جماعت میں مولانا منظور صاحب نعمانی اور بعض ذہین انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان تھے، شاہ جہانپور سے صوفی صاحب اس جماعت کے ساتھ ہولئے، اس کی ایک منزل رامپور تھی، پھر مرادآباد، مرادآباد میں جگر صاحب مل گئے جوان دنوں وہاں مقیم تھے، انھوں نے کچھ صوفی صاحب کی وجہ سے کچھ ہم لوگوں کے تعلق کی بنا پر اور زیادہ تر اپنے اس دینی رجحان کے اثر سے جو روز بروز تیز تر ہوتا چلا جارہا تھا، اس جماعت کا بڑا ساتھ دیا، مرادآباد کے اپنے بہت سے احباب و معتقدین کو رات کے جلسہ میں لائے، ہم لوگوں سے ملایا، مرادآباد سے آگے اس جماعت کی منزل سہارنپور تھی، سہارن پور میں شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب مدظلہم العالی صوفی صاحب کی آمد سے بڑے خوش ہوئے، اور بہت جلد ان سے بے تکلف ہوگئے، صوفی صاحب بھی بڑے مانوس و مسرور رہے، واپسی پر تشکر و تاثر کا جو خط لکھا، اس میں ان کی بزرگانہ شفقت اور مہمان نوازی کو "مادرانہ شفقت" سے تعبیر کیا، سہارن پور سے ہم لوگ رامپور حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت نے بھی صوفی صاحب کے ساتھ بڑی خصوصیت برتی، حضرت رائے پوری کے لکھنؤ قیام کے زمانہ میں بھی ایک دوبار صوفی صاحب لکھنؤ آئے اور مرکز میں قیام کیا، صوفی صاحب کا اصلاحی اور تربیتی تعلق مولانا محمد عیسیٰ صاحب کی وفات کے بعد حضرت مولانا نبی اللہ صاحب فتحپوریؒ سے قائم ہوگیا تھا، اور وہ اور ان کے اکثر احباب مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری، ماسٹر ابراہیم صاحب وغیرہ سب مولانا فتح پوری ہی سے عقیدت و تربیت کا تعلق

رکھتے تھے، ایک مرتبہ صوفی صاحب کی معیت میں ان کے صاحبزادے میاں خالد عمر سلمہٗ کی شادی کی تقریب سے مجھے فتح پور تال نرجا جانے کا بھی موقع ملا۔

صوفی صاحب کا تعلق ہم دونوں (راقم السطور اور مولانا منظور صاحب) سے بڑھتا ہی گیا، مولانا منظور صاحب کے مستقل قیام لکھنؤ کے بعد ان کی لکھنؤ آمد و رفت بڑھتی گئی، وہ مختلف ضرورتوں سے لکھنؤ آتے اور خوب مجلسیں اور صحبتیں رہتیں، ان میں صوفی صاحب کا تازہ کلام سننے کا بھی موقع ملتا، اور ان کے دینی جذبات، دینی حمیت اور ان حالات و واقعات سے بھی استفادہ کا موقع ملتا جو اہل دل اور خاصانِ خدا کے حالات و واقعات کی یاد تازہ کر دیتے، ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ تھا، ان کے بعض واقعات سن کر وہ مشہور حدیث یاد آ جاتی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے بعض مستور الحال بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر کسی وقت کسی بات کے لیے قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کی لاج رکھے'' ایسے واقعات مختلف مقامات پر جہاں وہ ایک اسکول ٹیچر کی حیثیت سے مقیم تھے، اور کسی بات پر ان کی حمیت اسلام کو جوش آ گیا تھا، متعدد بار پیش آئے، اب وہ زمانہ آیا کہ صوفی صاحب اپنی ملازمت کی مدت ختم کر کے سبکدوش ہو گئے، اور ان کی ملازمت کی آخری جگہ اناؤ کا قصبہ اور ضلع تھا جو لکھنؤ اور کانپور کے درمیان واقع ہے، یہاں انھوں نے اپنی رہائش کے لیے مکان بھی خرید لیا تھا اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے تھے، قرب مکانی کی وجہ سے وہاں باہم لوگوں کا بھی آنا جانا رہتا تھا، اور صوفی صاحب بھی جلد جلد لکھنؤ تشریف لانے لگے تھے۔

وہ متعدد بار میرے وطن رائے بریلی تشریف لائے اور ہماری بستی سے جس کو حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی دعوت و جماعت سے خاص نسبت ہے، بڑے تعلق و تأثر کا اظہار کیا، صوفی صاحب پیدائشی طور پر صحت مند، جفاکش، عالی ہمت، نہایت سادہ سپاہیانہ زندگی گزارنے کے عادی تھے، میلوں پیدل چل لیتے تھے، ہر طرح کی جسمانی تکلیف اٹھا لیتے تھے، اپنے فرائض منصبی بھی بڑی مستعدی اور انہماک کے ساتھ ادا کرتے تھے، اور عبادت و شب بیداری میں بھی چاق و چوبند تھے، ہر طرح کے تکلفات و تمدن کے لوازم سے بری تھے، لیکن آخر میں وہ بہت بیمار رہنے لگے تھے، ذیابطیس کے موذی مرض نے ان

کو گھلا دیا تھا، پرہیز کے زیادہ عادی نہ تھے، انتقال کے چند سال پہلے انھوں نے موتیا بند کا آپریشن کرایا، کچھ سرجن کی بے احتیاطی اور نا تجربہ کاری اور کچھ ان کی آزاد طبیعت کہ آنکھ خراب ہوگئی، اور بصارت تقریباً زائل ہوگئی، اس کے باوجود اپنے معمولات کے سختی سے پابند تھے، محلّہ کی مسجد ہی میں نماز پڑھتے تھے، اور اکثر خود ہی امامت کرتے تھے، صوفی صاحب ہم دونوں ہی سے نہیں بلکہ ہمارے سب اہل تعلق اور افراد خاندان سے بزرگانہ اور عزیزانہ تعلق رکھتے تھے، ہماری خوشی سے خوش ہوتے تھے، اور رنج سے رنجیدہ، میری والدہ محترمہ کا ۱۹۶۸ء میں جب انتقال ہوا (جن کے حالات ومعمولات سے صوفی صاحب واقف تھے، اور ان سے عقیدت رکھتے تھے) تو انھوں نے ان کی وفات پر ایک طویل نظم لکھی جس کے لفظ لفظ سے محبت وعقیدت کا اظہار ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں ان کی شاعرانہ صلاحیت اور قادر الکلامی کا بھی، میں اگر خود شاعر ہوتا اور مجھے نظم پر قدرت ہوتی تو شاید اس سے زیادہ رنج واثر میں ڈوبی ہوئی اور محبت وعقیدت سے لبریز نظم نہ کہہ سکتا، اس نظم کا ایک بڑا حصہ میری کتاب "ذکر خیر" کی زینت ہے، جو والدہ صاحبہ کے تذکرہ کے طور پر میں نے لکھی ہے۔

ان کے خلوص وتعلق کا ایک دلکش اور دلآویز نمونہ ان کی وہ نظم ہے، جو انھوں نے ہمارے خاندانی مستقر دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی سے واپس جا کر شاہ جہاں پور میں لکھی تھی، اور جس کا محرک یہ تھا کہ میں نے رائے بریلی آنے کی دعوت دیتے ہوئے جو خط لکھا تھا، اس میں اقبال کا یہ مشہور مصرعہ لکھ دیا تھا ؎

میرے ویرانے میں بھی ہوجائے دم بھر چاندنی

انھوں نے اسی زمین اور اسی ردیف وقافیہ میں یہ نظم لکھی ہے، جو ان کے سچے جذبات کا آئینہ اور ان کی خوش گوئی اور خوش نوائی کا نمونہ ہے، ناظرین بھی اس کا لطف اٹھائیں۔

چودھویں کے چاند تم ہو اور جلوہ چاندنی　　بوئے انفاس اللہ اللہ جیسے مہکے کامنی
ایک دنیا تم کو کہتی ہے محبت کا دھنی　　آؤ مل بیٹھیں کوئی دم چھاؤں ہے کیسی گھنی

اپنی آنکھوں، اپنی ہنسیوں، اپنے میٹھے بول سے — مرنے والوں کو جلا دیتے ہو، اللہ غنی
زندگی مجھ کو نہ دیتے لیکن اے جانِ جہاں — پاؤں ہی سینے پہ رکھ دیتے بوقتِ جانکنی
روکشِ فردوس وہ تاریک قعرِ چاہ ہے — یوسفستاں جس کو کردے بھائیوں کی رہزنی
تم تو اس گنجِ شہیداں (۱) کو نہ ویرانہ کہو — رشکِ صد معمورہ ہے ایسے خزانوں کا دھنی
اے مری دولت، جہاں تم خود ہو بالنفسِ نفیس — جو اسے ویرانہ کہہ دے میری اس کی دشمنی
سر کے بل آؤں گا میں اس مرکزِ انوار میں — میں سیاہی ہوں سراپا، تم سراپا روشنی
لیکن اے رشکِ نجوم و غیرتِ شمس و قمر — تم جو آجاتے چمک اٹھتی ہماری چمکنی (۲)
روح تازہ پھونک دی اس خط نے میرے یک بیک — چھا چلی تھی چہرۂ صوفی پہ ورنہ مردنی

آہ کس کمبخت کے چکر میں صوفی پڑ گیا
ٹھوکریں کھلوا رہی ہے مجھ کو دنیائے دنی

صوفی صاحب پر بہت کچھ لکھنا تھا، اور بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے، لیکن دورانِ سفر میں بلا تمہید و ترتیب یہ چند نقوش و تأثرات لکھوا دیئے کہ معلوم نہیں پھر اتنا موقع ملے یا نہیں، ان کے کلام پر مفصل تبصرہ، ان کے محاسن شاعری کا اظہار، اور ان کی زندگی کے اس پہلو کو اجاگر کرنا اور اس کے ساتھ انصاف، کسی اور فرصت اور بہتر صلاحیت کا طالب ہے اندیشہ ہے کہ ان کے کلام کی دینی روح، ان کی دینی زندگی، اور سب سے بڑھ کر ان کا مشہور لقب اور تخلص ''صوفی'' انصاف کے لیے سدّ سکندری نہ بن جائے کہ وردی پوش اور ادب فروش ادیبوں اور نقادوں نے کبھی ایسے ادیب و شاعر کا قصور معاف نہیں کیا، جس نے ادب کو دین اور اس کے تقاضوں سے آزاد نہیں سمجھا، اور جس کی شاعری ہمیشہ دین و شریعت اور دین کی حمایت وحمیت کے زیر سایہ رہی۔

□□□

(۱) تکیہ شاہ علم اللہؒ۔ (۲) شاہ جہانپور کا ایک محلہ جو اس وقت صوفی صاحب کی قیام گاہ تھی۔

مولانا سید ابوبکر غزنوی ایم، اے

بچپن سے جن صادق العقیدہ، متبع سنت بزرگوں اور خاصانِ خدا کا نام عظمت وعقیدت کے ساتھ کان میں پڑا، ان میں مولانا سید عبداللہ غزنوی اوران کے خلف الرشید مولانا سید عبدالجبار غزنوی تھے، یہ حضرات غزنی (افغانستان) کے رہنے والے تھے، لیکن اپنے خالص عقیدۂ توحید وکامل پیروئ سنت واتباع سلف کے جرم میں ان کو افضل خاں امیر کابل کے عہد حکومت میں اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑااورانھوں نے "اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ" (جو ناحق محض اس قصہ میں اپنے وطن سے نکالے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پالنے والا اللہ ہے) کا مصداق بن کر ہجرت کی اوراپنے خاندان کے ساتھ امرتسر میں سکونت اختیار کی، وہ بڑے پایۂ کے بزرگ، داعی الی اللہ، توحید وسنت کے مبلغ اور ناشر قرآن وحدیث تھے، ان کی ولایت وبزرگی پراس نواح کے لوگوں اوراہل نظر معاصرین کا اتفاق ہے، صاحب "نزہۃ الخواطر" نے ان کوان الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے "صاحب المقامات الشهيرة والمعارف العظيمة الكبيرة" ان کو زمانہ کے لیے باعث برکت اور ہندوستان کے لیے باعث زینت لکھا ہے، تیرہویں صدی کے آخر ۱۲۹۸ھ میں انھوں نے وفات پائی۔

ان کے صاحبزادے مولانا سید عبدالجبار غزنوی اپنے والدنامدار کے قدم بہ قدم تھے، وہی توحید واتباع سنت کا غلبہ، وہی ترک وتجرید، وہی زہدوتوکل، وہی قرآن وحدیث کی اشاعت وتبلیغ کا جذبہ، مصنف "نزہۃ الخواطر" نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ "ان کی ولایت اورجلالت شان پراہل زمانہ کا اتفاق ہے" ۱۳۳۱ھ میں انھوں

نے وفات پائی، امرتسر میں وہ اپنے خاص رنگ میں قرآن مجید کا درس دیتے تھے "ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد" کے بمصداق سننے والوں کے دلوں پر وہ اثر پڑتا تھا، جو بڑے بڑے عالمانہ ومحققانہ درسوں، علمی موشگافیوں وفنی نکتہ آفرینیوں کا نہیں پڑتا، رجب ۱۳۲۰ھ (اکتوبر ۱۹۰۲ء) میں ندوۃ العلماء کا امرتسر میں سالانہ اجلاس تھا، ہندوستان کے چوٹی کے علماء اور مشاہیر شریک تھے، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی راوی ہیں کہ علامہ شبلی بھی ایک دن اس درس میں شریک ہوئے، وہاں سے آکر اپنا تاثر بیان کیا اور فرمایا کہ "جس وقت وہ شخص اپنی زبان سے اللہ کا نام لیتا تھا تو بے اختیار جی چاہتا تھا کہ سر اس کے قدموں پر رکھ دیجیے" انھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ رات کو کھانے پر جلسہ کے سب مہمان جو ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے تھے، اور مقامی علماء اور معززین بھی شریک تھے، جس کمرہ میں کھانا کھلایا گیا تھا، اس میں بیچ کے ہال کے علاوہ بغل میں دائیں بائیں کمرے تھے، دسترخوان ایک تھا، لیکن کمروں کے الگ ہونے کی وجہ سے ایک طرف کا آدمی دوسری طرف کے آدمی کو دیکھ نہیں سکتا تھا، میری نشست جہاں تھی، وہاں مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی بھی رونق افروز تھے، مولانا سید محمد علی مونگیری ناظم ندوۃ العلماء دوسری طرف کے کمرہ میں تھے، کھانے سے فراغت کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ "مولوی حبیب الرحمٰن! تمھارے پاس اور کون کون بیٹھا ہوا تھا؟ میں نے چند مشاہیر علماء کے نام بتائے، مولانا برابر پوچھتے رہے کہ اور کون تھا؟ آخر میں میں نے مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی کا نام لیا، کہنے لگے کہ ہاں اب میں سمجھا میرا دل بے اختیار اس طرف کھنچ رہا تھا، اس کی یہی وجہ تھی۔

ان حضرات کی محبت وعقیدت دل میں ایسی جاگزیں ہوگئی تھی کہ اس کو کوئی جماعتی عصبیت، کسی معاصر کی تنقید، یا مسائل وتحقیقات کا اختلاف متزلزل نہیں کرسکا، اس میں کچھ اس کو بھی دخل تھا کہ یہ حضرات عامل بالحدیث ہونے کے ساتھ اہل دل اور صاحب نسبت بھی تھے، مولانا سید عبداللہ غزنوی کو مولانا حبیب اللہ قندھاری کے واسطہ سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ میں نسبت واجازت حاصل تھی، اور اس رنگ نے کتاب وسنت کی

پیروی اور حدیث کے اشتغال وانہماک کے رنگ کے ساتھ مل کر ایک نیا رنگ پیدا کر لیا تھا، جو ان کو ایک رنگ علماء ظاہر سے ممتاز کرتا تھا، جو اس رنگ سے نا آشنا تھے، اور یہی ان حضرات کی صحبت کی اثر انگیزی اور محبوبیت وکشش کی وجہ تھی، یہی رنگ اسی جماعت کے ایک دوسرے بزرگ مولانا غلام رسول صاحب (قلعہ میہان سنگھ) کا تھا، جن کے وعظ کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ انگریزی حکومت نے اس کو بند کر دیا تھا کہ اس کو سن کر کثرت سے غیر مسلم مسلمان ہو جاتے تھے، ان کے زبان کی تاثیر اور فیض صحبت کے واقعات حد تواتر کو پہنچ گئے ہیں، جن کا انکار ممکن نہیں۔

میں مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی کا زمانہ تو کیا پاتا کہ میری ولادت بھی ان کے انتقال کے دو سال بعد ہوئی، میری یہی بڑی خوش قسمتی تھی کہ میں نے ان کے صاحبزادے مولانا سید داؤد غزنوی صاحب کو پایا اور ان کی بار بار زیارت کی، میرے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب خاندان غزنویہ سے خاص ربط ضبط رکھتے تھے، چینیاں والی مسجد میں مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے، جو مولانا عبدالجبار صاحب کے چھوٹے بھائی تھے، اور وہ اس جماعت اہل حدیث کے امام تھے، اور ان کے پیچھے بڑے شوق سے نماز پڑھنے جاتے تھے، وہ بھی قدیم تعلق کی بنا پر خصوصی شفقت فرماتے تھے، میں نے ان کے صاحبزادے مولانا اسماعیل غزنوی کو بھی دیکھا ہے، جو سلطان عبدالعزیز بن سعود اور ولی عہد سلطنت امیر سعود کے خاص معتمد ومقرب تھے، اور حجاز میں ان سے کئی بار ملا ہوں، مولانا سید طلحہ صاحب کے ساتھ مولانا داؤد صاحب غزنوی کی خدمت میں حاضری ہوئی، سانچہ میں ڈھلا ہوا جمال ظاہری، حسن مردانہ اور افغانی وجاہت کا ایک پیکر، سرو قامت دوہرا بدن، سرخ سفید رنگ، چہرہ پر حسب ونسب کا نور، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فرشتہ آسمان سے اتر کر فرشِ زمین پر آ گیا ہے، لباس بھی نظیف وجمیل، ہر ادا سے خوش ذوق اور نستعلیقیت نمایاں، بہت اچھی مجلسی گفتگو کرنے والے اور بہت اچھے مقرر، میں نے ان کی ایک تقریر خواجہ عبدالوحید صاحب کے مکان پر سنی، ایک مرتبہ

احرار کے ایک جلسہ میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے سنا، سیاست میں مولانا آزاد کے ہم مسلک اور تحریک آزادی میں ان کے ہم مشرب، شروع سے مجلس احرارالاسلام کے رہنماؤں میں رہے، اوراس سلسلہ میں مولانا عطاء اللہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن غزنوی کے ہم سفروہم رکاب، تقسیم ہند سے متصل پنجاب کانگریس کے صدر بھی رہے، اس سیاسی دلچسپی وسرگرمی کے ساتھ صاحب مطالعہ اور صاحب درس، صاحب نظر اور صاحب ذوق عالم تھے، مولانا سید طلحہ صاحب کی ملاقات ہوتی تو نئی کتابوں ہی کا تذکرہ رہتا کہ مولانا سیاست کے مردمیدان نہ تھے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتاب ''النبوات'' کا سب سے پہلے میں نے ان ہی سے نام سنا، ان کی تعریف سے مجھے بھی اس کے مطالعہ کا شوق ہوا، اور معلوم ہوا کہ ان کی تصنیفات میں اس کا امتیازی مقام ہے۔

مولانا داؤد صاحب عیدین کی نماز منٹو پارک کے میدان میں پڑھتے تھے، ہمارے استاذ وشیخ مولانا احمد علی صاحب لاہوری بالالتزام ان کے پیچھے نماز عید ادا کرتے، مولانا طلحہ صاحب اور بہت سے ان حضرات کا بھی یہی معمول تھا، جو مساجد میں عید کی نماز ادا کرنے پر میدان میں نماز پڑھنے کو ترجیح دیتے اوراسے اقرب الی السنۃ سمجھتے تھے، مجھے بھی کئی بار مولانا کے پیچھے عیدین کی نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، وہ اردو میں خطبہ بھی دیتے، جو مؤثر اور دلپذیر ہوتا۔

تقسیم کے بعد ایک مرتبہ میں لاہور حاضر ہوا تو ہمارے فاضل دوست مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب اوران کے رفقاء نے ازراہِ محبت جامعہ سلفیہ میں میرے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی اور اپنی جماعت کے ممتاز لوگوں اور فضلاء ندوہ کو مدعو کیا، میں حاضر ہوا تو میری حیرت وندامت کی انتہا نہیں رہی کہ مجھے وہاں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا اور مولانا داؤد غزنوی صاحب نے جو میرے اساتذہ اور بزرگوں کی صف میں تھے، خود پڑھا، یہ ان کی بےنفسی اور تواضع کی انتہا تھی، اوراس سے اس تعلق کا اندازہ ہوسکتا ہے جو ان کو حضرت سید صاحب اوران کے خاندان اور مسلک سے تھا، ۱۹۶۲ء میں جس سال ''رابطۂ عالم اسلامی'' کی بنیاد پڑی، وہ حج کرنے آئے تھے، رابطہ کے پہلے اجلاس میں بھی وہ شریک ہوئے،

اور اس کے رکن منتخب ہوئے، مدینہ طیبہ کے ہوٹل ''فندق التیسیر'' میں ان کی خدمت میں کئی بار حاضری ہوئی، وہاں ان کو قلبی دورہ پڑا، طبی امداد بروقت پہنچی، اللہ نے فضل فرمایا اور وہ بخیریت لاہور واپس ہوئے، یہ ان کی آخری زیارت وملاقات تھی، جو نصیب ہوئی۔

لاہور کے قیام کے زمانہ میں ان کے صاحبزادے مولانا سید ابوبکر غزنوی سے تعارف ہوا، وہ اس وقت غالباً اسلامیہ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے، معلوم ہوا کہ ان کو عربی ادب کا بڑا اچھا ذوق ہے، خاندانی اثرات ان میں آئے ہیں، طبیعت میں بڑی صلاحیت، دین کا ذوق اور مردانِ خدا کی تلاش اور اصلاحِ حال اور ترقی باطن کی فکر رہتی ہے، میں نے براہ راست یا کسی واسطہ سے اپنی عربی کی بعض تصنیفات پیش کیں، بڑی مسرت کا اظہار کیا اور اندازہ ہوا کہ عربی کا صحیح ذوق رکھتے ہیں جو اس وقت یونیورسٹیوں کے فضلاء تو الگ رہے، عربی مدارس کے اساتذہ میں بھی کم یاب ہے، اس کے بعد وہ برابر اپنے عہدہ میں ترقی کرتے رہے، وہ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے صدر ہو گئے، میں ''برگ سبز است تحفۂ درویش'' کے طور پر اپنی عربی اردو تصنیفات کسی ذریعہ سے پہنچاتا رہا کہ ان کو اہل نظر اور اہل ذوق بھی سمجھتا تھا، اور مصنفین اور اہل قلم کی یہ جماعتی اور شاید عالمی کمزوری ہے کہ ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تحریریں اور نقوش قلم اہل نظر اور اہل ذوق کی نظر سے گزریں، میں نے مولانا اسماعیل شہیدؒ کی ''تقویۃ الایمان'' کا ترجمہ ''رسالۃ التوحید'' کے نام سے عربی میں کیا تو ان کی خدمت میں بھیجا کہ وہ خود اس مسلک کے حامل وداعی ہیں، اُدھر ان کی کتاب اپنے والد ماجد کے تذکرہ میں شائع ہوئی جس میں انھوں نے از راہ محبت میری بھی ایک تحریر شامل کی تھی، اس کتاب کے ساتھ جو خط آیا وہ درج کیا جاتا ہے، افسوس ہے کہ خط پر کوئی تاریخ نہیں ہے، لیکن وہ دار العلوم تقویۃ الاسلام لاہور معروف بہ مدرسہ غزنویہ سلفیہ شیش محل روڈ، لاہور سے لکھا گیا۔

''کئی برسوں سے روح آپ کی متلاشی ہے، اور جی آپ سے ملنے کا آرزو مند ہے، ایک یا دو خط بھی شاید رابطہ عالم اسلامی کے پتہ پر آپ کو

بھیجے تھے، آپ کی خدمت اقدس میں کچھ وقت علمی اور روحانی استفادہ کے لیے رہنا چاہتا ہوں، آپ سے ملاقات کی کیا تدبیر کروں؟ مستقبل قریب میں پاکستان آنے کا کوئی پروگرام آپ کا ہے؟

''البعث الاسلامی'' رابطہ عالم اسلامی کے اخبارات اور مجلات بندۂ عاجز کو نہیں ملتے اور انھیں دیکھنے کا اشتیاق ہے۔

حضرت والد علیہ الرحمہ پر ایک کتاب حال میں راقم نے مرتب کی ہے، جس میں آپ کی بھی ایک تحریر شامل ہے، آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، قبول فرمایئے۔

اگر مناسب خیال فرمائیں تو ''البعث الاسلامی'' میں تبصرہ بھی فرما دیجئے، آپ کی کتاب ''رسالۃ التوحید'' مل گئی تھی، ترجمہ بہت حسین اور معیاری ہے، کرم فرمائی کے لیے ممنون ہوں''۔

نیاز مند سید ابوبکر غزنوی

ان کا ایک خط اور درج کیا جاتا ہے، جو میرے عریضہ کے جواب میں ہے...... اس سے ان کے حقیقی جذبات اور دلی کیفیت کا کسی قدر اندازہ ہوسکتا ہے، اس سے ان کے قلب بیدار اور روح مضطرب کا بھی اندازہ ہوتا ہے، جس نے ان کو دنیاوی اعزاز، علمی ترقیوں اور دنیاوی مقاصد کے حصول پر مطمئن نہیں رہنے دیا اور جو اقبال کی زبان میں ان سے کہتی رہی۔

مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں......

اسی بے اطمینانی اور روح کی تسکین کے سامان، اور مقصد زندگی کی تکمیل کے خیال نے لوگوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے، اس خط میں مکتوب الیہ کی نااہلیت سے صرف نظر کر کے اور یہ کہ اس کا مخاطب کون ہے، لکھنے والے کے جذبہ اور اس کی اندرونی کیفیت کو دیکھنا چاہئے۔

''آپ کا شفقت نامہ ملا، باعث تسکین خاطر بھی ہوا، اور شوق کی دبی ہوئی چنگاریوں کو سلگانے کا سبب بھی۔

أرى تحت الرماد وميض نار
ويوشك أن يكون لها ضرام

مکتوب گرامی ملا، پھر اردو کی تصنیفات ملیں، پھر عربی کی کتابیں آئیں، آپ کی نوازشیں پیہم ہونے لگیں۔

ہر مو میرے بدن پہ زبان سپاس ہے

ایک عرصہ سے روح کا رخ آپ ہی کی جانب ہے۔

جمالك في عيني وحبك في قلبي
وذكرك في فمي فأين تغيب

شاید روحانی استفاضہ مقدر ہو، وہ مقلب القلوب ہے، جس نے میرے دل کو آپ کی جانب پھیر دیا ہے، مجھے آپ کی خدمت میں پہنچانے پر بھی قادر ہے ایک عرصہ سے باتیں دو ہی پیش نظر ہیں، تزکیہ اور تعلیم کتاب وحکمت، افسوس نہ تزکیہ ہوسکا، نہ تحصیل علم دین کا حق ادا ہوا۔

خورشید عمر برسر دیوار وخفتہ ایم
فریاد از درازیٔ خواب گران ما

حضرت! بندۂ عاجز نے حرمین شریفین میں دعا کی تھی، یا اللہ کوئی ایسا صاحب حال محدث عطا فرما جس کے ساتھ صحاح ستہ کا دورہ کروں اور ایک سال حدیث شریف اور درود شریف میں مستغرق رہوں۔

روحانی استفاضہ اور دورۂ حدیث کی کوئی صورت پیدا کیجئے، خدا کے لیے ڈاک اس پتہ پر ارسال فرمایئے''۔

شعبۂ علوم اسلامیہ — نیاز مند
انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور — ابوبکر غزنوی

مولانا ابوبکر غزنوی اس کے بعد دینیات یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر منتخب ہوئے، جس کے وہ ہر طرح سے اہل تھے، افسوس ہے کہ ان سے برسوں سے ملاقات نہیں

ہوئی تھی، ۱۹۷۶ء میں رباط میں جامعات اسلامیہ (اسلامک یونیورسٹیز) کے وفاق "جمعیۃ الجامعات الاسلامیہ" کا جلسہ تھا، جس کا نام اب "رابطۃ الجامعات الاسلامیہ" ہے، میں بھی ناظم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے اس کا رکن اور جلسہ میں شریک تھا، وہاں پاکستان سے جو مندوب آئے تھے، ان سے میں نے پوچھا کہ اور کن مندوبین کے آنے کی توقع ہے، اس لیے کہ اب پاکستانی احباب وفضلاء سے ملاقات کے یہی مواقع رہ گئے ہیں کہ ہندوستان، پاکستان سے باہر کسی علمی انجمن میں ملاقات ہوجائے، انھوں نے کہا کہ دینیات یونیورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلر مولانا سید ابوبکر غزنوی بھی شرکت کے لیے آرہے ہیں، بڑا خوش ہوا کہ ہم دونوں دوست ایک دوسرے سے ملیں گے، اور عہد کہن کو تازہ کریں گے، اچانک ایک دن یہ صاعقہ اثر خبر سنی کہ وہ لندن میں موٹر کے ایک حادثہ سے دوچار ہوئے اور اس سے جانبر نہ ہوکر وہیں جان جانِ آفریں کے سپرد کی "وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ" نعش پاکستان لے جائی گئی، اور غالباً وہیں اپنے خاندانی قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔

ان کی باطنی صلاحیتوں، علمی کمالات، خاندانی اثرات اور طلب وجستجو کو دیکھ کر فارسی کا یہ مشہور مصرعہ پڑھنا پڑتا ہے ؎

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

یہ چند سطریں جن سے کسی طرح ان کا حق ادا نہیں ہوسکتا، ایک عزیز یادگار کو باقی اور ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے لکھ دی گئیں کہ شاید کوئی صاحب دل ان کو پڑھ کر اس جواں مرد وجواں مرگ کے لیے دعائے خیر کردے کہ اگر ان کی زبان قال یا زبان حال گویا ہوتو شاید سعدی کے الفاظ میں یہی کہے۔

غرض نقشیست کز ما یاد ماند   کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحب دلے روزے برحمت   کند بر حال ایں مسکیں دعائے

□□□

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم

قلب وقلم کو دنیا میں کیسے کیسے مشکل کام کرنے پڑتے ہیں کہ اگر اللہ ہی ہمت وقوت نہ دے اور ایمان اور رضا بالقضا کا سہارا نہ ہو تو دونوں جواب دے جائیں اور کسی کام کے نہ رہیں۔ ع

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں

انھی تین مہینوں میں دو ایسے عزیز جدا ہوئے جن میں سے اگر ایک لخت جگر تھا تو دوسرا قوت بازو(۱)، اب یہ تیسرا حادثہ ایک ایسے ہمدم دیرینہ، ایک ایسے دوست ورفیق کی جدائی کا پیش آیا جس کا تقریباً نصف صدی کا ساتھ رہا، ساتھ پڑھا، ساتھ پڑھایا، دارالعلوم کی تعلیم وتدریس اور ندوۃ العلماء کی تعمیر وترقی میں چولی دامن کا ساتھ رہا، "الندوہ" (دور سوم) کی ادارت وذمہ داری، پھر ادارۂ تعلیمات اسلام کے قیام واستحکام، اور اس کے ذریعہ قرآن مجید کی خدمت اور عربی زبان کی تعلیم واشاعت اور اس کے ترجمان اخبار "تعمیر" کی ادارت وترتیب میں ہم دونوں ایک دوسرے کے رفیق کار وشریک حال رہے، پھر ندوۃ العلماء کے کاموں میں (بحیثیت معتمد تعلیمات) ان کے گراں قدر مشورے، دارالمصنفین میں بحیثیت شریک ناظم ان کی قیمتی رہنمائی واعانت، اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی پوری پوری نیابت کس کس چیز کو یاد کیا جائے اور بیک وقت یہ سب مسندیں خالی اور محفلیں سونی ہو جائیں، تو کس طرح دل کو تسلی دی جائے، اور آنکھوں

(۱) اس سے مراد برادرزادۂ عزیز مولوی محمد الحسنی مدیر "البعث الاسلامی" اور مولوی اسحٰق جلیس ندوی مدیر "تعمیر حیات" ہیں۔

کے سیل رواں کو تھاما جائے ع

یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

عقیدہ ومسلک سے لے کر تاریخ اسلام کے نظریات، قدیم نظام تعلیم وتربیت کے بارے میں خیالات، ندوہ کے مقاصد اوران کی صداقت اوراس عہد میں ان کی ضرورت پر غیر متزلزل یقین، اسلام کی دین ودنیا کی جامعیت پر کامل شرح صدر، قدیم وجدید کے صالح ونافع اجزاء کے خوشگوار امتزاج کی ضرورت پر مستحکم عقیدہ، علماء کے منصب قیادت سے دست کش یا معزول ہوجانے اوردین وسیاست کی تفریق کو زوال امت کا اصل سبب قرار دینے پر پورا وثوق اوراس صورت حال کو تبدیل کرنے کی شدید خواہش، اصلاح نصاب، علوم اسلامیہ اورعلوم عصریہ کے عمیق وتحقیقی مطالعہ کے ذریعہ علماء کو ان کا کھویا ہوا مقام دلانے کی کوشش، یہ سب وہ افکاروخیالات ہیں جن سے مولانا عبدالسلام صاحب عمر بھر وابستہ اوران کے پُر جوش داعی رہے، اور جو ان کے عقیدہ کا جز بن گئے تھے، اور جس نے کسی دور میں بھی ان کو ندوۃ العلماء کی تحریک اوراس کی دعوت سے بے تعلق نہیں ہونے دیا، ان مقاصد کے حصول کا سب سے مؤثر ذریعہ اوران کے لیے کوشش کرنے کا سب سے مناسب میدان وہ ندوۃ العلماء اوراس کے دارالعلوم کو سمجھتے رہے، آج جب وہ دنیا میں نہیں ہیں، تو ان سطور کے لکھنے والے کو اس کے اعلان واعتراف میں ذرا تامل نہیں بلکہ خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اس نے ان خیالات ونظریات میں مولانا سے بہت کچھ سیکھا اوران پر اس کے یقین کے مستحکم ہونے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

راقم السطور کہنے کو تعلیم کے اخیر مرحلہ میں ان کا رفیق درس رہا لیکن دونوں کی عمروں میں ۷سال کا تفاوت تھا(۱) میں جب دارالعلوم آیا تو اگرچہ عربی زبان وادب کا (عرب اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے) مجھے خصوصی ذوق پیدا ہوگیا تھا، لیکن عام معلومات اورمطالعہ کے وسعت وتنوع میں مولانا مجھ سے بہت فائق تھے، وہ نابغۂ

---

(۱) مولانا کی پیدائش ۷/مارچ ۱۹۰۷ء کی ہے، اورمیری جنوری ۱۹۱۴ء کی۔

جواں سال و جواں مرگ مولانا عبد الرحمٰن صاحب ندوی نگرامی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء کے فیض صحبت و تربیت سے جن سے وہ سب سے زیادہ متاثر تھے، اردو کے ایک اچھے مقرر اور مضمون نگار بن چکے تھے، اور ان کا فکر و شعور بیدار ہو چکا تھا، ۱۹۲۶ء کے ندوۃ العلماء کے اجلاس کانپور میں جہاں میں ایک کمسن تماشائی کی حیثیت سے گیا تھا، مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی صدارت اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں اور بہت سے مشاہیر ہند اور زعمائے ملت کی موجودگی میں مولانا کی اردو میں تقریر ہوئی تھی، وہ مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور ندوۃ العلماء ــــــ اور دار المصنفین کے پیدا کیے ہوئے لٹریچر پر پورے طور پر حاوی تھے، ندوۃ العلماء کی تحریک کی پوری تاریخ ان کے دماغ میں محفوظ تھی، ندوۃ العلماء کے بانیوں اور کارکنوں اور ان کے مراتب و درجات سے بھی وہ خوب واقف تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو سلامت طبع، ذہنی اعتدال ــــــ تواضع اور شرافت نفس کی دولت سے بھی بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا، اس لیے وہ سب کے مرتبہ شناس اور قدرداں تھے، غلو، مبالغہ اور عصبیت سے ان کو فطری طور پر مناسبت نہ تھی، اور دل آزاری اور کسی کی توہین و تحقیر (خواہ وہ ادارہ ہو یا فرد) ان کے مسلک میں کبیرہ گناہ تھا، نصاب تعلیم کے تغیر پذیر اور علوم اسلامیہ کے ترقی پذیر ہونے پر ان کا پختہ عقیدہ تھا، ان کے نزدیک ان میں زمانہ کا ساتھ دینے بلکہ اس کی قیادت کرنے اور اس کے جائز تقاضوں کے پورا کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، سیاسی خیالات میں وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ تھے، ان کا ذہنی نشو و نما "الہلال" و "ہمدرد" کے مضامین، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کی تقریروں اور تحریک خلافت کے دور میں ہوا تھا، اور ان کے اثرات سے وہ آخر عمر تک آزاد نہیں ہوئے۔

۱۹۳۴ء سے ہم دونوں دار العلوم کے حلقۂ تدریس سے وابستہ ہو گئے، ابتدا میں ان کا تقرر تاریخ و اقتصادیات کے استاد کی حیثیت سے ہوا لیکن جلد ان کو عربی و دینیات کے اسباق پڑھانے کو مل گئے، مولانا کی طبیعت چونکہ بڑی بے ہمہ و باہمہ واقع ہوئی تھی،

ان میں بڑی بے تکلفی وسادگی تھی، طلبہ پر شفقت ان کے ذاتی معاملات سے بھی دلچسپی وہمدردی، اور ان کے ساتھ مساوات کا معاملہ ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، وہ ضوابط واحکام اور سرزنش وتعزیر سے زیادہ افہام وتفہیم اور نصیحت وتلقین کی افادیت پر یقین رکھتے تھے، اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملہ میں محبت وہمدردی اور اخلاق کے اثر کے قائل تھے، اس لیے طلبہ ان سے سب سے زیادہ مانوس اور ان سے قریب ہوگئے تھے، طلبہ کے ساتھ ان کا یہ طرزِ عمل بعض اوقات منتظمین کے لیے مشکلات کا باعث بن جاتا، اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی سادگی، صاف گوئی اور بے تکلفی بعض مرتبہ طلبہ کے لیے وجہ آزمائش بن جاتی، اس سلسلہ میں یہ لطیفہ قابل ذکر ہے کہ چونکہ ان کے سامنے ندوۃ العلماء کے اعلیٰ مقاصد اور اس کے دار العلوم کا وہ اونچا تخیل تھا، جو اس کے بانیوں نے پیش کیا تھا، اس لیے وہ اکثر طلبہ سے بے تکلف کہہ دیا کرتے تھے کہ ''بھئی ہم لوگ اس دار العلوم میں تعلیم ورہنمائی کے منصب پر فائز ہونے کے لائق نہیں، علمی اور ذہنی حیثیت سے ہم سے کہیں بلند پایہ استاذ دار العلوم کے شایانِ شان تھے، مگر کیا کیا جائے کہ قحط الرجال کی وجہ سے یہ خدمت ہم جیسوں کو انجام دینی پڑ رہی ہے'' یہ بات انھوں نے بار بار کہی، میں نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ ''مولانا اب زمانہ اس تواضع وکسر نفسی کا قدرداں نہیں، آپ تو یہ بات تواضعاً کہتے ہیں، لیکن طلبہ اس کو نہ صرف حقیقت سمجھ لیں گے بلکہ وہ تمام اساتذہ کو اسی نظر سے دیکھنے لگیں گے، اور اپنے کو مظلوم سمجھیں گے کہ ایسے کم مایہ اساتذہ ان کو پڑھانے پر مامور ہیں، اس سے بجائے فائدہ پہنچنے کے نقصان پہنچے گا، اور اساتذہ کی وقعت ان کی نگاہ میں کم ہوجائے گی، جس کی وجہ سے وہ استفادہ سے محروم رہیں گے، لیکن یہ مولانا کا مزاج تھا اور وہ اس عادت کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔

وہ نہ صرف درجہ کے استاد تھے بلکہ طلبہ کے اتالیق ونگراں اور ان کے مطالعہ اور علمی ترقی کے مشیر ورہنما بھی تھے، طلبہ کی انجمن ''الاصلاح'' کے وہ ناظم بھی رہ چکے تھے، اور اس کی افادیت کے بڑے قائل تھے، وہ اس کے اردو کے ذخیرۂ کتب اور رسائل سے فائدہ اٹھانے

کا برابر مشورہ اور ترغیب دیتے رہتے تھے، اوران کی اس ہدایت وترغیب سے بہت سے ذہین طلبہ نے فائدہ اٹھایا اور وہ اردو کے اچھے مضمون نگار اور صحافی اور مصنف بن گئے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ندوۃ العلماء کے ناظم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب، معتمد تعلیمات مولانا سید سلیمان ندوی، اور مہتمم ان کے استاد اور شیخ مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ تھے، تینوں ان کی صلاحیتوں کے قائل اوران پر اعتماد رکھتے تھے، جہاں تک مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کا تعلق ہے، ان کے تلامذہ میں مولانا عبدالسلام صاحب اور مولوی رئیس احمد جعفری ان کے محبوب ترین ومقرب ترین شاگرد تھے، مولانا سے (جن کو حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے خلافت حاصل تھی) انھوں نے بیعت وارادت کا تعلق بھی قائم کر لیا تھا، طلبہ کے ساتھ اس خصوصی تعلق کی بنا پر طلبہ کے معلوماتی دوروں اور ہندوستان کے تاریخی شہروں اور علمی مرکزوں میں جانے کے لیے طلبہ کے ساتھ بحیثیت نگراں اور سرپرست کے انھی کا انتخاب ہوتا، اس سلسلہ میں وہ طلبہ کو دیوبند، سہارن پور اور لاہور تک لے گئے، ان سب مرکزوں میں طلبۂ دارالعلوم کی بڑی پذیرائی ہوئی، استقبالیہ جلسے ہوئے، جن میں وہاں کے بڑے اساتذہ اور سرپرستوں نے تقریریں کیں، دیوبند میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے، اور مظاہر العلوم میں مولانا اسعد اللہ صاحب نے تقریر فرمائی اور مولانا نے اس کا موزوں طریقہ پر جواب دیا، لاہور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے شفقت وعنایت کا معاملہ فرمایا، ایک مرتبہ مجھے بھی ان کے اور طلبہ کے ساتھ دہلی اور آگرہ جانے کا اتفاق ہوا، ہندوستان کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا، اس لیے ان کی رفاقت سے طلباء کو گراں قدر علمی فائدے ہوئے۔

جنوری ۱۹۴۰ء (مطابق ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ) میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے حکم سے "الندوہ" کا سہ بارہ اجراء ہوا، اس کی ادارت کے لیے قرعۂ فال ہم دونوں کے نام پڑا، اس وقت اس اشتراک عمل کا ایک دوسرا میدان سامنے آیا، جنوری ۱۹۴۰ء تا جولائی ۱۹۴۲ء تک جاری رہنے کے بعد مالی دشواریوں کی بنا پر رسالہ کو بند کرنا پڑا، یہ وہ دور تھا جب ندوۃ

العلماء مالی بحران کے دور سے گزر رہا تھا، تنخواہوں کا بھی وقت پر تقسیم ہونا مشکل ہو رہا تھا، اس بنا پر ناظم صاحب ندوۃ العلماء کی ہدایت پر ایک وفد کا جنوبی ہند کا دورہ طے پایا، یکم مئی ۱۹۴۳ء کو یہ وفد روانہ ہوا، اس وفد کے قائد و سرپرست حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب تھے، اور رکن ہم تین، مولانا مرحوم، مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی نائب مہتمم دارالعلوم، اور یہ راقم السطور، اس وفد نے ناگپور اور مدراس کا دورہ کیا، سفر میں ایک دوسرے کا ایسا تجربہ ہوتا ہے جو حضر میں سالہا سال کی یکجائی میں نہیں ہوتا، بہت سی کمزوریاں جن پر پردہ پڑا رہتا ہے، سفر میں بے نقاب سامنے آجاتی ہیں، مولانا کی بے نفسی، سادگی اور تواضع کھل کر سامنے آئی اور ہم میں سے کسی کو اس طویل سفر میں دوسرے سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

پھر ۱۹۴۳ء میں وہ وقت آیا کہ بعض خاص حالات کی بنا پر ان کو دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی، یہ ان کے لیے زندگی کا بہت سخت مرحلہ تھا کہ ندوۃ العلماء کی تحریک اور اس کا دارالعلوم ان کے دل و دماغ میں ایسا رچ بس گیا تھا، اور ان کی زندگی اس سے ایسی مربوط ہوگئی تھی کہ اس سے علیحدگی و کنارہ کشی ان کے لیے ایک ذہنی صدمہ تھا، اس سے ان کی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہوتا تھا جس کا کسی اور چیز سے پُر ہونا مشکل تھا، خدا جزائے خیر دے لکھنؤ کے ان چند صاحب ذوق، عالی ہمت عمائد اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو جوان کے درس قرآن میں شرکت کرتے تھے کہ انھوں نے لکھنؤ میں ایک ادارہ کی بنیاد ڈال دی جس کا نام "ادارۂ تعلیمات اسلام" تھا، ان میں پیش پیش سید صغیر حسن صاحب اسسٹنٹ سکریٹری حکومت یوپی، شیخ ظہور الحسن صاحب ڈپٹی سکریٹری حکومت یوپی (بعد میں ریونیو سکریٹری اتر پردیش) اور سید اصغر حسین صاحب گورنمنٹ ایڈوکیٹ یوپی تھے، اس طرح مولانا کی دارالعلوم سے علیحدگی ایک بڑے خیر کا ذریعہ بن گئی "ادارۂ تعلیمات اسلام" میں مولانا نے قرآن مجید کے ذریعہ اور کم سے کم قواعد کی مدد سے عربی زبان سکھانے اور قرآن مجید کے فہم و مطالعہ کے لیے تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا، انھوں نے اس کے لیے "عربی

زبان کے دس سبق" کے نام سے ایک رسالہ تیار کیا جو ہندوستان میں بے حد مقبول ہوا اور ہزاروں آدمیوں کے عربی زبان سے واقف ہونے اور اس کا طالب علم بننے کا سبب بن گیا، بہت جگہ یہ رسالہ نصاب میں بھی داخل ہے، اور اس کے بار بار ایڈیشن نکلے، اس کے ساتھ انھوں نے تمرین الدروس (۱،۲،۳) اور قرآن مجید کی پہلی، دوسری، تیسری کتاب کا بھی سلسلہ شروع کیا، لکھنؤ میں سکریٹریٹ اور دفتروں میں کام کرنے والوں، کالجوں میں پڑھنے والوں، اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد یہاں عربی زبان سیکھنے اور قرآن مجید پڑھنے آنے لگی اور اس میں دینی ذوق اور عربی کا شوق پیدا ہوا، اور بہت سے لوگ اس قابل ہو گئے کہ وہ قرآن مجید سمجھ کر پڑھنے لگیں، مولانا کی محبت واخلاق اور سادگی وتواضع نے ان کو اور گرویدہ کیا اور یہ ان کے دین اور علمائے دین سے قریب ہونے کا ذریعہ بنا۔

ان باقاعدہ اسباق اور جماعتوں کے علاوہ ادارہ میں دو عمومی درس ہوتے تھے، ایک قرآن شریف کا جس کا ذمہ میں نے لیا تھا، اور ایک حدیث شریف کا جو اکثر مولانا دیا کرتے تھے، قرآن شریف کے درس میں حاضرین کی تعداد سیکڑوں پہنچنے لگی حتی کہ ادارۂ تعلیمات اسلام کا ہال اس کے لیے ناکافی ثابت ہوا، اور اس کا انتظام عمارت کی وسیع چھت پر کیا گیا، اس وقت اس درس اور ادارۂ تعلیمات کی طرف ایسا رجوع ہوا کہ اگر لکھنؤ میں جمعہ کے دن بعد مغرب کسی اعلیٰ عہدہ دار مسلمان اور صاحب ذوق انگریزی داں کو تلاش کرنا ہوتو اس کے ملنے کی جگہ یہی تھی۔

اسی کے ساتھ مسلمانوں کے شعور کی تربیت (جس کی ضرورت ۴۲، ۴۳، ۱۹۴۴ء کے بعد شدت سے محسوس ہونے لگی تھی) اور دینی واقفیت کے لیے "تعمیر" کے نام سے ستمبر ۱۹۴۸ء سے ایک دینی رسالہ کا اجراء بھی عمل میں آیا، مولانا اور راقم السطور کا نام بحیثیت مدیر کے درج ہوتا تھا، اس رسالہ میں بڑے فکر انگیز اور ایمان افروز مضامین شائع ہوئے اور یہ پرچہ سنجیدہ حلقوں میں مقبول ہو گیا، واقعہ یہ ہے کہ "ادارۂ تعلیمات اسلام" ایک ایسا ثقافتی اور تربیتی مرکز بن گیا تھا، جس کی دور دور مثال نہیں تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے

بعض ذہین فضلاء جن میں مولانا عبدالغفار ندوی (حال سکریٹری جماعت اسلامی اترپردیش) علی احمد کیانی مرحوم، مشیرالحق صاحب بحرآبادی (حال ڈاکٹر مشیرالحق صدر شعبۂ اسلامیات وعربی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، کچھ دن فاضل گرامی عم محترم مولانا سید محمد طلحہ صاحب ایم.اے نے بھی وقت دیا اور لوگوں نے ان کے وسیع علم وتبحر سے فائدہ اٹھایا۔

مگر افسوس ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جو بادخزاں چلی، اس نے اس پھلنے پھولنے والے درخت کو بھی خشک کردیا، اس کی مالی حالت شروع سے غیر مستحکم تھی، اس کا انحصار صرف اس کے بانیوں کی اعانت اور مولانا عبدالسلام صاحب کے جذبۂ ایثار وقربانی اور ان کے چند رفقاء کے خلوص وتعاون پر تھا، کچھ عرصہ تک تو مولانا اور ان کے رفقاء نے ان حالات کا مقابلہ کیا اور اس کو قائم رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے، لیکن بالآخر حالات کے سامنے ان کو سپر ڈالنی پڑی، وہ چراغ کو تیل بتی کے بغیر زیادہ دن جلا نہیں سکتے تھے، یہی زمانہ تھا جب مولانا کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ دینیات کی نظامت کی پیش کش ہوئی، جامعہ سے ان کے گوناگوں تعلقات تھے، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعد وہیں چلے گئے تھے اور کئی سال رہ کر انھوں نے انگریزی زبان اور جدید علوم سے واقفیت میں اضافہ کیا تھا، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ان کے پرانے استاد اور بزرگ تھے ـــــ وہ ان کی علمی وذہنی صلاحیتوں اور خوبیوں سے واقف تھے، مولانا نے اس کو لطیفۂ غیبی سمجھا اور رفقاء نے بھی زیادہ مزاحمت نہ کی کہ وہ خود خدمت کا ایک بڑا میدان ہے، اور مولانا اپنے مذاق ومزاج اور اپنے ذہن وقلب کی وسعت کی وجہ سے وہاں بڑی مفید خدمت انجام دے سکتے ہیں، مولانا نے اس پیش کش کو قبول کیا، ۱۷ راگست ۱۹۵۱ء میں وہ جامعہ منتقل ہوگئے، مولانا نے نہ صرف یہ کہ اس شعبہ کے معیار وروایات کو (جس پر کبھی مولانا خواجہ محمد عبدالحی فاروقی اور مولانا محمد اسلم جیراجپوری فائز رہ چکے تھے) برقرار رکھا بلکہ اس کے وقار میں اضافہ کیا، وہ بہت جلد وہاں کی مرکزی دینی شخصیت بن گئے، اس شعبہ کی سربراہی کے فرائض کے علاوہ

جمعہ کا خطبہ دیتے تھے اور گویا جامعہ کے امور مذہبی کے پورے نگراں و ذمہ دار تھے، وہ اپنی فراخدلی اور فراخ نظری کی وجہ سے قدیم و جدید دونوں حلقوں میں مقبول و معتمد بن گئے، ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب دونوں ان کے علم، ان کی شرافت اور ان کے خلوص کے قائل تھے، عابد صاحب کے رسالہ ''اسلام اور عصر جدید'' کے ایڈیٹوریل بورڈ میں بھی شامل ہو گئے، اور اس کی کمیٹی کے رکن رکین بن گئے اور آخر وقت تک رہے۔

بالآخر جامعہ سے بھی سبکدوشی کا زمانہ آیا، اور ۳۰/اپریل ۱۹۷۲ء کو ریٹائرڈ ہوئے، اور وہ بہت اعزاز و احترام کے ساتھ اس سے رخصت ہوئے، انھوں نے بقیہ زندگی علم و دین کی خاموش خدمت لکھنے، پڑھنے اور اپنے وطن مالوف میں گزارنے کا ارادہ کر لیا، ندوۃ العلماء کے وہ قدیم زمانہ سے رکن چلے آرہے تھے، اب اس سے بہتر موقع نہ تھا کہ ان کے علم و تجربہ اور خلوص دلسوزی سے فائدہ اٹھایا جائے، چنانچہ مجلس انتظامی نے (۲۶/شعبان ۱۳۹۲ھ، ۵/اکتوبر ۱۹۷۲ء) ان کو باتفاق آراء دار العلوم کا معتمد تعلیمات منتخب کیا، اور اسی حیثیت سے انھوں نے ۱۹۷۵ء کے پچاسی سالہ تاریخی جشن ندوۃ العلماء میں اپنی فاضلانہ رپورٹ پڑھی، ندوۃ العلماء کے مزاج اور دار العلوم کی تعلیمی ضروریات سے ان سے زیادہ پورے حلقہ میں کوئی واقف نہ تھا، ندوۃ العلماء کے مقاصد کے بارے میں وہ بڑے ذکی الحس اور غیور واقع ہوئے تھے، اور دار العلوم کو اس کی اسی حقیقی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے، جو بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیری اور علامہ شبلی کی تمناؤں، اعلانوں اور ان کی تحریروں اور خطوط میں پائی جاتی ہے، ان کو عمر بھر اسی خواب کی تعبیر کے دیکھنے کی تمنا رہی جو ان دونوں بزرگوں اور ان کے باکمال و روشن ضمیر رفقاء نے گزشتہ صدی عیسوی کے آخر میں دیکھا تھا، وہ ہمیشہ اسی پیمانہ سے ندوۃ العلماء کی ترقیات کو جانچتے اور پرکھتے تھے، اور اسی نقطۂ نظر سے خود میرا اور دوسرے رفیقوں کا محاسبہ کیا کرتے تھے، ان کے نزدیک ندوۃ العلماء کی کامیابی کا حقیقی پیمانہ یہ تھا کہ مختلف علوم اسلامیہ کے ماہرین فن اور صاحب تحقیق و نظر عالم پیدا ہوں، جو اس عہد انقلاب میں مسلمانوں کی دینی و علمی رہنمائی علیٰ وجہ

البصیرۃ کرسکیں اور علماء کا اعتماد بحال اور علوم اسلامیہ کے تفوق کا نقش قائم کرسکیں، افسوس ہے کہ ان کی وفات کے بعد اب ایسا کوئی آدمی نہ رہا جو خود ذمہ داران وکارکنانِ ندوۃ العلماء کا احتساب کرسکے اور ان کی خامیوں اور غلطیوں پر ان کو متنبہ کرے ع

وہ کوہکن کی بات گئی کوہکن کے ساتھ

مولانا ان سب حیثیتوں اور مختلف ذمہ داریوں کے ساتھ جن کا اپنے اپنے موقعوں پر ذکر آیا، اردو کے ایک منجھے ہوئے پختہ کار وکہنہ مشق لکھنے والے تھے، ان کی تحریر میں زبان یا محاورے کی غلطی ڈھونڈے سے نہیں ملتی تھی، انھوں نے اردو کے عناصر اربعہ (مولانا حالی، مولانا شبلی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی محمد حسین آزاد) اور اساطین ادب کی تصنیفات بچپن سے پڑھیں اور ان کے ذہن وذوق نے ان کو پورے طور سے اپنا لیا تھا، وہ بعض ہندگیر شہرت رکھنے والوں کی تحریروں میں زبان کی غلطی نکالتے تھے، وہ اودھ کی تہذیب ومعاشرت اور خاندانوں کے رکھ رکھاؤ سے خوب واقف تھے، بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت اسی انداز سے کرتے تھے، جیسا شرفائے اودھ کا دستور رہا ہے، وہ اپنے چھوٹے عزیزوں اور رفیقوں کی پوری حوصلہ افزائی اور قدردانی کرتے، اور ان کی ترقی وکامیابی سے خوش ہوتے ان کو نیک مشورہ دیتے اور چاہتے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ علمی کمال وفنی امتیاز پیدا کریں۔

میں بھی ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا کہ طالب علمی سے فراغت کے بعد ایک زمانہ میں جب تصوف کی بعض کتابوں کے مطالعہ سے مجھ پر زبان وادب کی بے حقیقتی کا غلبہ ہوا، اور طبیعت ادب وانشاء سے اچاٹ بلکہ بیزار ہوتے لگی اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی ساری دلچسپیوں اور توجہات کو مقاصد اور دینی علوم کے دائرہ میں محدود کروں گا، اسی زمانہ میں اپنے وطن رائے بریلی جاتے ہوئے لکھنؤ سے بچھراواں تک (جو مولانا کا وطن ہے) میرا ان کا ساتھ ہوگیا، میرے اس رجحان سے وہ واقف تھے، سارے راستے وہ مجھے اس سے باز رکھنے اور دینی مقاصد اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے زبان وادب کی اہمیت کی ضرورت کو میرے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے رہے، انھوں نے اس منفی رجحان کے

نقصانات سے (جو غلو اور مبالغہ سے خالی نہ تھا) مجھے ہوشیار کیا اور تاکید کی کہ میں خدا کی بخشی ہوئی اس صلاحیت کو ضائع اور اس کی ناقدری نہ کروں جس سے میں دین کی خدمت میں بڑا کام لے سکتا ہوں، ان کی اس تلقین سے میرے اس خیال میں تزلزل پیدا ہو گیا، اور میں اس غلطی سے بچ گیا۔

وہ اگر تصنیف کے کام میں مسلسل حصہ لیتے اور ان کی دوسری مصروفیات اس راہ میں حائل نہ ہوتیں تو ان کا شمار ہندوستان کے عظیم مصنفوں اور اہل قلم میں ہوتا، ان کا طبعی اور پسندیدہ موضوع تاریخ تھا، اس میں ان کے قلم کے دو نقش "ہماری بادشاہی" (مختصر تاریخ اسلام) اور ہندوستان کی کہانی (مختصر تاریخ ہند) اہل علم ونظر سے داد تحسین لے چکے ہیں اور بہت جگہ نصابوں میں داخل ہیں۔

ان کی تیسری کتاب جو ان کے وسیع مطالعہ کی آئینہ دار اور قیام جامعہ کے زمانہ کی تصنیف ہے "دنیا اسلام سے پہلے اور اس کے بعد" ہے، جس میں جاہلیت اور عہد ماقبل اسلام کی تصویر تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، قیام دار المصنفین کے زمانہ میں انھوں نے علامہ شبلی کی مقبول عام وشہرۂ آفاق سیرۃ النبیؐ کی تلخیص شروع کی تھی، جس کی پہلی جلد تیار ہو گئی۔

مولانا بہت سادہ اردو لکھتے تھے، اور اسی کو پسند کرتے تھے، لیکن ان کی تحریر میں خاص حلاوت، روانی اور برجستگی ہوتی تھی "معارف" کے وہ شذرات جو ان کے قلم سے ہیں، وفیات اور مقدمے جو انھوں نے بعض کتابوں پر لکھے ہیں، ان کی طرز تحریر کا دلکش نمونہ ہیں، ان کی تقریر بھی سادہ پر مغز اور پر از معلومات ہوتی تھی، اس میں اتار چڑھاؤ اور الفاظ کی صناعی بالکل نہیں ہوتی تھی، خاص طور پر سیرت کے موضوع پر وہ بڑی اچھی تقریر کرتے تھے، حقیقت میں ان کی طبیعت ہر قسم کے تکلفات سے بری تھی، یہ بات بعض اوقات ان کے ساتھیوں اور خوردوں کے لیے تفریح کا موضوع بن جاتی تھی۔

وہ قرآن بھی بہت سادہ پڑھتے تھے، اکثر وہ لطیفہ یاد دلاتے تھے، کہ ایک مرتبہ وہ

دارالعلوم کی مسجد میں نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شوخ اور ذہین طالب علم نے ایک دوسرے طالب علم سے وضو کرتے ہوئے کہا کہ "جلدی کرو آج نماز اردو میں ہو رہی ہے" اکثر مسکراتے ہوئے کہتے تھے، میں تو نماز بھی اردو میں پڑھاتا ہوں لیکن ان کا یہی وصف جو دوسروں کی نگاہ میں بعض اوقات نقص معلوم ہوتا، حقیقت پسندوں کی نگاہ میں اس دورِ تصنع وتکلف بلکہ دورِ نفاق وریاء میں بڑا کمال اور قابل رشک صفت تھی۔

پھر جب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی وفات سے دارالمصنفین میں مسند سلیمانی دوبارہ خالی ہوئی تو پھر پورے دبستان شبلی اور بزم سلیمانی میں نظر انھی پر پڑی اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ دارالمصنفین میں قیام اختیار کریں، اور "معارف" کی ادارت اور رفقاء کی رہنمائی وتربیت میں ان دونوں گرامی مرتبت پیش رؤوں کی نیابت کریں، اس درخواست میں میں پیش پیش تھا، آخر میں میرا اصرار ان کی معذرت پر غالب آیا اور انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کی اور محترمی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کو اس سے بڑی تقویت اور مدد ملی، ان کو مولانا کی موجودگی میں زیادہ دلجمعی اور سکون خاطر کے ساتھ ادارہ کی توسیع وترقی کا موقع ملا اور اسی اطمینان کی بنا پر وہ کئی کئی مہینہ دارالمصنفین سے باہر رہ کر اس کے مالی مسائل کی فراہمی میں ساعی وسرگرم رہے، اور وہ خلا نہیں محسوس ہونے پایا جو ایک صاحب نظر عالم دین کی (جو اصل دینی وعربی مآخذ پر براہ راست نظر رکھتا ہے اور علوم اسلامیہ میں اس کی نظر وسیع وگہری ہے) غیر موجودگی میں ایسے ادارہ میں محسوس ہو سکتا ہے جس کا مزاج دینی وعلمی ہے، اور جس کا خمیر سیرت وتاریخ اسلام سے اٹھا ہے۔

یہ تو ان کی علمی حیثیتوں اور کمالات کی طرف چند اشارے تھے، ان کی تمام صفتوں پر جو صفت میرے نزدیک سب پر غالب تھی، وہ ان کی شرافت نفس، انسان دوستی، بے آزاری اور عام ہمدردی کی صفت تھی، اللہ نے ان کو بچوں کی سی معصوم فطرت دی تھی، وہی بے ساختگی وہی بے تکلفی، کسی کو نقصان پہنچانے، کسی کا دل دکھانے کی یا تو ان میں صلاحیت نہیں تھی، یا تھی تو ـــــ بہت محدود جس کو انھوں نے شاید عمر بھر استعمال نہ

کیا ہو، ہر ایک سے محبت وسادگی سے ملنا، اس کا حال احوال پوچھنا، اس کی ضرورتوں سے واقف ہونے کی کوشش کرنا، اس کی مدد کرنے کی خواہش، اس چیز نے ان کو اپنے قصبہ میں بھی اور جہاں جہاں وہ رہے بڑا محبوب اور ہر دل عزیز بنادیا تھا، اس کا پورا اندازہ اس وقت ہوا جب ان کی وفات کی خبر (۳۰؍رمضان ۱۳۹۹ھ، ۲۴؍اگست ۱۹۷۹ء) قصبہ پر بجلی بن کر گری، اس وقت ہندو مسلم سب سوگوار نظر آتے تھے، سب ان کی شفقتوں کو یاد کرکر کے روتے تھے، مسلمان تو مسلمان غیر مسلم بھی ان کے دروازہ پر جمع ہوگئے اور جب تک جنازہ نہ اٹھا وہ وہاں سے ہٹے نہیں، ۲۵؍اگست یکم شوال عید کا دن تھا، اور نماز کا وقت لیکن ایک شخص بھی ان کے جنازہ کو چھوڑ کر عیدگاہ نہیں گیا، اللہ نے ان کو موت بھی ایسی نصیب فرمائی جس کی اولیاء اللہ دعائیں اور تمنائیں کرتے ہیں، رمضان کی ۳۰ تاریخ کو جمعہ کے دن اذان کے وقت ان کی روح نے اپنے مرکز اصلی کی طرف پرواز کی اور یکم شوال کو عین عید کا دوگانہ ادا کرنے کے بعد ہزاروں کے مجمع نے جس میں اطراف ونواح کے بھی لوگ تھے، ان کو سپرد خاک کیا، عید کے دن جو مسلمانوں کے لیے خوشیوں کا دن ہوتا ہے، راقم سطور کے لیے مقدر تھا کہ عین نماز کے بعد اپنے نصف صدی کے ساتھی، شریک کار اور غم گسار کو سپرد خاک کرے اور جس دن دوست دوستوں سے عید ملتے ہیں، اس دن ایک دوست کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہی جائے، ادھر کئی سال سے ان کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ عید کی شام کو یا دوسرے دن رائے بریلی آتے، وہ اعظم گڑھ سے اس پروگرام کی اطلاع دے چکے تھے، لیکن بجائے اس سفر کے انھوں نے آخرت کا سفر اختیار کیا "وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقیٰ".

انتقال کے ۳، ۴ دن بعد جب تعزیت کے سلسلہ میں دوبارہ جانا ہوا تو یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی کہ ان کا غم تازہ ہے، ہندو مسلمان دونوں یکساں طریقہ پر مغموم ومتاثر نظر آتے ہیں، غیر مسلم ان کی محبت وشفقت کی باتیں یاد کر کے روتے ہیں، اور ان کے واقعات سناتے ہیں، گویا انھوں نے اس شعر پر عمل کیا۔

یاد داری کہ وقت زادن تو
ہمہ خنداں بدند تو گریاں
پس چناں زی کہ بعد مردن تو
ہمہ گریاں بوند تو خنداں

اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کے درجہ بلند کرے کہ وہ اچھے رہے، اچھے گئے، لیکن اب ہم غم نصیبوں کو یہ فکر کھائے جارہی ہے کہ ان کی خالی کی ہوئی جگہ کس طرح پُر کریں اور ان اداروں کو پھر ان جیسا باکمال اور جامع صفات آدمی کہاں سے ہاتھ آئے۔

❑❑❑

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

واقعہ یہ ہے کہ اس جدید تعلیم یافتہ نسل پر ذہنی و علمی طور پر مولانا مودودی نے گہرا اور نہایت وسیع اثر ڈالا ہے، انھوں نے اس نسل کی صدہا بے چین روحوں، ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے بلکہ اس کا گرویدہ بنانے اور اس کے دل و دماغ میں اسلام کا اعتماد و وقار بحال کرنے کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے، جہاں تک اس تعلیم یافتہ اور ذہین (Intellectual) طبقہ کا تعلق ہے، اس اثر انگیزی میں (اس ربع یا نصف صدی میں) مشکل سے کوئی مسلمان مصنف و مفکر ان کا مقابل و ہمسر ملے گا۔

مولانا مودودی کے بعض خیالات و تحقیقات سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو (اور خود یہ ناچیز بھی ان لوگوں میں شامل ہے، جنھوں نے اس علمی محاسبہ اور تنقید کا فرض انجام دیا ہے) (ا) اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی تحریریں اور مضامین مغرب کی تہذیب اور اسکے فلسفۂ حیات کے گہرے مطالعہ اور ذاتی واقفیت پر مبنی ہیں، انھوں نے ایسے مبصرانہ اور جرأت مندانہ انداز میں اس کی تنقید اور اس کے علمی تحلیل تجزیہ کا فرض انجام دیا ہے جو خود اعتمادی سے بھرپور اور مرعوبیت و سطحیت سے دور ہے، اور جس میں نامور نومسلم مغربی فاضل علامہ محمد اسد کے سوا ان کا کوئی نظیر و ہمسر اور ان کا کوئی پیش رو (اس قریبی زمانہ میں) نظر نہیں آتا، انھوں نے اسلام کے نظام حیات، اس کی تہذیب کی بنیادیں، حیات انسانی کی تنظیم کے اصول، اسلامی حکومت کے محاسن و خصائص اور اس کے قیام کے طریق و شرائط کو نئے اسلوب اور علمی زبان میں اس خوبی سے پیش کیا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ (جو مغربی طرز

(ا) ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح'' مطبوعہ ''مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ''۔

استدلال اور جدید علمی اسلوب کا خوگر تھا) اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، انھوں نے اسلام کے حقائق، اس کے قوانین معاشرت، اور اس کے اقتصادی، سیاسی نظام کو اس انداز میں پیش کیا، جس میں معذرت وتاویل کا وہ رنگ نہیں تھا، جو عرصہ سے ان مسائل پر لکھنے والے دانشوروں اور اہل قلم کے یہاں پایا جاتا تھا، بلکہ انھوں نے بارہا مغربی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات کے بارے میں اقدامی پوزیشن اختیار کی اور خود اس کی بنیادوں اور جڑوں پر تیشہ زنی کی، جس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے افراد کا وہ احساس کہتری اور شکست خوردگی دور ہوگیا جو خالص مغربی تعلیم نے ان میں پیدا کر دیا تھا، اور بہت سے نوجوانوں کے دل میں اسلام کی سربلندی اور اسلامی حکومت کے قیام کا جذبہ اور اس کی ضرورت کا احساس بیدار ہوگیا جو اس کو ناقابل عمل بلکہ ناقابل تصور سمجھنے لگے تھے، اور یہ ان کی وہ خدمت ہے، جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، کاش کہ وہ اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اسی نقطہ پر مرکوز کر دیتے اور جیسا کہ ایک مرتبہ میں نے لاہور کی ایک مخصوص صحبت میں ان سے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے فضلاء اور نوجوانوں کی ایک ٹیم تیار کر دیتے جو ان مسائل پر پُرمغز اور فکر انگیز طریقہ پر اُورجنل (Original) لٹریچر پیش کرتی اور اس ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے راستہ میں سدِ سکندری بن جاتی جو سارے عالم کو اس وقت اپنے لپیٹ میں لے چکا ہے، اور وقت کا اہم ترین چیلنج اور اس عہد کا ''فتنۂ ارتداد'' ہے، انھوں نے یہ عذر کیا تھا کہ ''پتّا مارنے والے محنتی اور ذہین نوجوان نہیں ملتے''۔

یہ ایک تقدیری بات ہے کہ پاکستان پہنچنے کے بعد ان کی توانائی کا بڑا حصہ جماعت کی تنظیم وتوسیع، اسلامی قانون کے نفاذ کے مطالبہ اور دستوری وانتخابی ذرائع سے اقتدار کو جماعت کی طرف منتقل کرنے پر مرکوز ہوگئی، میرا اندازہ ہے کہ ان کو اپنے آخری دور میں اس کا احساس ہوگیا تھا کہ جن پیرووٴں اور ہم خیالوں سے وہ اس کی توقعات وابستہ کر رہے ہیں، اور جس معاشرہ کی زمین پر وہ یہ عمارت اٹھانا چاہتے ہیں، اس میں اس کا بوجھ برداشت کرنے اور اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ابھی پیدا نہیں

ہوئی ہے، اور شاید ان کو یہ احساس بھی ہو چلا تھا کہ اس ناگزیر درمیانی منزل کے طے کرنے میں کسی قدر عجلت اور خوش گمانی سے کام لیا گیا، اس کو اس سے زیادہ دینی واخلاقی تربیت اور انھی کے الفاظ میں ''سیرت سازی'' اور تعمیر کردار کی ضرورت تھی جتنی اس کو حاصل ہوئی، اس کے لیے (خواہ اس کا کچھ نام رکھا جائے، اور ''تصوف'' کے مروجہ طریقوں سے کتنا ہی احتراز کیا جائے) کسی قدر روحانی اور باطنی تربیت، ضبط نفس، ایثار و قربانی، ذوق بندگی، اور تعلق مع اللہ کی روح کی ضرورت تھی، اس حقیقت کے اشارے ان کے اس مشہور خیال افروز اور ولولہ انگیز مقالے میں ملیں گے جو ''اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟'' کے عنوان سے انھوں نے تقسیم سے بہت پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا تھا، انھوں نے اپنی آنکھوں سے پاکستان کے انقلابات بھی دیکھے، خود اپنی جماعت کے انتشار، اس کے بنیادی ارکان کی علیحدگی اور ان کی صف آرائی کے حادثہ سے بھی بار بار دوچار ہوئے، جس سے ان دینی جماعتوں کو کم سابقہ پڑا ہوگا، جن کی بنیاد صحیح دینی و روحانی تربیت و ایثار پر پڑی اور جن کو قیادت کے لیے کوئی طاقتور اور دل آویز دینی شخصیت حاصل ہوئی (۱)، یہاں تک کہ بتدریج جماعت میں ان اہل علم حضرات میں سے کوئی نہیں رہا جو اس کے قیام و آغاز کے زمانہ سے شریک تھے، پھر بالکل آخر میں ایران کا ''اسلامی انقلاب'' کے نام سے وہ انقلاب بھی دیکھا، جو قیام حکومت اور معاشرہ اسلامی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے والوں کی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ایک خونی انقلاب اور ایک جذباتی ردِ عمل بن کر رہ گیا ہے، ان کی خداداد ذہانت اور واقعات سے فائدہ اٹھانے کی فطری صلاحیت سے اس کی پوری امید ہے کہ اگر ان کو مہلت ملتی اور ان کی زندگی اور صحت ساتھ دیتی اور جماعت کی زمام قیادت

---

(۱) اس سلسلہ میں حضرت سید احمد شہید کی تحریک و جماعت کا ذکر بے محل نہ ہوگا، جن کی دعوت آخری درجہ کے مالی و جانی ایثار اور راہِ خدا میں جاں نثاری و سرفروشی پر مبنی تھی، اس کے باوجود ایک شخص نے بھی آخر دم (معرکہ بالاکوٹ) تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا، اور جو اس شہادت زار سے زندہ واپس آئے وہ آخری سانس تک ان کا دم بھرتے رہے، اور اسی راہ پر گامزن رہے "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا".

ان کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ جماعت کے فکر ونظام میں بڑی اہم اور دوررس تبدیلیاں کرتے اور افراد جماعت کی اصلاح وتربیت میں بعض مؤثر قدم اٹھاتے، اور ''اسلامی حکومت'' کے بجائے ''اسلامی معاشرہ'' کے قیام پر اپنی توجہ کا بڑا حصہ مرکوز کردیتے، جولائی ۱۹۷۸ء کے آخری ہفتہ میں جب میری ان سے لاہور میں آخری ملاقات ہوئی اور میں نے ہندوستان میں ''پیام انسانیت'' کی تحریک اور پاکستان میں بھی اسی کے مماثل کسی تحریک کی ضرورت کا ذکر کیا اور معاشرہ کی اخلاقی گراوٹ اور زبوں حالی کا تذکرہ کیا تو انھوں نے اس کی تحسین فرمائی اور تائید وہمت افزائی کے کلمات کہے۔

ان چند ''سخن گسترانہ'' باتوں کے باوجود جو بہرحال اندازوں اور تمناؤں پر مبنی ہیں، اس میں شک نہیں کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے اور اس کے دلوں میں اسلام کی طرف سے اعتماد بحال کرنے میں ان کے قلم نے جو خدمت انجام دی وہ ہر شبہ اور اختلاف سے بالاتر ہے، اور عالم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی جدید تحریک اور جدوجہد کی تاریخ میں ناقابلِ انکار اور ناقابلِ فراموش ہے۔

مجھے مولانا کی شخصیت اور تحریروں سے واقفیت کی سعادت ۳۴-۱۹۳۵ھ ہی سے حاصل ہوگئی تھی، جب دار العلوم ندوۃ العلماء میں میری تدریسی زندگی کا آغاز ہوا، میں نے ان کی کتابوں اور تحریروں سے بہت استفادہ کیا اور میری تحریر میں اس کا رنگ آیا، یہ میرا عنفوان شباب تھا(۱)، اسی زمانہ میں ان کے شہرۂ آفاق رسالہ ''ترجمان القرآن'' میں میرا ایک مضمون سورۂ کہف کی تفسیر کے بعض اشارات پر شائع ہوا(۲) جو مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے بہت پسند کیا، اس وقت مولانا حیدرآباد میں تھے، اور ''ترجمان القرآن'' وہیں سے نکلتا تھا، دوسرا مضمون ''دین وسیاست'' کے عنوان سے لاہور سے شائع ہوا، میری پہلی ملاقات ان سے لاہور میں اگست ۱۹۳۹ء کی کسی تاریخ میں ہوئی، میں اور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی ایک دینی

---

(۱) میری عمر اس وقت بیس سے کچھ ہی اوپر تھی۔
(۲) انھی اشارات کی مدد سے میں نے اپنی کتاب ''معرکۂ ایمان ومادیت'' تصنیف کی۔

مہم اور تلاش کے سلسلہ میں بلوچستان کا سفر کر رہے تھے، اس ملاقات میں مولانا نعمانی اور مولانا حبیب اللہ صاحب (فرزند اکبر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ) بھی ساتھ تھے، مجھے یاد ہے کہ ملتے ہی مولانا نے کہا "آج قران السعدین ہی نہیں قران السعداء ہو گیا"۔

میری مولانا سے خط و کتابت غالباً اگست ۱۹۴۰ء سے شروع ہوئی، میں رفیق محترم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی مرحوم کے ساتھ "الندوہ" کا ایڈیٹر تھا، ہم لوگوں نے اس میں ایک سلسلہ "میری محسن کتابیں" کے نام سے شروع کیا، جس میں ہندوستان کے مشاہیر اہل علم واہل فکر کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ افادۂ عام اور "تازہ واردانِ بساطِ علم" کی رہنمائی کے لیے ان کتابوں کا ذکر کریں جنھوں نے ان کے ذہن کی تشکیل اور سیرت کی تعمیر میں خاص حصہ لیا ہے، اور ان کے دماغ پر گہرے اور دیرپا نقش چھوڑے ہیں، میں نے مولانا کو بھی دعوت دی، اس سلسلہ میں ان کا جو جواب آیا وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے کہ یہ ان کے مطالعہ کا نچوڑ اور خود ان کی سوانح وسیرت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، مولانا نے مجھے ۳۱/اگست ۱۹۴۰ء کو ایک مفصل خط لکھا جس میں مجھ سے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "پردہ" کے عربی ترجمہ کا انتظام کرنے کی خواہش ظاہر کی، انھوں نے لکھا کہ:۔

> "میری دلی خواہش ہے کہ عربی میں بھی اس کا ترجمہ ہو جائے، تاکہ ممالک عربیہ خصوصاً مصر میں اس کی اشاعت کی جاسکے، ندوہ کے سوا کسی اور مرکز کی طرف نظر نہیں جاتی، یہ کام اگر ہو سکتا ہے تو وہیں ہو سکتا ہے، براہ کرم آپ کسی ایسے صاحب کو اس کام پر مامور فرمائیں جو جیتی جاگتی زبان میں اسے منتقل کر سکیں"۔

اس کے بعد میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

> "کچھ مدت ہوئی آپ کا ایک عنایت نامہ آیا تھا، جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ "وہ کتابیں جن کا ممنون ہوں یا "میری محسن کتابیں" کے عنوان پر کچھ لکھوں، میں اس کا جواب دینا بھول گیا، ابھی آپ کو خط لکھتے

ہوئے اس کا خیال آیا۔

جاہلیت کے زمانہ میں میں نے بہت کچھ پڑھا ہے، قدیم وجدید فلسفہ، سائنس، تاریخ، معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں، مگر جب آنکھیں کھول کر قرآن کو پڑھا تو بہ خدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا، علم کی جڑ اب ہاتھ آئی، کانٹ، ہیگل، فشٹے، مارکس اور دنیا کے دوسرے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں، بیچاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں الجھتے رہے، اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہ کر سکے، ان کو اس کتاب نے ایک دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے، اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے؟ میری اصل محسن بس یہی ایک کتاب ہے، اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے، حیوان سے انسان بنا دیا ہے، تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی، ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا ہے، کہ زندگی کے جس معاملہ کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا مجھے دکھائی دیتی ہے، گویا اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے، انگریزی میں اس کی کنجی شاہ کلید (Master Key) کہتے ہیں، جس سے ہر قفل کھل جائے، سو میرے لیے یہ قرآن شاہ کلید ہے، مسائل حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں وہ کھل جاتا ہے، جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے، اس کا شکریہ ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے"۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

مولانا سے میری دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب مولانا اس کمیٹی میں شرکت کے لیے لکھنؤ تشریف لائے جو اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرنے کے لیے نواب سر احمد سعید

آف چھتاری کی دعوت پر ندوۃ العلماء میں منعقد ہو رہی تھی، مولانا نے اپنی آمد سے پہلے مجھے اپنی تشریف آوری کی اطلاع دی، اور اپنے قیام کا مجھے ذمہ دار بنایا، اس وقت ان کا ۲۴ر دسمبر ۱۹۴۰ء کا ایک خط سامنے ہے جو ایک اہم تاریخی یادگار کے طور پر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور۔ ۲۴ر دسمبر ۱۹۴۰ء

مکرمی ومحترمی۔ السلام علیکم

عنایت نامہ ابھی ملا، اور آج ہی اتفاق کی بات ہے، نواب صاحب چھتاری کا خط آیا جس میں انھوں نے ایک کمیٹی کی شرکت کے لیے مجھے لکھنؤ آنے کی دعوت دی ہے...... ان نوابوں اور ان کی کمیٹیوں سے تو مجھے کوئی دلچسپی نہیں، اور اگر محض ان کی کمیٹی کی شرکت کا معاملہ ہوتا تو میں ٹال دیتا، مگر اس بہانے ندوہ سے اور آپ کے رفقاء کار سے براہ راست تعلق قائم کرنے کا ایک موقعہ ہاتھ آتا ہے، اس لیے میں نے لکھنؤ حاضر ہونے کا تہیہ کر لیا ہے..... میں انشاء اللہ ۳ر جنوری کو لکھنؤ پہنچوں گا، میرے قیام کے لیے کوئی مناسب انتظام کرنا آپ کا ذمہ ہے، میں کسی ایسی جگہ ٹھہرنا چاہتا ہوں جہاں ہر قسم کے لوگ مجھ سے مل سکیں، اور آزادی کے ساتھ گفتگو کر سکیں، علی گڑھ میں میں نے اولڈ بوائز لاج کو پسند کیا تھا، اس کا یہ فائدہ ہوا کہ ہر خیال اور ہر گروہ کے آدمی مجھ سے بے تکلف ملے، ایسی ہی کوئی جگہ میں لکھنؤ میں چاہتا ہوں، میں چونکہ بے ہمہ ہوں اس لیے خدا نے مجھے باہمہ بھی بنا دیا ہے، سخت قسم کے دہریہ اور کمیونسٹ بھی مجھ سے اسی طرح ملتے ہیں، جس طرح مومنین صادقین، اور ان لوگوں سے بات چیت کرنے میں ایسی جگہ آسانی ہوتی ہے، جہاں وہ شخصیتیں نہ ہوں جن سے یہ لوگ تکلف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

رسالہ (۱) کے متعلق انشاء اللہ وہیں بالمشافہ گفتگو ہوگی۔

خاکسار۔ ابوالاعلیٰ

---

(۱) عربی رسالہ کا اجراء جو فکر اسلامی و دعوت کا آرگن بن سکے، آگے اس کی تفصیل آئے گی۔

مولانا جنوری ۱۹۴۴ء کے پہلے ہفتے میں لکھنؤ تشریف لائے، یہ زمانہ مسلمانوں میں ایک طرف کانگریس کی تحریک (جس کی قیادت جواہر لال نہرو کر رہے تھے) کے زور، دوسری طرف پاکستان کا نعرہ بلند ہو جانے کی وجہ سے بڑی بے چینی اور جوش و سرگرمی کا تھا، مولانا کے پُر زور، فکر انگیز مضامین اور ''ترجمان القرآن'' کے مقالات نے اسلامی حلقوں میں ایک جنبش اور حرکت پیدا کر دی تھی، نوجوان اسلام کی اس ترجمانی کے دلدادہ تھے، جو بلند سطح سے اور پُر اعتماد لہجہ میں کی جائے اور مسلمانوں میں امنگ، حوصلہ اور اپنے ماضی اور تہذیب پر اعتماد پیدا کرے، مولانا کا قیام دار العلوم کے مہمان خانہ میں ہوا، جہاں استاد محترم مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا آزاد سبحانی مقیم تھے، یونیورسٹی کے مسلمان طلباء اور شہر کے صاحب فکر مسلم نوجوان جوق در جوق آتے اور مولانا سے بڑے ذوق وعقیدت سے ملتے، ایسے موقع پر مولانا ان کو لے کر مسجد میں جا بیٹھتے، جو مہمان خانہ سے متصل ہے، ندوہ کی طرف سے میں ان حضرات کی میزبانی اور رفاقت پر مامور تھا، اور مولانا لکھنؤ کے احباب میں مجھ سے زیادہ مانوس اور واقف تھے، اس لیے مجھے انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا اور زیادہ سے زیادہ رہنے کا موقع ملا، میں مولانا کی سنجیدگی...... نستعلیقی، اسی کے ساتھ طبیعت کی شگفتگی، اخلاق اور اپنے مقصد کی لگن سے بہت متاثر ہوا، بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا بڑا لطیف مزاج فرماتے تھے، اور طبیعت میں ظرافت تھی...... جو زباں دانی اور دہلوی مذاق سلیم کے ساتھ مل کر بڑی لطافت پیدا کر دیتی، خشکی ان میں نام کو نہ تھی، اور وہ جلد بے تکلف ہو جاتے، مولانا چند دن قیام کر کے واپس گئے، لیکن خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔

اگلے سال ۱۹۴۵ء میں غالباً جماعت کی خواہش پر جو لکھنؤ میں قائم ہو چکی تھی، اور جس کا میں ذمہ دار تھا، وہ دوبارہ تشریف لائے، آنے سے پہلے حسب معمول انھوں نے مجھے خط لکھا، میں نے غالباً ان سے لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے ایک مقالہ تیار کرنے کی فرمائش کی تھی، ان کا یہ خط جو ۲۹ رستمبر ۱۹۴۴ء کا لکھا ہوا ہے، اسی کے جواب میں ہے۔

مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۲ء

محترمی ومکرمی۔ السلام علیکم

"آپ کے پہلے عنایت نامہ کا جواب پہلے دے چکا ہوں، بعد میں کارڈ ملا، خطبہ کے لیے "نیا نظام عالم" کوئی نیا موضوع نہیں، نہایت پامال چیز ہے، اور آج کل کچھ فیشن ہوگیا ہے کہ ہر ایک اس پر کچھ نہ کچھ بولے، اس بنا پر نہ میرے خطبہ کی کوئی خصوصیت ہوگی اور نہ اس کی طرف کوئی توجہ کرے گا، اس کے بجائے خطبہ کا یہ عنوان بہتر ہے "نوع انسانی کا معاشی (یا اقتصادی) مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" آپ یونیورسٹی کے سکریٹری صاحب کو اطلاع دے دیجیے"۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

مولانا لکھنؤ تشریف لائے اور نوجوانوں نے پروانہ وار ہجوم کیا، انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی یونین میں عنوان بالا کے تحت اپنا فاضلانہ خطبہ پڑھا، جو ان کے مضامین میں شائع ہوگیا ہے، اسی کے ساتھ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے ایک مقالہ "نیا تعلیمی نظام" کے عنوان سے میری فرمائش پر لکھ کر لائے تھے، جو طلبہ کی انجمن "الاصلاح" میں پڑھا گیا، میرا رابطہ مولانا سے اور جماعت سے برابر قائم رہا، میں نے جماعت کی اس مجلس عاملہ کے جلسہ میں شرکت کی جو فروری ۱۹۴۲ء کو لاہور میں منعقد ہوا تھا، اور جس میں مولانا کی تحریروں اور بعض خیالات کی اس مخالفت کی بنا پر جو ہندوستان کے بعض مشاہیر فضلاء اور اہل قلم نے شروع کر رکھی تھی، یہ مسئلہ درپیش تھا کہ مولانا فی الحال جماعت کی امارت سے سبکدوشی اختیار کرلیں، اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کو امیر منتخب کیا جائے، جماعت کی زندگی اور تاریخ میں یہ مرحلہ بہت اہم تھا، میرا ووٹ اس میں مولانا کے حق میں تھا، اور اس کی بنیاد یہ تھی کہ یہ ایک مصنوعی ردوبدل ہوگا، جس سے کوئی بڑا فائدہ حاصل نہ ہوگا، جماعت کا وجود

مولانا کی تحریروں کے اثر سے عمل میں آیا ہے، اور اس کی وابستگی اور انتساب بدستور انھیں کی طرف رہے گا، اسی پر فیصلہ ہوا اور جماعت کا نظام وہی رہا، جماعت کی دوسری مجلس انتظامیہ میں میری شرکت اکتوبر ۱۹۴۲ء میں دہلی میں ہوئی، اس موقع پر میں مولانا کے ساتھ علی گڑھ بھی گیا، اور ایک دودن اولڈ بوائز لاج میں ہم دونوں کا قیام رہا، میں نے یونیورسٹی کے حلقہ میں مولانا کی مقبولیت کا اندازہ کیا۔

اس زمانہ میں مولانا کو عربی میں ایک ایسے رسالہ کے اجراء کا بڑا تقاضا تھا، جو دعوت و جماعت کا ترجمان بن سکے، میں نے اس سلسلہ کی مشکلات کا ذکر کیا اور اس پر اتفاق ہوا کہ فی الحال عربی میں مضامین کے ترجمے کا سلسلہ شروع کردیا جائے، اور ان کو عالم عربی کے موقر مجلات ورسائل میں بھیجا جائے، مولانا یہ خدمت میرے سپرد کرنا چاہتے تھے، میں نے اس کے لیے رفیق محترم مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کا نام تجویز کیا جو مولانا نے منظور کیا، اور اس کے نتیجہ میں پہلے مشرقی پنجاب جالندھر میں پھر مغربی پنجاب گجرانوالہ میں ''دارالعروبۃ'' کے نام سے ادارہ قائم ہوا، اور مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم نے اس سلسلہ کو اس قابلیت وخوبی سے انجام دیا کہ عالم عربی میں مولانا کا اور ان کی دعوت وتحریک کا ایسا تعارف ہوا کہ اگر مولانا کا خود بھی عربی میں لکھنے کا معمول اور تجربہ ہوتا تو اس سے زیادہ ممکن نہ تھا، عالم عربی میں مولانا کی مقبولیت اور تعارف کا یہ کتابیں سنگ بنیاد ثابت ہوئیں، اور انھوں نے اس کے لیے راہ ہموار کردی، جس سے بعد میں پورا فائدہ اٹھایا گیا، جماعت وتحریک کی تاریخ میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مارچ ۱۹۴۴ء میں صوبہ سرحد وپنجاب کے ایک سفر کے دوران مجھے دارالاسلام پٹھان کوٹ (جہاں مولانا مستقل طور سے مقیم تھے، اور جس کو تحریک کا مرکز بنانا تجویز ہوا تھا) جانے کا اتفاق ہوا، اور کچھ دن ان کا مہمان بننے کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے بعد عرصہ تک ذاتی ملاقات کی نوبت نہیں آئی، ۱۹۵۱ء میں جب تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان

جانا ہوا تو لاہور کے قیام کے دوران مولانا سے لاہور سینٹرل جیل میں ملاقات ہوئی، اس ملاقات میں ملک نصر اللہ خاں عزیز میرے رفیق و رہبر تھے، مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم کا قریبی زمانہ میں انتقال ہوا تھا، ہم دونوں نے ایک دوسرے سے تعزیت کی۔

اس کے بعد جون ۱۹۵۶ء میں ان سے ملنا ہوا جب وہ ہمارے دوست ڈاکٹر سعید رمضان کی دعوت پر ان کی منعقد کی ہوئی مؤتمر اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے دمشق آئے، میں ایک دو مہینہ پہلے سے دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر وہاں گیا ہوا تھا، اس موقع پر پاکستان سے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم اور مولانا ظفر احمد صاحب انصاری بھی آئے ہوئے تھے، کانفرنس میں ڈاکٹر محمد ناصر سابق وزیر اعظم انڈونیشیا کو صدر اور مولانا کو اور مجھے نائب صدر منتخب کیا گیا تھا، اس کانفرنس کا سلسلہ کئی روز جاری رہا اور دو مرتبہ مجھے مولانا کی خواہش اور اصرار پر ان کی تقریر کا عربی میں ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا، اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں جب مدینہ طیبہ میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا اور ہم دونوں اس کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے تو مسلسل کئی روز ملنے اور اس کمیٹی میں شرکت کرنے کا سلسلہ جاری رہا، اسی سال حج کے موقع پر رابطۂ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور ہم دونوں اس کی مجلس تاسیسی کے رکن منتخب ہوئے، اس سلسلہ سے کئی مرتبہ اس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر مولانا سے ملنے اور رابطہ کے جلسوں میں قریب بیٹھنے کا موقع ملا، یہاں تک کہ گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے مولانا کے سفر کا سلسلہ ختم ہو گیا، غالباً آخری اجلاس جس میں ہم دونوں نے شرکت کی ۱۹۶۷ء کا اجلاس تھا۔

آخری ملاقات جولائی ۱۹۷۸ء کی کسی تاریخ کو لاہور میں مولانا کے دولت خانہ پر ہوئی، مولانا بڑے اخلاق اور تپاک سے ملے، پاکستان کے موجودہ حالات پر تبصرہ ہوا، میں کراچی میں رابطہ کی طرف سے ہونے والی پہلی اسلامی ایشیائی کانفرنس میں شرکت اور پاکستان کا ایک مختصر دورہ کر کے لاہور پہنچا تھا، ہم دونوں اس پر متفق تھے کہ موجودہ انقلاب ایک خوش آئند اور مبارک انقلاب ہے، مولانا نے فرمایا کہ یہ بات واضح ہے کہ

اس کے دین پسند سربراہوں اور قائدین کی مدد کرنی چاہیے، اور ان کو نا کام نہیں ہونے دینا چاہیے، یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔

۱۹۴۳ء میں میرا ضابطہ سے جماعت سے تعلق نہیں رہا تھا، لیکن مولانا سے اور پیشتر رفقائے جماعت سے دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات تھے، اور ایک دوسرے کا احترام اور اعتراف میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، مارچ ۱۹۴۴ء میں جب میں دارالاسلام میں ان کا مہمان ہوا، تو وہ میری اس ذہنی تبدیلی اور جماعت کی فکر سے میری بے اطمینانی سے واقف ہو چکے تھے، لیکن اس کا تعلقات اور باہمی ربط وضبط پر کوئی اثر نہ تھا، عربی دعوتی لٹریچر کے بارے میں تبادلۂ خیال بھی ہوا، اور مولانا نے میرا ایک عربی مضمون جو "دعوتان متنافستان" (دو حریف اور مد مقابل دعوتیں) کے عنوان سے تھا(۱)، ملاحظہ فرمایا اور پسند کیا، وہ مع تمام رفقاء کے اسٹیشن مجھے رخصت کرنے کے لیے تشریف لائے۔

میرے مولانا کی تحریروں اور جماعت کے لٹریچر سے تأثر اور وابستگی کی بنیاد مولانا کے وہ فاضلانہ تنقیدی مضامین تھے، جو انھوں نے مغربی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات اور موجودہ مادی نقطۂ نظر کے خلاف لکھے تھے، اور جن کا بڑا حصہ ان کے مجموعہ مضامین "تنقیحات" میں شامل ہے، یہاں میرے اور مولانا کے خیال میں وہی توارد تھا، جو ایک چھوٹے اور بڑے، نومشق وکہنہ مشق مصنفوں کے درمیان ہوسکتا ہے، دین کی اس جدید تفہیم وتشریح سے نہ مجھے کچھ زیادہ دلچسپی تھی نہ ضرورت، جو مولانا کی دوسری کتابوں مثلاً "قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں"، "تفہیمات" اور "رسائل ومسائل" میں پائی جاتی ہے، اس لیے کہ اس بارے میں میرا معاملہ کسی ایسے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان سے بالکل مختلف تھا، جو دین کا تصور اور اس کا فہم اس کے اصل سرچشموں (کتاب وسنت اور دینی ماحول وتربیت) کے بجائے کلیۃً مولانا یا کسی دوسرے مسلمان مفکر ومصنف کی کتابوں سے حاصل کرتا ہے، میں اپنے براہ راست دینی مطالعہ اور ان متقدمین اور بعض متاخرین کی

---

(۱) مشمولہ مجموعۂ مضامین (الی الاسلام من جدید) اس سے مراد اسلام اور مغربی تہذیب اور مادی فلسفۂ حیات ہے۔

کتابوں سے استفادہ کرنے کی بنا پر جو کتاب وسنت کا وسیع وعمیق علم رکھتے تھے، اور ان کے یہاں مجتہدانہ فکر ونظر اور نمایاں گہرائی ملتی ہے، مولانا کو ایسا یگانۂ روزگار مفکر اسلام سمجھنے سے قاصر تھا، جس کی نظیر صدیوں میں نہیں ملتی، میں ان کا اصل امتیاز وجوہر ذہانت، ذہن کی صفائی ورسائی اور نئے انداز میں تحریر وتفہیم کی امتیازی قوت وقدرت سمجھتا تھا، اور اب بھی سمجھتا ہوں، لیکن کچھ عرصہ کے بعد مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ جماعت کے اس علمی اور تنقیدی حصہ کو جو مغربی تہذیب اور موجودہ مادی فلسفوں اور نظامہائے حیات سے متعلق تھا، دین کی اس تفہیم وتشریح سے الگ نہیں کیا جاسکتا جو خود مولانا اور جماعت کے قائدین کی نظر میں بنیاد اور سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہے، میرا شعور جس قدر پختہ اور میرا مطالعہ اور تجربہ جتنا وسیع ہوتا گیا میری ذہنی کشمکش میں اضافہ ہوتا گیا، اس کا نقطۂ ارتقاء وہ تھا، جب میری ہندوستان کے مشہور تبلیغی تحریک کے داعی وبانی مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں آمد ورفت زیادہ ہوئی، میں جب ان کی زندگی، ان کی باطنی کیفیات اور ان کی ایمان واحتساب کی دعوت سے گہرے طور سے متاثر ہوا تو یہ ذہنی خلیج عمیق اور وسیع ہونے لگی اور مجھے احساس ہوا کہ دعوتِ نبوت اور اس کے حامل کا مزاج اور اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں، اور وہ ایک ایسی تحریک ودعوت سے کتنی مختلف ہوتی ہیں، جس کی بنیاد خالص مطالعہ، ذہانت اور کسی فلسفہ ونظام کے ردعمل پر ہوتی ہے...... میں نے ایک بار لکھنؤ سے جب مولانا مودودی کو اپنی اس ذہنی کشمکش کا حال لکھا اور ان کو مولانا محمد الیاس صاحب سے میرے گہرے تأثر اور تبلیغی کام میں روز افزوں انہماک کا حال بطور خود بھی معلوم ہوا تو انھوں نے مجھے اس بارے میں یکسو ہوجانے کی اجازت بلکہ مشورہ دیا۔

میں نے جماعت سے اپنی بے اطمینانی اور اس کے اسباب کا اظہار کرنے میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیا اور جماعت کے موافقین یا مخالفین نے جب خط وکتابت کے ذریعہ مجھ سے میری علیٰحدگی کے اسباب اور مولانا یا جماعت کے بارے میں میری رائے دریافت کی تو میں نے اس کا ایسا جواب دینے سے ہمیشہ احتراز کیا جس کو اشاعت میں لاکر غلط

مقاصد حاصل کیے جاسکتے تھے، بے اطمینانی کے اسباب ریاضی واقلیدس کے قواعد کی طرح چند بندھے ٹکے لفظوں اور ضابطوں کی شکل میں بیان نہیں کیے جاسکتے، اس کے اسباب مختلف النوع ہوسکتے ہیں، ان کا تعلق تعلیم وتربیت، ماحول کے اختلاف، وہ شخصیتیں جن سے آدمی متاثر ہوتا ہے، ان کی رنگارنگی، ذاتی تجربات، موروثی وخاندانی اثرات، ذہنی ارتقاء، اور مطالعہ کے نتائج سے بھی ہوسکتا ہے، اور ان سب کا الفاظ کی گرفت میں (خاص طور سے مختصر خطوط کی شکل میں) آنا مشکل ہوتا ہے، میں عام طور پر اس کے جواب میں لکھ دیتا تھا کہ اس کے سمجھنے کے لیے آپ میری کتاب ''ارکان اربعہ''، ''منصب نبوت، اور اس کے عالی مقام حاملین''، ''تاریخ دعوت وعزیمت'' اور عربی ''ربانية لا رهبانية'' (۱) کا مطالعہ کیجیے۔

یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا، جب تک کہ میں دیانت کے ساتھ اس نتیجہ پر نہیں پہنچ گیا کہ اب مجھے مولانا کے دین کی اس تفہیم وتشریح کے متعلق کچھ لکھنا چاہیے جس کی بنیاد ان کی کتاب ''قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں'' ہے، اور جو اقلیدس کے اصول موضوعہ کی طرح ان کی فکر ودعوت میں جاری وساری ہے، اور میں نے اس تفہیم وتشریح کا اثر برصغیر اور ممالک عربیہ کے ان نوجوانوں کی فکر وتحریر میں نمایاں طریقہ پر دیکھا، جنھوں نے دین کو مولانا اور ان کے نامور عرب خوشہ چیں اور میرے عزیز ومحبوب دوست سید قطب شہید کی دینی ترجمانی اور تفہیم سے اخذ کیا تھا، اور انھوں نے دینی حقائق ومقاصد کو انھی کے ذریعہ سمجھا تھا، میں نے محسوس کیا کہ فکر وعمل اور سعی وجہد کی پٹری بدلتی جارہی ہے، اور اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ وہ ایک خالص مادی سیاسی وتنظیمی تحریک کی شکل نہ اختیار کرے جو کسی نیک اور بلند مقصد کے لیے وجود میں آسکتی ہے، میں نے سب سے پہلے اپنی عربی کتاب ''النبوة والأنبياء في ضوء القرآن'' کے تیسرے اور اس کے اردو ترجمہ ''منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین'' کے دوسرے ایڈیشن میں اس پر مختصراً ایک نوٹ لکھا، پھر بڑے

---

(۱) اب اس کا اردو ترجمہ ''تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک'' کے نام سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی طرف سے شائع ہوگیا ہے۔

فکروتأمل اور دعا واستخارہ کے بعد ایک دینی فریضہ سمجھتے ہوئے رمضان ۱۳۹۸ھ اگست ۱۹۷۸ء میں اس موضوع پر مستقلاً قلم اٹھایا، اور ایک شاہد عینی اور مستفید کی حیثیت سے اس کو ضروری سمجھا کہ مولانا کی خدمات اور ان کی تصنیفی انفرادیت کا پورا پورا اعتراف کرتے ہوئے اپنے خدشات اور اندیشوں کو ظاہر کیا جائے کہ جماعت میں شریک ہونے والوں کی ایک بڑی تعداد بلاشبہ دین کی طالب اور خدمت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی حریص وخواہشمند ہے، اور اس کو جب کتاب وسنت کی روشنی میں مخلصانہ مشورہ دیا جائے گا، تو اس سے وہ ضرور فائدہ اٹھائے گی، اس لیے کہ اس کے دستور نے یہ کہہ کر کہ ''رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، اور کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو'' نیز مولانا کے لٹریچر نے جو اسی اصول پر مبنی ہے، اس کے ذہن کی وہ تربیت کی ہے، جو عصر حاضر میں کم جماعتوں کی گئی ہوگی، میں نے کتاب کے مسودہ کو بار بار اس خیال سے پڑھا کہ اس میں کوئی طنزیہ جملہ یا تیز لفظ ایسا نہ ہو جو اس مقصد کے لیے مضر ہو، اور جہاں کوئی جملہ یا لفظ زور قلم میں اتفاقاً نکل گیا تھا اس کو حذف کر دیا۔

میرا ارادہ تھا کہ کتاب کے چھپنے کے بعد اس کا پہلا نسخہ اپنے خط کے ساتھ مولانا کی خدمت میں بھیجوں، میں نے یہ خط احمد نگر سے ۳۰ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کو لکھا، لیکن جن صاحب کے ساتھ اس کتاب اور خط کو بھیجنا تھا ان کا سفر ملتوی ہو گیا، اور کتاب قدرے تاخیر سے ان کو ملی، اس کتاب پر مولانا کا ردعمل اس ردعمل سے بہت مختلف تھا جو ہندوستان میں جماعت کے حلقہ کے عام ہمدردوں اور متفقین میں دیکھا گیا، میری کتاب غالباً مولانا کو وسط جنوری ۱۹۷۹ء میں ملی، انھوں نے ۲۳ر جنوری کو اس کی رسید دیتے ہوئے حسب ذیل گرامی نامہ تحریر کیا۔

اے، ذیل دار پارک اچھرہ، لاہور پاکستان

محترمی ومکرمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

''عنایت نامہ مورخہ ۵ر صفر ۹۹ھ ملا، اور اس کے ساتھ آپ کی تازہ کتاب ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' کا ایک نسخہ بھی موصول

ہوا، میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ میری جس چیز کو آپ نے خدشات کا موجب سمجھا اس پر تنقید فرمائی، مزید میری جن چیزوں کو آپ دین اور اہل دین کے لیے مضرت رساں یا موجب خطر سمجھتے ہوں ان پر بھی آپ بلا تکلف تنقید فرمائیں، میں نے کبھی اپنے کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا، نہ میں اس پر برا مانتا ہوں، البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ میں ہر تنقید کو برحق مان لوں، اور ناقدین کے بیان کردہ خدشات اور اندیشوں کو صحیح تسلیم کرلوں"۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں، میں اظہارِ خیال، دینی صلاح ومشورہ اور فکر وفہم کے اس قدرتی تنوع کے حق کو محفوظ رکھتے ہوئے (جو ہر صاحبِ فکر بلکہ طالب علم کا حق ہے، اور جس کا اظہار تاریخ اسلام کے ہر دور میں ہوتا رہا ہے) بحیثیت مصنف، متکلم، مفکر اور داعی کے ان کے امتیازی وانفرادی خصوصیات اور بڑائی کا نہ صرف فراخ دلی بلکہ مسرت اور بہت سے مشترک روابط وخصوصیات کی بنا پر ایک گونہ فخر کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی اسلامی خدمات کا پورا صلہ عطا فرمائے، ان کی ان لغزشوں سے جن سے نبی معصوم کے سوا کوئی فرد بشر خالی نہیں، درگزر فرمائے، اور امت مسلمہ کی صحیح رہنمائی اور دست گیری فرمائے۔

"اللّٰھم اغفر له و لا تفتنّا بعدہٗ"

□□□

سینے کے داغ

چند عزیز اور محبوب شخصیتیں جنھوں نے داغ مفارقت دیا

- مولانا سید ابو الخیر برقؔ
- امۃ اللہ تسنیم صاحبہ مرحومہ
- محمد الحسنی عرف محمد میاں مرحوم
- مولوی اسحٰق جلیسؔ ندوی

مولانا سید ابوالخیر برقؒ

مولانا سید ابوالخیر میرے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے، ماموں بھی ایسے جو باپ کی طرح شفیق تھے، میرے والد مرحوم (مولانا سید عبدالحی صاحبؒ) کا انتقال ہوا تو میری عمر نو دس کے درمیان تھی، لیکن لکھنؤ، رائے بریلی دونوں جگہ خدا نے دو سایۂ پدری عطا فرمائے تھے، لکھنؤ میں بڑے بھائی صاحب (مولوی ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب) جنھوں نے باپ کی جدائی کا غم بھلا دیا، اور یتیم بھائی کی ایسی پرورش کی کہ باید و شاید، رائے بریلی میں میرے شفیق ماموں مولوی حافظ سید عبیداللہ صاحب تھے، جنھوں نے اپنی اولاد میں اور مجھ میں فرق نہیں کیا، بلکہ کچھ ترجیح ہی دی، رائے بریلی والد صاحب کی زندگی میں والدہ صاحبہ کے ساتھ جاتا تو ماموں کا گھر اپنا گھر تھا، مہینوں رہنا ہوتا۔

ماموں مولوی حافظ سید عبیداللہ صاحب مرحوم عجیب دلآویز اور جامع شخصیت کے مالک تھے، اور بعض اہل نظر کے بقول اسلامی زندگی کا ایک چلتا پھرتا نمونہ، اپنے زمانہ کے شیخ کامل حضرت سید شاہ ضیاء النبیؒ کے فرزند ارجمند، قرآن مجید کے جید حافظ تھے، بہت صاف صحیح اور دلکش انداز میں پڑھتے، حفظ جونپور میں حضرت مولانا مکی کے خاندان (۱) میں رہ کر جوان کے والد ہی کا دست گرفتہ تھا، مکمل کیا تھا، عربی تعلیم متوسطات تک لکھنؤ میں حاصل کی تھی، صرف، نحو بڑی پختہ تھی، مطالعہ کا شوق عمر بھر رہا، عربی و انگریزی دونوں کی

---

(۱) پورا نام مولانا ابوالخیر مکی تھا، مولانا ابوبکر صاحب فاروقی جونپوری ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ انھی کے فرزند ارجمند تھے، مولانا مکی کے والد ماجد مولانا سخاوت علی جونپوری حضرت سید احمد شہیدؒ کے نامی گرامی خلفاء میں تھے، ۱۹۵۷ء کے بعد ہندوستان کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر مکہ معظمہ چلے گئے تھے، وہیں انتقال ہوا اور جنۃ المعلیٰ میں مدفون ہوئے، مولانا کی ولادت وہیں ہوئی، اس لیے مکی کہلاتے تھے۔

استعداد تھی، اور دونوں کی کتابیں لغت کی مدد سے مطالعہ میں رہتی تھیں، خط نہایت پاکیزہ تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ موتی پروئے ہیں، معاملات کے نہایت صاف، امانتداری اور صفائی معاملات میں خاندان میں مشہور تھے، اس وجہ سے ان کے پاس بکثرت امانتیں رہتی تھیں، کاہلی اور سستی کی جیسے ہوا بھی نہیں لگی تھی، ایک بڑی جائداد کے مالک اور ضلع کے بڑے زمینداروں میں شمار ہونے کے باوجود، بڑے جفاکش، پابند اوقات اور مستعد تھے، چال سے بھی مستعدی اور عزم کا اظہار ہوتا، گھنٹوں کھڑے ہوکر کام کی نگرانی کرتے، وہی مسجد کے پنج وقتہ امام تھے، اور وہی اپنی جائداد و زمینداری کے نگراں، اور منتظم کار، مسجد میں کوئی دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ ان کو دنیا اور جائداد و جاگیر سے کوئی سروکار نہیں، اور کھیتی باڑی کی نگرانی کرتا ہوا دیکھتا تو سمجھتا کہ شاید نمازوں کی پابندی بھی مشکل سے ہوتی ہوگی، لیکن کیا مجال کہ ان میں سے کسی ایک چیز میں فرق آئے۔

تہذیب وشائستگی ان پر ختم تھی، چھوٹے اعزہ یا دوستوں کے لڑکے جوان کی اولاد کے برابر تھے، آجاتے اور وہ لیٹے ہوتے تو فوراً پاؤں سمیٹ لیتے اور بیٹھ جاتے، نوکروں اور مزدوروں کو بھی کبھی کسی درشت لفظ سے یاد نہ کرتے، ان کی زبان میں ڈانٹ ڈپٹ کا آخری لفظ ''نامعقول'' تھا، بالکل بے آزار انسان تھے، اور شاید ایذا رسانی اور دلشکنی کی صلاحیت فطری طور پر ان میں نہ تھی، ان کی موت پر میں نے ہندو، مسلمانوں اور کاشتکاری میں مدد کرنے والوں کو یکساں سوگوار پایا، مجھے خوب یاد ہے کہ ان کو جب سپرد خاک کیا گیا تو غیر مسلم مزدوروں اور ہرواہوں (۱) نے شرماتے اور ڈرتے ڈرتے کہا، کیا ہم بھی میاں کی قبر پر آکر کھڑے ہوسکتے ہیں؟ یہ ان کے اندرونی جذبات کا اظہار تھا، ۳۱ رمئی ۱۹۳۸ء کو ان کا انتقال ہوا اور خاندان اور بستی ایک بڑی بابرکت اور محبوب ہستی سے محروم ہوگئی۔

مولوی سید ابوالخیر صاحب ان کے بڑے بیٹے تھے، ولادت غالباً ۱۹۰۲ء میں ہوئی، ذہانت وحافظہ خداداد تھا، فارغ البالی اور کسی قدر زمینداری کے ماحول میں پرورش

(۱) کھیتی میں مدد کرنے والے مزدور اور ہل چلانے والے۔

ہوئی، اچھا کھایا، اچھا پہنا، گھر میں اندر باہر کئی کئی خدمت کرنے والے موجود تھے، زمینداری پھر اس عقیدت اور محبت کی وجہ سے جو عام طور پر اس گھر سے تھی، ہر ایک خیال اور لحاظ کرنے والا، والد بھی حافظ، والدہ بھی حافظ، خاندان میں مردوں کو چھوڑ کر کئی قریب کے رشتہ کی بیبیاں جید حافظ، جن میں خود ان کی دو پھوپھیاں، ایک ممانی، اور ایک خالہ زاد بہن شامل تھیں، رمضان میں ان کی جماعت کے ساتھ تراویح ہوتی، اور آدھی رات تک یہی رونق و برکت رہتی، وہ انھی گودوں میں پلے بڑھے، پہلی نرینہ اولاد ہونے کی وجہ سے سب نے ناز برداری کی، کچھ فطری تیزی طبع، کچھ زمیندارانہ ماحول کا اثر کہ طبیعت میں اپنی بات کے اونچے رہنے کا مادّہ پیدا ہو گیا، ان کی نظر کسی کے سامنے جھکتی نہ تھی، ابتدائی تعلیم خاندان کے دستور کے مطابق گھر ہی میں پائی، اور وقت سے پہلے زبان وادب کا چسکہ پڑ گیا، یہ وہ دور تھا، جب قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں مشاعرے ہوتے تھے، شعر کہنا زندہ دل اور پڑھے لکھے ہونے کی علامت تھی، خاندان میں بھی کئی شاعر تھے، اور سخن فہم اور شعر و سخن کے قدرداں تو سبھی تھے، ان کے چھوٹے بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن جامعی مرحوم کی روایت ہے کہ (۱) بالکل لڑکپن میں سکندر نامہ اور قلندر نامہ تصنیف کیا تھا۔

عربی تعلیم شروع ہونے کا وقت آیا تو خاندان کے معمول کے مطابق ندوہ بھیج

---

(۱) یادش بخیر حافظ سید حبیب الرحمٰن، مولوی حافظ سید عبیداللہ صاحب مرحوم کے منجھلے صاحبزادے اور مولانا سید ابوالخیر برق کے چھوٹے بھائی تھے، لکھنؤ میں اسکول میں داخل تھے کہ ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی، انھوں نے سرکاری اسکول چھوڑ کر نیشنل اسکولوں میں داخلہ لیا، پھر علی گڑھ اور دہلی رہ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بی اے تک تعلیم حاصل کی، اور اسی زمانہ میں محض اپنے شوق سے قرآن مجید حفظ کر لیا، مطالعہ وسیع اور شعر وشاعری کا ذوق بچپن سے تھا، لیکن سخن فہمی اور داد و تحسین تک محدود تھا، اساتذہ کا کلام بکثرت یاد تھا، میرے شعری وادبی ذوق کی پرورش انھی کی صحبت میں ہوئی، ہم لوگوں سے اشعار کے معنی پوچھتے، بیت بازی کراتے، اچھے اور منتخب شعر سناتے اور اور شعراء میں موازنہ کرتے، ورزش اور ورزشی کھیلوں کا بڑا شوق تھا، قرآن مجید بہت اچھا یاد تھا، آخر عمر میں ان کو کئی شدید صدمے اٹھانے پڑے اور صحت خراب رہنے لگی، اس حالت میں ان کا انیس و مونس قرآن مجید کی بکثرت تلاوت اور اس کا انہماک تھا، ۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ ۳ر جون ۱۹۷۴ء کو ستر سال کی عمر میں انتقال کیا، اس مضمون کی بیشتر معلومات انھی کے ایک مضمون اور زبانی روایات سے ماخوذ ہیں۔

دیئے گئے، جس کے ناظم ان کے حقیقی پھوپھا مولانا سید عبدالحی صاحب تھے، اس وجہ سے لکھنؤ بھی گھر ہی تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، اور وہیں دارالاقامہ میں رہنے لگے، لکھنؤ میں ان کی شفیق پھوپھی (میری والدہ صاحبہ تھیں) خاندان میں ان بھائی بہن (میرے ماموں اور والدہ) کی محبت ضرب المثل تھی، ندوہ کی تعلیم میں بھی ان کے جوہر کھلے، کسی جلسہ کے موقع پر جس میں نواب ذوالقدر جنگ بہادر شریک تھے، انھوں نے عربی میں برجستہ ایسی تقریر کی کہ نواب صاحب نے ایک انعامی رقم کا اعلان کیا، ان کے پھوپھا مولانا سید عبدالحی صاحب نے یہ رقم اپنے اختیارات خصوصی سے کام لیتے ہوئے ندوہ میں داخل کردی، ان کے ساتھیوں میں تین صاحبوں کے نام یاد ہیں، مشہور صحافی مولانا ظفر قدیر ندوی کیتھلی حال مقیم لاہور، مولوی حفیظ الدین ندوی جامعی سابق ایڈیٹر "اسلام اور عصر جدید" (جامعہ) دونوں ماشاء اللہ ابھی حیات ہیں، اور مولوی سعد الدین ندوی فاضل ازہر مصر واستاد جامعہ ملیہ اسلامیہ (برادر خورد مولانا عبدالباری ندویؒ) جو مرحوم ہوچکے ہیں، لکھنؤ ہی کے قیام ہی کے زمانہ میں ان کو لکھنؤ کی زبان سیکھنے اور لکھنؤ کی زبان بولنے کا شوق کیا، عشق پیدا ہوگیا، وہ قصباتی زبان کے سایہ سے بھی بھاگتے، اور زبان کی غلطی اور محاورہ کے خلاف بولنے کو گناہ کبیرہ سمجھتے تھے، اور ان کو اس سے سخت عار تھا، یہ ذوق اس حد تک پہنچا کہ وہ لکھنوی کہلانے اور لکھنے لگے اور ساری عمر یہی ان کا معمول رہا، واقعہ بھی یہی ہے کہ محاورات کی تحقیق، تذکیر وتانیث کی واقفیت اور لکھنؤ کے طرز ادا اور لہجہ پر ان کو ایسا عبور ہوگیا تھا کہ وہ ہر طرح لکھنوی کہلانے کے مستحق تھے، اور اس بارے میں ان کا شمار خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ لکھنوی کے بعد ہوسکتا ہے، ان کا یہ شوق مبالغہ اور غلو کی حد تک پہنچ گیا تھا، یہاں تک کہ انھوں نے لکھنؤ کے قدیم محلوں میں جہاں اب بھی لکھنؤ کی ٹکسالی زبان بولی جاتی ہے، آنا جانا شروع کیا اور لکھنؤ کے اساتذۂ سخن اور شیعہ گھرانوں سے راہ ورسم پیدا کرلی، جو ان کے ماحول واعزہ کو بہت کھٹکی اور اس سلسلہ میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں، لیکن انھوں نے اس کی پرواہ نہیں کی، اس کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ زبان میں ان کو سند کا درجہ

حاصل ہوگیا، وہ جس لفظ کو مذکر کہہ دیں کیا مجال کہ وہ مؤنث نکلے، جس کو مؤنث کہہ دیں کیا مجال کہ وہ مذکر ثابت ہو، اچھے اچھے ادیبوں اور انشاپردازوں کی غلطی پکڑتے اور چند ہی اساتذہ کو مانتے، میں کوئی مضمون لکھتا اور کوئی شبہ پیش آتا تو میں ان کی طرف اس طرح رجوع کرتا جیسے لغت دیکھا جائے، وہ برجستہ جواب دیتے اور وہ حرفِ آخر ہوتا۔

اسی طالب علمی اور نوجوانی میں وہ مولانا عبدالحلیم شرر کے یہاں آنے جانے لگے، جو لکھنؤ سے "دلگداز" نکالتے تھے، لیکن انھوں نے شرر صاحب کا طرز اختیار نہیں کیا، شرر صاحب بہت سادہ لکھتے تھے، اور لکھنؤ کے محاورات اور لفظی رعایتوں سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی، انھی کی ہدایت پر وہ لکھنؤ کے اس وقت کے مقبول وہردلعزیز شاعر ابوالفضل شمس لکھنوی کے شاگرد ہوگئے، اور شاعری میں انھی کا تتبع کیا، اور آخر عمر تک انھی کو مانتے رہے۔

ابوالفضل شمس لکھنوی کو مولانا برکت اللہ رضا فرنگی محلی سے تلمذ تھا، اور جانشینی کا فخر بھی، شمس لکھنؤ کی زبان اور لکھنوی دبستان کے پورے نمائندے تھے، اس کے کچھ نمونے سنتے چلیے۔

مانتے ہی نہیں جب آپ کچھ احساں میرا
تو مجھے پھیر ہی دیجیے دلِ ناداں میرا

آپ کو زحمت تو ہوگی اب ذرا ہٹ جایئے
مشورہ کرنا ہے مجھ کو کچھ دلِ بیمار سے

اللہ خیر کرنا آثار کچھ برے ہیں
نکلے ہیں لوگ چپ چپ بیمار کے مکاں سے

گل فسردہ ہوئے بلبل کی زبان بند ہوئی
بےکسی ساتھ لیے باغ میں صیّاد آیا

ترچھی نظریں کیے خنجر لیے، تیور بدلے
آج مقتل میں بڑے ٹھاٹھ سے جلّاد آیا

پلٹ کے کہتی ہیں یہ آنکھوں کی پتلیاں دم مرگ
چلو یہاں سے کہ دنیا کا اعتبار نہیں

شمسؔ کا رنگ برقؔ کی زبان وشاعری میں صاف چمکتا ہے، اور اپنی تابانی دکھلا جاتا ہے، اسی زمانہ میں "دلگداز" میں ان کی ایک غزل چھپی جس میں شمسؔ کا رنگ صاف جھلک رہا ہے۔

پست ہمت ہوچکی تو پھر کہاں دل میں امنگ
جس سے بیٹھا بھی نہ جائے کیسے وہ اٹھ کر چلے
ضعف سے راہ محبت میں بہت سجدے کیے
گر پڑے ہم سر کے بل جب دو قدم اٹھ کر چلے
کچھ نہ کچھ ساقی رہے دل کے بہلنے کا سبب
آنکھ کی گردش رکے تو بزم میں ساغر چلے

لکھنؤ کے رنگ کے دو شعر اور سنیئے۔

ابھی ناواقف وحشت ہوں ابھی غربت کا ستایا ہوں
بگولو اٹھ کے بتلادو ذرا راہیں بیاباں کی

ہوش آیا ہے ضعیفی میں جوانی کاٹ کر ہائیں آنکھیں اب کھلی ہیں جب سویرا ہوگیا

لکھنؤ کی طالب علمی اور نوجوانی ہی کا زمانہ تھا اور شعر وشاعری کی دھن کہ والد صاحب نے (شاید اس ماحول سے ہٹانے کے لیے) لاہور بھیج دیا کہ وہاں اورینٹل کالج میں اپنی تعلیم مکمل کر کے مولوی فاضل ہوجائیں، اس زمانہ میں وہاں کی ڈگریوں کا بڑا دور دورہ تھا، لوگ فارسی عربی میں کچھ استعداد پیدا کر کے وہاں چلے جاتے تھے، اور منشی فاضل یا مولوی فاضل ہوکر صرف انگریزی میں امتحان دیتے ہوئے (جس کی پنجاب یونیورسٹی

نے اجازت دے رکھی تھی) بی،اے،ایم،اے کر لیتے تھے،اور اس مختصر راستہ سے ان کو دفتروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اچھی جگہ مل جاتی تھی، لاہور میں ان کے خاندان کے ایک عزیز بزرگ مولانا سید طلحہ صاحب حسنی ایم،اے استاد اورینٹل کالج موجود تھے، اس سے اور بھی آسانی تھی، برقؔ صاحب (غالباً ۱۹۲۱ء) میں لاہور گئے اور اورینٹل کالج میں نام لکھوایا اور غالباً روشنائی دروازہ کے اورینٹل کالج کے ہوسٹل میں جو حضوری باغ سے متصل ہے رہے، معلوم نہیں کتنے مہینے ان کا قیام رہا، لیکن وہ امتحان دینے سے پہلے اپنی سراپا شفقت والدہ کے انتقال کی خبر سن کر واپس آ گئے، پھر وہ تعلیم کے لیے لاہور نہیں گئے، انھوں نے بقیہ تعلیم کی تکمیل مولانا عبدالرحمٰن صاحب بستوی تلمیذ مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی عرف میاں صاحب سے کی، انھی سے انھوں نے حدیث کی کتابیں پڑھیں، مولانا عبدالرحمٰن صاحب صرف عامل بالحدیث اور عدم تقلید ائمہ کے پابند نہ تھے بلکہ اس کے سرگرم داعی اور مبلغ بھی تھے، ان کے اثر سے بھائی مرحوم نے ان کا مسلک اختیار کیا، اور ان کے رنگ میں رنگ گئے، مولوی صاحب نے رائے بریلی میں قیام اختیار کر لیا تھا، اور ان کی تبلیغ ودعوت سے شہر میں اس کی ایک تحریک چل گئی تھی، ان کے ہم مسلکوں کی ایک اچھی خاصی جماعت پیدا ہوگئی، اس زمانہ کی فضا اور ہوا کے مطابق اس کی سخت مخالفت بھی کی گئی، کہیں کہیں تصادم بھی ہوگیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ عدالت نے چند مسجدیں جماعت اہل حدیث کے لیے مخصوص کر دیں، بھائی مرحوم جس خیال کو قبول کرتے تھے، پوری سرگرمی اور جوش خروش کے ساتھ قبول کرتے، اس لیے انھوں نے بھی اس تحریک میں سرگرم حصہ لیا، اور اپنی ذہانت، قوی حافظہ اور خود اعتمادی سے اس کو بہت فائدہ پہنچایا، خاندان میں بھی اس اختلاف خیال کی کچھ پرچھائیاں پڑیں، لیکن جلد ہی سمٹ گئیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے اثر سے یہاں دونوں مسلک کے لوگ ہمیشہ سے شیر وشکر رہے، اور ان میں کبھی شکر رنجی اور اختلاف میں کبھی تلخی وتندی پیدا نہیں ہوئی۔

ان کے حدیث کے مطالعہ اور شغف کو یہیں چھوڑ کر کہ اس پر خاتمہ بالخیر ہونا ہے، ہم پھر ان کی شاعری کی طرف آتے ہیں، ان کی شاعری کا مشغلہ برابر جاری رہا، ادب عربی جس

سے ان کو شروع سے مناسبت تھی، اور مشکل الفاظ کا یاد رکھنا اور ان کی تحقیق، ان کے خاص ذوق کی چیز تھی، حدیث اور ادب عربی کے اشتغال اور اردو شعر و شاعری میں ان کے یہاں کچھ بیر نہ تھا، وہ بسیار گو شاعروں میں کبھی نہ تھے، مشاعروں میں بھی بہت کم جاتے، کم ہی انھوں نے مشاعرہ پڑھا ہے، لیکن جب وہ اپنی دردناک آواز میں خالص لکھنؤ کی زبان میں اپنی غزل شروع کرتے تو سب کو متوجہ کر لیتے، ایک غزل ایک مشاعرہ میں بالکل نوجوانی میں پڑھی، یہ غالباً ۱۹۲۰ء کا زمانہ تھا، اس غزل کے اس شعر پر ان کو بہت داد ملی، اور لکھنؤ کے مشہور استاد سراج لکھنوی مشاعرہ ختم ہونے کے بعد تک یہ شعر دہراتے رہے۔

ذرا سمجھ کے نکل دل سے آہِ سوز آگیں
مجھے سِیئے ہوئے زخموں کا اعتبار نہیں

ان کے شہباز شاعری نے جب پر و بال نکالے اور اس کو بلند پروازی کا شوق ہوا اور زبان کے چٹخارے سے زیادہ ان کو مضمون آفرینی اور معنویت کی طرف رجحان ہوا تو ان کی مشورۂ سخن کے لیے لکھنؤ کے مشہور شاعر مرزا ثاقبؔ قزلباش پر نظر پڑی، ثاقبؔ صاحب اکبرآباد کے رہنے والے تھے، اور انھوں نے لکھنؤ سے زیادہ دہلی کا رنگ اور میر و غالب کا انداز پسند کیا تھا، اور ان کے کلام میں زبان کی صحت و محاورات کو احتیاط کے ساتھ استعمال کرنے کے ساتھ نئے خیالات و مضامین ملتے ہیں، اور فارسی ترکیبوں کی چستی اپنا رنگ دکھاتی ہے، لکھنؤ کی زبان کا ایک نمونہ دیکھیے یہ شعر بھائی مرحوم ہی سے سنا تھا۔

اپنا سا زور کر کے تھکے منعمانِ دہر
مٹھی نہ کھل سکی مرے دستِ سوال کی

اور ان کا یہ شعر تو بڑا مقبول ہوا اور علماء کے حلقہ میں بھی اس سے بارہا کام لیا گیا۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانہ کو میرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

اسی غزل کا یہ شعر بھی سنتے چلیے، جو حسرت و عبرت کا ایک مرقع ہے۔

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

ثاقبؔ صاحب کے تلمذ کا سلسلہ کئی برس تک جاری رہا مگر برقؔ صاحب ان کی استاذی کے قائل ہونے کے باوجود ان کے پورے رنگ پر نہ آسکے، اصل میں لکھنؤ کی زبان نے ان کا دامن کبھی نہ چھوڑا، اور شمسؔ کا رنگ جو شروع میں ان پر چڑھا وہ کبھی ڈھل نہ سکا، پھر بھی ثاقبؔ صاحب کو استاد مانتے تھے، مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں ان کے ساتھ امین آباد جارہا تھا کہ گھنٹہ گھر والے پارک کے سامنے کاظم صاحب کی گھڑی کی دکان پر وہ مل گئے، وہ نیاز مندانہ اور شاگردانہ آداب بجالائے اور فرمائش کی کہ ثاقبؔ صاحب ان کو شعر کا کوئی تبرّک دیں، انھوں نے چھوٹی بحر میں ایک تازہ غزل سنائی اور انھوں نے اس کو وہیں نوٹ کرلیا، پھر بھی ان کے کسی کسی شعر میں ثاقبؔ صاحب کا رنگ آجاتا، ایک صاحب نے برقؔ صاحب سے فرمائش کی کہ ایک شعر ایسا کہیے جو چاندی کے گلاس پر کندہ کرسکیں جو ہیڈ ماسٹر کو رخصتی کے وقت پیش کیا جائے گا، انھوں نے یہ شعر لکھ کر دے دیا۔

ظرف عالی آپ کا یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر
ایسی سمٹی چاندنی چاندی کا ساغر بن گئی

وہ خود نمائی سے ہمیشہ گریزاں بلکہ متنفر رہے، اور اسی چیز نے ان کو زیادہ روشناس نہ ہونے دیا، اور ان کو زبان وادب میں وہ مقام کبھی نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے، اس کے برخلاف جو لوگ زبان وادب کی تحقیق اور ذوق صحیح میں ان کے پاسنگ بھی نہ تھے لیکن ان کو اپنے اظہار کا فن آتا تھا، وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے، پھر بھی کبھی اپنے چھوٹے بھائی حافظ حبیب الرحمٰن صاحب یا دوسرے عزیزوں کے اصرار سے کسی ایسے مشاعرہ...... میں شریک ہوگئے جو انعامی تھا، اس میں بڑے بڑے اساتذہ اور بوڑھے بوڑھے شعراء شریک تھے، لیکن انعام انھی کو ملا، ۱۹۳۰ء کے ایک انعامی مشاعرہ میں جس کا مصرع طرح تھا۔

پھولوں نے ہنس کے آگ لگادی بہار میں

اور نواب جعفر علی اثر لکھنوی میر مشاعرہ تھے، برق صاحب کو انعام ملا، ایک اور مشاعرہ میں بھی گئے، اس میں بھی انعام ملا۔

آخر میں ان کے خاص حالات اور زندگی کی ناکامیوں نے ان کے اشعار میں ایسا دردو سوز بھر دیا تھا کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اور بعض اوقات تو دل بھر آتا ہے، اور آنکھیں پُرآب ہو جاتی ہیں، اس کا بہترین نمونہ ان کی "دعائے مضطر" تھی، جو زبان کی صفائی اور سادگی کے ساتھ تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے، چند بند آپ بھی پڑھتے چلئے۔

کف دست میدان اور ایک ہستی
کڑی دھوپ ہے آگ سی ہے برستی
نہ پانی نہ سایہ نہ دریا نہ بستی
کلیجہ میں ایک آگ، ہمت میں پستی

ندامت سے بھی میں پسینے پسینے
نہ پوچھا مگر حال یارب کسی نے

بسیرا ہے چپ، بے خبر اہل منزل
سکون موج دریا میں، خاموش ساحل
ہوئی شام اٹھتا نہیں در سے سائل
ترے پاس لایا ہے ٹوٹا ہوا دل

حکیم جہاں آفریں، چارۂ درد
ہوا جاتا ہے میرا جینے سے دل سرد

تیرے قبضہ میں طالع خاوری ہے
جہاں پر سدا سے کرم گستری ہے
زمانہ میں تیری ہی جلوہ گری ہے
ہر ایک شئی پہ یارب تجھے برتری ہے

کر اب میرے مالک میری دستگیری
تیری ہی ریاست تیری ہی امیری

زمانہ سے میں ایک آفت رسیدہ
سر اشکِ غم آنکھوں میں دل ہے طپیدہ
ولیکن مثالِ گلِ نودمیدہ
لبوں پر تبسم گریباں دریدہ

یوں ہی رات ساری بسر ہوگئی ہے
نہیں آنکھ جھپکی سحر ہوگئی ہے

برقؔ صاحب کا اصل میدان غزلیہ شاعری تھی، لیکن وہ نثر بھی لکھتے تھے، ان کی نثر میں زیادہ تر لکھنؤ کے محاورات اور وہاں کی مرصع زبان ہوتی، اس میں وہ زیادہ تر مولوی محمد حسین آزاد کے متبع تھے، اور ''نیرنگ خیال'' کا رنگ نیرنگ دکھایا تھا، نقدِ سخن سے بھی ان کو بہرۂ وافر ملا تھا، مومنؔ خاں کو وہ ان کے تمام معاصر اساتذہ سخن پر کھلی ترجیح دیتے تھے، لطف لے لے کر ان کی غزلیں اور نظمیں پڑھتے اور ان سے وہ ان کی استادی، سخنوری اور زبان پر قدرت کی دلیلیں پیش کرتے، انھوں نے ان کے اور ان کے معاصر شعراء کے موازنہ کے موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، جو اُن کی دوسری تصنیفات کی طرح زیرِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکی، ان کی ایک پسندیدہ تصنیف ''نوادر'' کے نام سے ہے، جس میں انھوں نے بہت سے تاریخی، علمی، ادبی نکات جمع کیے تھے، اور بڑی تلاش سے عجائباتِ عالم و آثارِ قدیمہ کی تصویریں بھی چسپاں کی تھیں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے جو اس وقت شیخ الجامعہ تھے، اس پر ایک مختصر تقریظ بھی لکھی تھی، وہ بھی ان کے تبرکات میں موجود ہے، اس کے علاوہ بھی ان کی متعدد مکمل و نامکمل تصنیفات میں جو سب غیر مطبوعہ ہیں، انھوں نے اپنے اہتمام سے دو ہی چیزیں چھپوائیں ایک جوانی کے کلام کا ایک مجموعہ ''شب فرقت'' کے نام سے دوسرے بعض اردو مضامین کا ایک مجموعہ ''تاثرات'' کے نام سے، لیکن دونوں سے ان کے

پایہ اور مرتبہ کا اصل اندازہ نہیں ہوتا۔

جامعہ کے نام پر یاد آیا کہ وہ کچھ عرصہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں عربی کے استاد بھی رہے، پھر معلوم نہیں کس بنا پر ترک تعلق کیا؟ اور آزادانہ زندگی گزاری۔

غالباً ۱۹۲۴ء میں وہ حج کو گئے، یہ زمانہ شریف حسین کی حکومت کا آخری زمانہ تھا، بدامنی، پانی کی نایابی، اور بدوؤں کی غارتگری کا دوردورہ تھا، اس وجہ سے وہ مدینہ طیبہ نہ جاسکے، مکہ معظمہ میں ان کی زیادہ نشست و برخاست، مدرسہ فخریہ عثمانیہ میں اس کے مہتمم قاری اسحاق صاحب رُہتکی کے پاس رہتی تھی، (جن کی میں نے بھی ۱۹۴۷ء میں زیارت کی ہے) جو ذی علم اور جہاندیدہ بزرگ تھے، وہ بھائی مرحوم کی عربیت اور حافظہ سے بہت متاثر ہوئے، اور انھوں نے اپنا ایک تصدیق نامہ بھی لکھ کر دیا، جو میں نے مرحوم کے حالات مندرجہ ''تراجم علمائے اہل حدیث'' مصنفہ مولوی ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی میں درج کردیا ہے، عربی میں مضامین تو انھوں نے بہت کم لکھے ہوں گے، ایک مرتبہ میں نے زمانہ طالب علمی ''نسمات الاوراق'' کے نام سے ایک قلمی رسالہ نکالا، اس کے لیے انھوں نے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں زیادہ تر قرآن کا اقتباس اور قرآنی اسلوب کا تتبع تھا، کبھی کبھی شعر بھی کہتے، اپنے پھوپھا اور خسر اور میرے والد مولانا سید عبدالحی صاحب کا عربی میں مرثیہ لکھا تھا، جو انھوں نے خاندان کے ایک جلسہ میں پڑھ کر سنایا۔

انھوں نے کبھی کوئی ذریعہ معاش اختیار نہیں کیا، ملازمت سے ان کو بالکل مناسبت نہ تھی، کچھ عرصہ انھوں نے اپنی زمینداری کا کام دیکھا، اور اپنی خوش انتظامی کا ثبوت دیا، شکار کے وہ بڑے شوقین تھے، اس زمانہ کے زمیندار گھرانوں کے نوجوان بندوق ضرور رکھتے تھے، اور سیر وشکار فیشن میں داخل تھا، جائداد کے اس انتظام میں ان کو شکار کا بڑا موقع ملتا تھا، ان کا ضلع فتحپور میں ایک مستقل گاؤں تھا، تحصیل وصول کے سلسلہ میں مہینوں ٹھہرتے، شکار کھیلتے اور مطالعہ کرتے اور کبھی کبھی شعروشاعری، حدیث شریف کا بھی (جس کا تفصیل سے ذکر آئے گا) دور رکھتے، کچھ عرصہ کے بعد ان کی طبیعت اس سے

اچاٹ ہوگئی، اس زمینداری کا اودھ میں دم واپسیں تھا، اس کے بعد انھوں نے ہومیو پیتھک کا مشغلہ شروع کیا، طبیعت رسا تھی، شروع میں شاید طب کی بھی کوئی کتاب پڑھی تھی، چند مہینہ رائے بریلی شہر میں مطب کیا، ان کی رفتار، گفتار ہر چیز میں ٹھہراؤ اور سکون تھا، دوا کا انتخاب بھی وہ بڑے سکون واطمینان سے کرتے، بڑے تکلف سے اس کی خوراک تیار کرتے، اور مریض کو دیتے، کچھ عرصہ بعد انھوں نے لکھنؤ کے محلّہ چکمنڈی میں مطب شروع کیا، وہاں کے لوگ ان سے بہت مانوس ہوئے، اوران کی حذاقت سے زیادہ ان کی خوش خلقی نمایاں ہوئی ہر شخص کے ساتھ عزت وتکریم سے پیش آتے، اوران کے خلوص وسکینت سے متاثر ہوتے، اس محلّہ کے لوگ ابھی تک ان کو یاد کرتے ہیں، بعض گھرانوں کو ایسا تعلق پیدا ہوگیا کہ ان کے افراد اب بھی ان کے نام پر آبدیدہ ہوجاتے ہیں۔

سفر وہ بہت کم کرتے تھے، ایک زمانہ میں اپنے شوق سے شولاپور، بیجاپور اور حیدرآباد گئے، کچھ عرصہ برادر معظم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کی تحریک پر ندوہ کی سفارت کی خدمت انجام دی، اوراس سلسلہ میں بھوپال، بمبئی اور لاہور گئے، ایک مرتبہ انھوں نے طویل غیر ملکی سفر کیا، جوان کے لیے بہت تکلیف دہ اور ایک طویل بیماری کا پیش خیمہ ثابت ہوا، مراکشی سفارت خانہ دہلی کے ایک کارکن ان کے علم وفضل اور حفظ حدیث سے بہت متاثر ہوئے، مسلکاً وہ اہل حدیث تھے، رمضان المبارک میں معمول ہے کہ ملک حسن ثانی شاہ مراکش دیار وامصار کے مشاہیر علماء کو اپنے یہاں مدعو کرتے ہیں، قصر شاہی میں باری باری سے ان کا درس ہوتا ہے، جس میں مقامی علماء، اعیانِ شہر اور عہدہ دارانِ سلطنت شریک ہوتے ہیں، بادشاہ بنفسِ نفیس خود شریک ہوتے ہیں، اور آخر میں خود بھی تقریر کرتے ہیں، سفارت خانہ سے ان کا بھی نام گیا، اوران کو اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی گئی، انھوں نے ضعف وبیماری کی حالت میں طویل سفر کیا، ان کو نزلہ اور کھانسی کی شکایت عام طور پر رہتی تھی، سینہ کمزور تھا اور بدن منحنی، دہلی سے ان کو پیرس کی ایک پرواز ملی، اس مسلسل طویل سفر میں ان کو کھانسی کا دورہ پڑا اور بڑی

تکلیف ہوئی، مراکش پہنچ کر وہ بیمار ہو گئے، زیادہ تر وقت ان کا ہوٹل میں گزرا، وہاں تبلیغی جماعت کے بعض افراد کو معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ایک عالم اور حسنی خاندان کے ایک فرد آئے ہیں، انھوں نے بڑی خدمت اور تیمارداری کی، بھائی مرحوم ان کے بڑے ممنون تھے، واپسی پر وہ عرصہ تک بیمار اور ڈاکٹر فریدی کے زیر علاج رہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مراکش کی سرزمین پر پہنچنا اور وہاں کی فضا میں سانس لینا ان کے لیے مقدر ہو چکا تھا، اس لیے وہ وہاں پہنچائے گئے، ورنہ وہاں ان کے فضل وکمال کا کوئی اظہار نہ ہو سکا، اگر ان کو کسی دن اظہار کا موقع ملتا اور وہ قرآن کے رکوع کی طرح احادیث مع سند سناتے تو مراکش کے علماء اور دوسرے ممالک سے آئے ہوئے فضلاء جو اپنے حفظ اور استحضار میں مشہور ہیں، انگشت بدنداں رہ جاتے، مگر افسوس ہے کہ ان کی علالت جلسہ استقبالیہ کے ذمہ دار کے ناراض ہو جانے کی وجہ سے جس نے جہاز سے اترتے ہی ان سے پوچھا کہ کیا آپ عربی "تقریر کر سکتے ہیں" تو انھوں نے اپنی طبعی خودداری کے ساتھ کہا کہ "ہاں تم سے زیادہ صحیح اور فصیح زبان میں، تم تو صحیح عربی بھی نہیں بول رہے ہو" یہ بات ان کے لیے ایسی گرانی طبع کا باعث ہوئی کہ انھوں نے ان کو شاہ کے سامنے آنے کا موقع ہی نہ دیا، اور ان کا کوئی پروگرام نہیں رکھا۔

اب ان کے حدیث کی شغف اور اس کے ایک خاص پہلو میں ان کے امتیاز کے ذکر پر ان کے تذکرہ کو ختم کیا جاتا ہے کہ یہی "مسک الختام" ہے۔

ما آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

حدیث مع اسناد یاد کرنا اور یاد رکھنا محدثین سلف کا شعار رہا ہے، ایسے محدثین کی ہر زمانہ میں کثیر تعداد رہی ہے، جن کو پوری پوری حدیث کی کتاب زبانی یاد تھی، جب مطابع قائم ہوئے، اور حدیث کی کتابیں گھر گھر ملنے لگیں تو حفظ حدیث کا رواج کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا اور اسانید کے حفظ کا تو خیال ہی ذہن سے نکل گیا، مجھے مغرب اقصیٰ کے گزشتہ

سفر میں جو مئی ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا، الدار البیضاء (کاسابلانکا) میں عبدالرحمٰن نامی ایک نوجوان طالب علم سے ملنا ہوا تھا، لوگوں نے بتایا کہ ان کو صحیح مسلم مع سند کے یاد ہے، ان کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا حافظِ حدیث مجھے نہیں ملا۔

بھائی مرحوم کو کب اور کس طرح اس کا خیال آیا یہ تو معلوم نہیں، لیکن انھوں نے موطاء اور صحیح مسلم یاد کرنے کا بیڑا اٹھایا، دونوں کتابوں کی ہزاروں حدیثیں مع سند کے انھوں نے حفظ کرلیں، صحیح تعداد اور مقدار تو معلوم نہیں ہوسکی، ہم لوگوں میں اس بات کا چرچا تھا کہ موطا ان کو پوری یاد ہے، اور مسلم کا بھی ایک خاصہ حصہ، وہ ادنیٰ مناسبت سے حدیث مع سند کے پڑھنا شروع کردیتے تھے، اس وقت ان کے چہرے پر ایک خاص چمک، آواز میں سوز واثر محسوس ہوتا تھا، وہ بڑے دلکش انداز میں اور عربی لہجہ میں احادیث کی تلاوت کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے لطف اندوز ہورہے ہیں، اور ان کی روح اس سے وجد میں آرہی ہے، بعض مرتبہ مسجد میں ان کو تنہا بیٹھے ہوئے زبانی احادیث کی تلاوت کرتے ہوئے سنا تو عجیب کیف محسوس ہوا، سند بھی وہ بڑے اہتمام اور لطف سے پڑھتے، جیسے ان کے کام ودہن لذت یاب ہورہے ہوں، اللہ کو اپنے بندے کا کون سا عمل پسند آتا ہے، اور وہ اس کے لیے ذریعہ مغفرت بن جاتا ہے، اس کو عالم الغیب ہی جانتا ہے، لیکن امید ہے کہ حدیث رسول سے یہ شغف، اس کا اہتمام واحترام، اور اس سے ذوق ولذت حاصل کرنا ان کے لیے انشاء اللہ وسیلۂ مغفرت وموجب قرب بن گیا ہوگا، حفظ حدیث کے علاوہ وہ شرح وتطبیق احادیث سے بھی ذوق رکھتے تھے، ''مشکلات الحدیث'' کے نام سے انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی، جس کا مسودہ افسوس ہے کہ ان کے مسودات کے ذخیرہ میں محفوظ نہیں رہا، ان کو علامہ حافظ ابن حجر سے بڑی عقیدت تھی ایک زمانہ میں وہ اپنے نام کے ساتھ ابن حجر بھی لکھتے تھے۔

اخیر میں ان کی صحت خاصی خراب رہنے لگی تھی، کئی شکایتیں پیدا ہوگئی تھیں، لکھنؤ میں وہ ایک مسافرانہ اور قلندرانہ زندگی گزار رہے تھے، افتادِ طبع نے عزیزوں اور دوستوں کا

احسان لینے سے ہمیشہ انکار کردیا، وہ چکمنڈی ہی کے اپنے قیام گاہ میں بیمار ہوئے، جب طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اپنے پھوپھا (مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب) کے قدیم مکان واقع گوئن روڈ محمد علی لین جواب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے گھرانے کی قیام گاہ ہے، جہاں ان کی طالب علمی اور ازدواجی زندگی کے بہترین دن گزرے تھے، آگئے، خواہر زادہ عزیز مولوی سید محمد ثانی حسنی مدیر ''رضوان'' سے وہ بہت مانوس تھے، جو ان کے بھانجے بھی ہوتے ہیں، اور بھتیجے بھی، ایک مختصر علالت کے بعد جس میں دوسروں سے خدمت لینے کی ضرورت نہیں آئی، وہ ۲؍جون ۱۹۷۰ء کو اس دنیا کو خیر باد کہہ گئے، انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۸ سال تھی، میں لکھنؤ ہی میں تھا، حادثہ کی اطلاع ملی، حاضر ۱۹ ء سے ۱۹۷۰ء تک کا زمانہ جو میرے شعور کا زمانہ ہے ایک کھلی کتاب کی طرح آنکھوں کے سامنے تھا، ان کے فطری و علمی کمالات ایک امانت اور راز سربستہ کی طرح ان کے ساتھ گئے، ان کی افتاد طبیعت، زندگی کے حوادث، اہل زمانہ کی ظاہر بینی اور جوہر ناشناسی نے ان کے نمایاں ہونے کا موقع نہ دیا، اسی دن سہ پہر کو وہ اپنے آبائی قبرستان واقع دائرۂ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں اہل خاندان، عزیزوں اور دوستوں کی ایک تعداد کی موجودگی میں اپنے ستودہ صفات اور فرشتہ خصلت باپ اور اپنے عالی مرتبت دادا کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

رحمہ اللہ وغفرلہٗ

❑❑❑

میری بہن امۃ اللہ تسنیم صاحبہ مرحومہ

پورے نصف صدی پچاس سال کی بھائی بہن کی محبت، یکجائی، رنج وخوشی میں شرکت، مطالعہ وکتب بینی میں رفاقت، تحریر وتصنیف میں صلاح ومشورے پھر حج کی طویل معیت اور آخر میں علالت اور دنیا سے رحلت کی طویل وپُر اثر کہانی، پھر ایک غمزدہ بھائی کی زبانی، جس کے دل پر اس حادثہ کی چوٹ لگے، ابھی زیادہ دن نہیں گزرے، بڑا مشکل کام ہے، تاریخ اور سیر وسوانح کے بلا مبالغہ ہزاروں صفحے سیاہ کرنے کے بعد بھی قلم کو اس کہانی کے لکھنے میں دشواری پیش آرہی ہے کہ شاید اس میں ''جگ بیتی'' سے زیادہ ''آپ بیتی'' کا حصہ ہو، اس کہانی کے سنانے سے بہت سے ایسے واقعات اور مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں، جن سے داغِ کہن تازہ ہوجاتے ہیں، آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتی ہیں، اور دل کو تھامے بغیر ان کی کہانی سنانا اور لکھنا ممکن نہیں۔

پچاس سال کی مدت بھی اس خیال سے کہی کہ یہ عقل وشعور کا زمانہ ہے، ورنہ بچپن کے ابتدائی سال بھی اگر اس میں شامل کرلیے جائیں تو یہ مدت اور بھی طویل ہوجاتی ہے، مجھ میں اور مرحومہ میں چھ سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔

ان کی ولادت ۱۲ ربجمادی الاولیٰ ۱۳۲۶ھ (۱۸ رجون ۱۹۰۸ء) بروز جمعرات ہوئی اور میری ولادت ۶ محرم ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) کو ہوئی، ۲۱-۱۹۲۰ء کے لگ بھگ کوئی زمانہ ہوگا، لکھنؤ امین آباد کے اس محلہ میں جس کو اس وقت بازار جھاؤلال کہتے تھے، اب اس کے سر پر ''محمد علی لین'' کا پتھر لگا ہوا ہے، والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کا بالکل لب سڑک مکان اور مطب تھا، اب بھی خدا کے فضل سے وہ مکان ہمیں لوگوں کے استعمال

میں ہے، اسی میں ہمارا چھوٹا سا گھرانا رہتا تھا، یہ ماں باپ اور چار بھائی بہنوں پر مشتمل تھا، دو بھائی اور دو بہنیں، بڑے بھائی جو بعد میں ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب بی، ایس، سی، ایم. بی. بی. ایس. ناظم ندوۃ العلماء کے نام سے نامور ہوئے، ان سے چھوٹی ایک بہن امۃ العزیز صاحبہ (والدہ عزیزان مولوی محمد ثانی، محمد رابع، محمد واضح سلمہم اللہ) اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے کہ وہی اب ہمارے چھوٹے سے خاندان کی برکت اور بزرگوں کی یادگار ہیں، ان سے چھوٹی امۃ اللہ تسنیم صاحبہ، جن کو خاندان میں عائشہ بی کی عرفیت اور نام سے سب جانتے اور پکارتے تھے، اور جو اب خدا کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئی ہیں، سب سے چھوٹا یہ راقم سطور تھا، جس کی عمر اس وقت چھ سال کی تھی، یوں تو گھر خدا کے فضل سے متعدد افراد خاندان، مستقل وعارضی مہمانوں سے ہمیشہ بھرا رہتا تھا، اور اس کی وجہ سے گھر میں رونق اور چہل پہل کی کمی نہ تھی، قرب مسافت اور اصل وطن ہونے کی وجہ سے رائے بریلی سے بھی اعزہ کی آمدورفت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا، لکھنؤ کے بعض دیندار شریف گھرانوں سے بھی بالخصوص نواب سید نورالحسن خاں صاحب مرحوم بھوپالی (فرزند اکبر والاجاہ امیر الملک نواب سید صدیق حسن خاں صاحب بہادر) کے گھر سے عزیزانہ وبرادرانہ مراسم تھے، اور آمدورفت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا، لیکن ایک باپ کی اولاد یہی چار بھائی بہن تھے۔

والد صاحب کا سارا وقت تصنیف وتالیف، مطب اور ندوۃ العلماء کی نظامت کے کاموں میں گزرتا تھا، وہ طبیعت کے بڑے یکسو، خاموش اور مشغول انسان تھے، الگ تھلگ ایک کمرے میں رہتے تھے، سراپا شفقت ومحبت ہونے کے باوجود ہم لوگ ان سے بے تکلف نہ تھے، جب خاندان کے کوئی بزرگ آجاتے تو اکثر ہم سب بھائی بہن جمع ہوجاتے اور ان کو ہنستا بولتا دیکھتے، بڑے بھائی صاحب لکھنؤ میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھے، اور میڈیسن کی تعلیم (خصوصاً اس زمانہ میں) ایسی محنت طلب تھی کہ ان کا سارا وقت مطالعہ وتیاری اور میڈکل کالج کی آمدورفت میں گزرتا تھا، یہ لکھنا بھول گیا کہ ہم چار بھائی

بہنوں کے علاوہ اس مختصر خاندان کی ایک فرد ہماری بھاوج اہلیہ ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب تھیں، جو اپنی نیک دلی، بے نفسی اور محبت کی وجہ سے گویا ہماری بہنوں ہی میں ایک اضافہ کرتی تھیں، میری بڑی بہن کی شادی ہو گئی تھی، وہ اکثر اپنی سسرال رائے بریلی اور بھاوج صاحبہ اپنے میکہ ہسوہ چلی جاتیں، اور کئی کئی مہینے بھی دونوں کا وہاں قیام رہتا، اس لیے زیادہ تر واسطہ اور یکجائی انھیں مرحومہ بہن سے تھی۔

ہمارا گھرانہ علماء و مصنفین کا گھرانہ ہے، والد صاحب اپنے زمانے کے عظیم مصنفوں میں تھے، خاندانی و موروثی اثرات بڑے طاقتور ہوتے ہیں، وہ نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں، اور بچوں اور بچیوں میں ان کے اثرات کم و بیش پائے جاتے ہیں، کچھ آبائی اثر، کچھ والد صاحب کا ذوق وانہماک، ہمارے سارے گھر پر یہ کتابی ذوق سایہ فگن تھا، کتب بینی کا یہ ذوق، ذوق سے بڑھ کر لت اور بیماری کی حد تک پہنچ گیا تھا، کوئی چھپی ہوئی چیز سامنے آجائے تو اس کو پڑھے بغیر چھوڑ نہیں سکتے تھے، ہم بھائی بہنوں کو جو تھوڑے سے پیسے دست خرچ کے لیے ملتے یا خاندان کے کوئی بزرگ جاتے ہوئے (اس زمانے کے خاندانی رواج کے مطابق) بچوں کو روپیہ دے جاتے، اس کا ایک ہی محبوب مصرف تھا کہ اس سے کوئی کتاب خرید لی جائے، اس سلسلے میں خود میری ایک دل چسپ کہانی سنتے چلئے کہ میرے پاس اس طرح کچھ پیسے آگئے، وہ ایک دو آنے سے زیادہ نہ تھے، میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کتب فروشوں ہی کے یہاں ملتی ہے، اور ہر چیز کی دکان الگ ہوتی ہے، میں امین آباد گیا، گھنٹہ گھر والے پارک کے سامنے بڑی دکانوں کی جو قطار ہے، اس میں کسی دوافروش کی دکان پہنچا، غالباً "سالومن کمپنی" تھی، میں نے پیسے بڑھائے کہ کتاب دی دیجئے، دکان پر کام کرنے والے صاحب نے سمجھا کہ کسی شریف گھرانے کا بھولا بھالا بچہ ہے، کیمسٹ کی دکان پر کتاب کیا ملتی، دواؤں کی فہرست اردو میں تھی، انھوں نے وہی بڑھا دی اور پیسے بھی واپس کر دیئے، میں پھولے نہیں سماتا تھا کہ کتاب بھی مل گئی اور پیسے بھی واپس آگئے، خوش خوش گھر پہنچا، اور اس سے اپنے چھوٹے

سے اس کتاب خانہ کو سجایا، جو والد صاحب کے یہاں کی ان کتابوں سے بنایا تھا، جو ان کے لیے بے کار تھیں، اور وہ ردی میں ڈال دیتے تھے، یہی شوق میری دونوں بہنوں کا تھا، کتاب بغیر ان کو چین نہیں آتا تھا، اس زمانے میں ایک کتاب فروش ہماری گلی میں آتے تھے، اور صدا لگاتے تھے، ہرنی نامہ، نور نامہ، حلیمہ دائی کی کہانی، معجزہ آل نبیؐ، میلاد نامہ وغیرہ وغیرہ، ان کی صورت ابھی تک آنکھوں میں ہے، وہ ان کتابوں کے اشعار گا گا کر بھی پڑھتے تھے، ادھر ان کی آواز کانوں میں آئی، ادھر ان دونوں بہنوں کی طرف سے حکم ملا کہ فلاں کتاب لے آؤ، دوڑا دوڑا گیا اور کتاب خرید لایا، ہمارا گھرانہ عقائد و مسلک میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا سختی سے پیرو تھا، اور ان کے اثرات ایسے رچ بس گئے تھے کہ بے اصل اور غیر مستند چیزیں جن سے عقائد میں خلل پڑتا ہو، گھر میں بار نہیں پاتی تھیں، مردوں سے زیادہ عورتیں عقیدہ کے بارے میں سخت تھیں، اس لیے معجزہ آل نبیؐ وغیرہ جیسی کتابوں کا تو یہاں گزر نہ تھا، البتہ سیرت، بزرگوں کی حکایات، اور بے ضرر دلچسپ کتابیں خواہ نظم میں ہوں یا نثر میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں، ان کتابوں کی قیمت ہی کیا تھی، کسی کے دو پیسے، کسی کے چار پیسے، بہت قیمت ہوئی تو دو آنہ، چار آنہ، دونوں بہنوں میں سے کسی نے ترنم کے ساتھ مزے لے لے کر پڑھنا شروع کیا، اور جب تک کتاب ختم نہ کر لی ان کو چین نہ آیا، اسی زمانے کا سنا ہوا حضرت حلیمہ دائی کا قصہ آج تک دل پر نقش ہے، اس کے ابتدائی چار شعر یہ ہیں ؎

ایک عاشق تھی حلیمہ دائی — جس نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی
وہ کچھ اس رمز سے آگاہ نہ تھی — اس کی قسمت میں یہ دولت تھی لکھی
نور اللہ کو لائی گھر میں — یعنی اس شاہ کو لائی گھر میں
واہ کیا طالع بیدار ملے — جس کو کونین کے سردار ملے

اس سیدھی سادی نظم نے جس کے کہنے والے کا نام بھی معروف نہیں اس پاک محبت کے دل کی نرم سرزمین میں ابتدائی بیج ڈالے، پھر جب سیرۃ ابن ہشام میں یہ عزیز

ولذیذ حکایت جس میں راوی نے اپنے معمول سے زیادہ درازنفسی سے کام لیا ہے۔

لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم

پڑھی تو وہ معصوم زمانہ جس پر اللہ کی ہزار رحمتیں ہوں یاد آگیا۔

بات میں بات یاد آتی ہے، جب ۱۹۴۹ء میں رسالہ "الندوہ" استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے حکم سے تیسری مرتبہ جاری کیا گیا اور میں اور مولانا عبد السلام صاحب قدوائی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، تو مجھے یہ بات سوجھی کہ مشہور اہل علم اور اہل قلم سے فرمائش کروں کہ اپنی محسن کتابوں کا تذکرہ کریں، اور ان کی سیرت کی تشکیل وتعمیر میں ان کا جو حصہ ہے ان کو مضمون کی شکل میں "الندوہ" کے لیے قلم بند فرمائیں، بہت سے مشاہیر اہل علم نے اس موضوع پر خامہ فرسائی فرمائی، اور اپنا مضمون بھیج کر "الندوہ" اور اس کے نوعمر ایڈیٹروں کی عزت بڑھائی، ان میں صدر محفل نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور شریک بزم مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا عبد الباری ندوی مرحوم، مولانا عبد العزیز میمن جیسے فاضل یگانہ، اور جدید طبقہ میں سے خواجہ غلام السیدین، میاں بشیر احمد بی، اے (آکسن) ایڈیٹر "ہمایوں" لاہور جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اہل قلم تھے، اس انجمن میں بعض ایسے علم وفضل نے بھی ازراہ شرکت فرمائی تھی، جن کے مضامین عام طور سے رسائل ومجلّات میں شائع نہیں ہوتے تھے۔ مثلاً مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم، مولانا اعزاز علی صاحب استاد دار العلوم دیوبند، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب استاد حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مشاہیر کے نام جب خطوط روانہ کئے گئے تو ایک خط ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم (سابق صدر جمہوریہ ہند) کی خدمت میں بھی بھیج دیا گیا، جو اس وقت شیخ الجامعہ تھے، اور ہم دونوں پر بڑی عنایت فرماتے تھے، غالباً مصروفیت کی وجہ سے وہ اس فرمائش کی تعمیل نہ کر سکے، ایک مرتبہ وہ مجھے کسی سفر میں ملے، میں نے کہا ڈاکٹر صاحب! آپ نے محسن کتابوں پر کچھ نہ لکھا؟ انھوں نے اپنے خاص کریمانہ انداز میں معذرت کی اور کہا بھائی، میں کیا لکھوں، میری سب سے بڑی محسن

''حلیمہ دائی کی کہانی'' ہے، جو میں نے بچپن میں سنی اور پڑھی تھی، واقعہ بھی یہ ہے کہ مطالعہ کی کتابوں کی قطار میں اور کتابوں کے انبار میں سب سے بڑی محسن کتاب وہی ہے جو سب سے بڑے محسن سے کسی قسم کا ربط قلبی اور غلامی کی نسبت قائم کردے۔

یہیں پر یہ بھی سناتا چلوں کہ اسی زمانے میں جب ''الندوہ'' میں میری محسن کتابیں کے عنوان سے یہ سلسلۂ مضامین شائع ہورہا تھا، میرے کہنے سے یا اپنے شوق سے ہمشیرہ مرحومہ نے بھی اسی موضوع پر مضمون لکھا، جس کا ''میری بے زبان استانیاں'' سا بولتا ہوا عنوان تھا، ان کا مضمون جالندھر کے سنجیدہ زنانہ رسالہ ''مسلمہ'' میں چھپا۔

کتابوں کی خریداری میں صرف اسی کتاب فروش ہی کے ذخیرہ پر بس نہ تھی، جس کی گٹھری وہ اپنے بغل میں داب کر لاتے تھے، بلکہ مجھے وقتاً فوقتاً حکم ملتا رہتا تھا، میں ''صدیق بک ڈپو'' سے جو ہمارے قریب سب سے بڑی کتابوں کی دکان تھی، ان کی انتخاب کی ہوئی کتابیں خرید لاؤں، یہ سب کتابیں جو کبھی نظم میں ہوتیں اور کبھی نثر میں مشترک طور پر پڑھی جاتیں، اسی زمانہ میں سیرت پاک پر اردو کے چھوٹے بڑے رسالہ پڑھے گئے اور دل ودماغ میں پیوست ہوگئے، ان کے نام تو اب یاد نہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ ان کے پڑھنے سے اس زمانے کے رواج کے مطابق مجھے میلاد یا سیرت کا جلسہ کرنے کا شوق ہوا، اپنے ہم سن بچوں کو مدعو کیا، اور ان کو دعوت دینے خود گھر گھر گیا، انھیں بہنوں میں سے کسی نے میرے سر پر چھوٹی سی پگڑی باندھی، عمر یہی آٹھ نو برس کی رہی ہوگی، انھیں کتابوں میں سے میں نے کوئی کتاب لے کر پڑھنی شروع کی ''قابلیت'' کا یہ حال تھا کہ حضور کے دادا سردار قریش ''عبدالمُطَّلِب کو'' ''عبدالمَطْلَب'' پڑھ رہا تھا، والد مرحوم خاموشی سے آکر ایک طرف اوٹ میں کھڑے ہوگئے تھے، ان کا دل یہ منظر دیکھ کر کتنا باغ باغ ہورہا ہوگا کہ اللہ نے عشق نبوی کا ان کو حصۂ وافر عطا فرمایا تھا اور اسی سے ان کی ریروں میں آب ورنگ ہے، ان کے لیے کیا کم خوشی کی بات تھی کہ ان کا کمسن بچہ اس ذکر میں مصروف ہے، جو ہر خیر وبرکت کا سرچشمہ ہے، اور اس طرح وہ خود اپنا طالع بلند اور

اپنا بخت بیدار کر رہا ہے ۔

حکایت از قدِ آں یارِ دل نواز کنیم   بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنیم

نعتوں میں سب سے زیادہ امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی نعتیں، ان بہنوں کی زبان پر جاری تھیں، خاص طور سے حضرت محسن کی مشہور نظم ۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

بہت پڑھی جاتی تھی، کتابوں میں مسدس حالی گویا وِردِ زباں تھی، اور اس کا بڑا حصہ ان دونوں بہنوں کو تقریباً حفظ تھا، اس زمانے میں شرفا اور پڑھے لکھے لوگوں کا کوئی گھر بھی اس کتاب کے مطالعے اور نغمہ خوانی سے خالی نہ تھا۔

اسی زمانے میں ایک کتاب جو شاید میں نے اردو نصاب کی ایک کڑی کے طور پر پڑھی ہوگی، وہ ہمارے ہاتھ آئی اور وہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی کتاب ''سفینۂ اردو'' تھی، اس چھوٹی عمر میں اس کتاب کے منتخب مضامین اور نظموں نے جو اردو کے بہترین انشاء پردازوں اور شاعروں کے قلم سے تھے، ہمارے دل و دماغ پر بڑا اثر ڈالا، خاص طور پر مولانا ظفر علی خان کی نظم ''راجہ دسرتھ کی کہانی ان کی زبانی'' جس میں انھوں نے بڑے پر اثر انداز میں راجہ دسرتھ کے ہاتھ سے ایک رشی کے لڑکے (جو اپنے بوڑھے باپ کے پانی لینے صبح تڑکے دریا پر گیا تھا، اور ان کے تیر سے گھائل ہو گیا تھا) کی دلدوز کہانی سنائی ہے، اس میں ان کی شاعری کا جوہر اور پُر اثر مناظر و جذبات کی تصویر کشی کا کمال اپنے پورے عروج پر ہے، ہم دونوں بھائی بہنوں نے مزے لے لے کر یہ کہانی بار بار پڑھی اور عجب نہیں کہ اس کے بعض بعض حصوں پر ہمارا دل امنڈ آتا، اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہوں، اس نظم کا مطلع تھا ۔

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی
تھی زمیں پہنے ہوئے وردی ہری بانات کی

اس کے بعد ان کے دوسری نظم کا نمبر تھا، اور وہ موسیٰ ندی کے طوفان والی نظم تھی جس کا مطلع تھا ۔

اے نامراد ندّی تجھ پر غضب خدا کا
الٹا ہے تو نے تختہ یارانِ آشنا کا

ہم لوگ خود کئی بار دریائے سئی کے کنارے بسنے کی وجہ سے جس میں زبردست سیلاب آتے ہیں، اس تجربے سے گزر چکے ہیں، اس لیے اس مصیبت کا اندازہ کر سکتے تھے، جو موسیٰ ندی کے سیلاب کی زد میں آنے والوں پر گزری ہوگی، اس مجموعہ کے مضامین نظم ونثر کے بار بار پڑھنے سے ہم لوگوں کے اندر اچھی عبارت اور اچھے شعر کا لطف لینے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔

ہمارے گھر خدا کے فضل سے مہمانوں کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا، ان کی کوئی تعداد اور وقت مقرر نہ تھا، اس زمانے میں شرفا کا دستور تھا کہ اگر کسی خاندان کا کوئی گھر کسی شہر میں ہو تو اس خاندان کے افراد خواہ دور کے عزیز ہوں یا قریب کے، کسی ضرورت سے بھی ان کا شہر میں آنا ہو تو وہ اسی گھر کے مہمان ہوں گے، ان مہمانوں کے لیے کھانا تیار کرنا اکیلی ماما کے بس کا کام نہ تھا، جو کھانا پکانے کے لیے ملازم تھی، اس کا بوجھ سب سے زیادہ میری انھیں چھوٹی بہن پر پڑتا تھا، والدہ صاحبہ نے جن کو کھانا پکانے، سینے پرونے اور کشیدہ کاری میں بڑی مہارت تھی، اور اس میں نئی نئی ایجادیں اور اختراعیں کرتی رہتی تھیں، بہن کو ان کاموں کے لیے خوب تیار کر دیا تھا، اور اکثر ان کی جفا کشی اور وقت و بے وقت محنت پر بھائی صاحب کو ترس آجاتا اور کبھی کبھی ہمت افزائی کے لیے وہ ان کے پاس بیٹھ جاتے، اور ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتے۔

ہم لوگوں کے گھروں میں لڑکیوں کی تعلیم گھروں ہی میں ہوتی تھی، ہمشیرہ نے اس وقت تک ساری تعلیم والدہ صاحبہ اور اپنے چچا مولوی سید عزیز الرحمٰن صاحب ندوی سے پائی تھی، جو قرآن شریف، اردو اور کسی قدر فارسی سے آگے نہ تھی۔

۲؍فروری ۱۹۲۳ء کو وہ حادثہ پیش آیا جو ہمارے چھوٹے سے گھرانے کے لیے قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا، والد صاحب مرحوم کے اچانک انتقال کا واقعہ پیش آیا جس کو میں

تفصیل سے ''حیات عبدالحیؒ'' میں لکھ چکا ہوں، اس سے ہمارے گھر کی بساط الٹ گئی اور گویا دنیا ہی بدل گئی، لکھنؤ چھوڑ کر، جہاں اب رہنے کا کوئی مطلب نہ تھا، ہمارا سارا گھر اپنے وطن رائے بریلی منتقل ہو گیا، جہاں گھر، خاندان، سب موجود تھا، عین انتقال کے وقت صرف میں اور میری یہ دو بہنیں موجود تھیں، بھائی صاحب لکھنؤ سے ایک ہزار میل دور مدراس و حیدرآباد میں تھے، یہ سب کچھ ایسا آناً فاناً ہوا جیسے کوئی خواب دیکھا ہو، اب رائے بریلی میں ہم دونوں کے دو ہی بڑے مشغلے تھے، والدہ صاحبہ کو ایسے مضامین اور کتابیں پڑھ کر سنانا جن سے ان کے دل کو تسکین وقوت حاصل ہو، اور غم غلط ہو، دوسرے خود لکھنے پڑھنے میں مشغول ہونا، اس زمانہ میں ہمارے خاندان میں دہلی کا رسالہ ''الواعظ'' آتا تھا جو کوئی مولوی اسحاق دہلوی نکالتے تھے، اس سے بڑی مدد ملی، کتابوں میں سب سے زیادہ مقبول ومحبوب کتاب ''صمصام الاسلام'' تھی، یہ واقدی کی عربی کتاب فتوح الشام کا منظوم ترجمہ ہے جس میں تقریباً پچیس ہزار شعر ہیں، گویا یہ اس وقت کا سب سے مشہور ومقبول ''شاہنامہ اسلام'' تھا، یہ کتاب اسی خاندان کے ایک بزرگ راقم سطور کے والد کے پھوپھا منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی ٹونکی کی نظم کی ہوئی ہے، جو بڑے قادر الکلام شاعر بھی تھے، اور جذبۂ جہاد اور جوش اسلامی ان کو اپنے جد امجد سید احمد شہیدؒ سے ورثہ میں ملا تھا، کتاب کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ معرکہ جہاد برپا ہے، تلواریں چمک رہی ہیں، مجاہدین، ہتھیلی پر سر رکھے ہوئے لڑ رہے ہیں، اور راہِ خدا میں جان دے اور لے رہے ہیں، کتاب کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے والے کی آواز گلوگیر اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، اور سننے والوں کو سر و پا کا ہوش نہیں رہتا، ہمارے خاندان میں مدت سے یہ دستور چلا آرہا ہے، کہ کسی حادثہ یا تقریب کے موقع پر گھروں میں کوئی خاتون جو اس کتاب کو روانی سے پڑھ سکتیں پڑھتیں، اور خاندان کی سب بی بیبیاں اور بچیاں سنتیں، ہمارے خاندان میں اس کے پڑھنے میں دو کو خاص امتیاز حاصل تھا، بڑی بوڑھیوں میں میری حقیقی خالہ صالحہ بی بی کو جو قرآن کی جید حافظہ بھی تھیں، اور ان مرحومہ بہن کو، آخر آخر تک یہ کتاب ہمشیرہ کو بہت عزیز رہی، اور اس

سے انھوں نے اپنے مضامین اور شعر گوئی میں فائدہ اٹھایا۔

اسی زمانہ میں انھوں نے کہیں مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور کتاب ''سیرۃ عائشہؓ'' کا اشتہار دیکھا، اب یاد نہیں کہ بھائی صاحب مرحوم نے اس کتاب کا تذکرہ کیا یا اس کے اشتہار پر نظر پڑی، بہر حال ہمشیرہ نے اس کو حاصل کیا اور حرز جان بنالیا، اس سے مناسبت کی کئی کھلی وجہیں تھیں، ایک تو ہمنامی کا شرف وافتخار، دوسرے حضرت صدیقہ کا علمی کمال وامتیاز جس کی ان کے دل میں شروع سے قدر ومنزلت تھی، بہر حال اس کتاب کو انھوں نے پڑھا ہی نہیں، بلکہ اس کے مضامین کو اپنے اندر اتار لیا، اور جذب کرلیا، اور وہ ان کی بڑی رہنما کتاب ثابت ہوئی، اسی زمانے میں (اور عجیب نہیں اسی کتاب کا فیض ہو۔) انھوں نے عربی پڑھنا شروع کی، میری عربی زبان کی تعلیم کا بھی یہ دور طفولیت تھا، مگر میں گھر کے باہر نامور اور باکمال اساتذہ سے پڑھتا تھا، جن میں امام فن شیخ خلیل عرب یمنی بھوپالی کا پایہ سب سے بلند تھا، اس لیے میں ان کی تھوڑی بہت مدد کرنے کے قابل ہوگیا تھا، سب سے بڑی مدد ان کو اپنے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب حسنی سے ملی تھی، جو گرمیوں کی چھٹیوں میں لاہور سے وطن آتے تھے، ان کو علم کو گھول کر پلا دینے کا ملکہ تھا، صرف ونحو کے ضروری مسائل کی مشق کرانے میں ید طولیٰ حاصل تھا، اور ان کے اس میں عجیب عجیب چٹکلے تھے، ان کو تاریخ اور شعر وشاعری کا بھی بڑا اچھا ذوق تھا، ہمشیرہ کی طبیعت ہمیشہ سے موزوں واقع ہوئی تھی، اور موزونیت طبع کا یہ ورثہ ہم بھائی بہنوں میں صرف انھیں کو ملا تھا، گل رعنا گھر کی چیز تھی، اس کو انھوں نے اتنی بار پڑھا تھا کہ گویا اس کی حافظہ تھیں، خاندان میں بیت بازی کا رواج پرانا ہے، اس میں اگر بے اعتدالی نہ ہو تو فائدے بھی بہت ہیں، اس میں ان سے مشکل سے کوئی بازی لے جاتا، اشعار کا انتخاب بہت صاف ستھرا تھا، آگے چل کر انھوں نے خاص اس موضوع پر کتاب بھی لکھی جو اساتذہ کے منتخب اور پاکیزہ اشعار کا بڑا اچھا مجموعہ بن گیا، ان کو کتابیں جمع کرنے کا شوق بہت تھا، گھر میں، جو پرانی وضع کا بنا ہوا تھا، انھوں نے

اس کے لیے الگ ایک جگہ مقرر کر لی تھی، جہاں وہ اپنا کتابی ذخیرہ رکھتی تھیں۔

مطالعہ وتحریر کے اس شوق سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ دست کاری اور کشیدہ کاری، سینے، پکانے کے ان کاموں سے ناواقف تھیں، یا ان کو ان کاموں سے وحشت تھی، جو بچیوں اور خواتین کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں، وہ ان چیزوں میں بھی بڑی مشاق اور مستعد تھیں، اور اپنی ہم عمروں میں کسی سے کم نہ تھیں۔

۲۵ر نومبر ۱۹۲۶ء کو ان کی شادی اپنے حقیقی ماموں زاد بھائی مولانا سید ابوالخیر صاحب حسنی سے ہوئی، یہ نسبت تو بہت قدیم تھی، لیکن مختلف حوادث کی وجہ سے اس میں تاخیر ہوتی چلی گئی، پھر اس وقت تک ان کی عمر بھی زیادہ نہیں ہوئی تھی، مرحوم اردو عربی دونوں زبان کے ادیب تھے، جہاں تک اردو کا تعلق ہے صحت زبان، تحقیق، اہل لکھنؤ کے محاورات اور طرز گفتگو سے تھوڑے ہی لوگ اتنے واقف ہوں گے جتنے وہ واقف تھے، وہ اردو میں آبدار شعر بھی کہتے تھے، اور ان کو رائے بریلی کے ایک بڑے نمائش کے مشاعرہ میں سونے کا تمغہ بھی ملا تھا، شاعری میں وہ شمس لکھنوی اور مرزا ثاقب قزلباش کے شاگرد تھے، لیکن ادب وشاعری میں اپنی مخصوص رائے اور نقطۂ نظر رکھتے تھے، اساتذہ اردو میں وہ سب سے زیادہ حکیم مومن خاں مومن کے قائل اور معتقد تھے، اور ان پر انھوں نے کتاب بھی لکھی تھی، عربی لغت پر بھی ان کو بڑا عبور تھا، لیکن ان کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ ان کو سیکڑوں اور ممکن ہے کہ کئی ہزار احادیث صحیحہ متن وسند کے ساتھ یاد تھیں، ایسا سنا جاتا تھا کہ ''موطا'' ان کو پوری حفظ تھی، صحاح ستہ میں صحیح مسلم سے ان کو زیادہ شغف تھا، حدیث مع متن وسند ایسے دلکش انداز میں پڑھتے تھے کہ دل کھینچ لیتے۔ افسوس ہے کہ مخصوص انداز طبیعت اور حوادث کی وجہ سے ان کے کمالات پر پردہ ہی پڑا رہا بلکہ ان کی پوری زندگی حوادث وآلام کا شکار رہی، ہمشیرہ مرحومہ کی زندگی کے بہترین دن وہ چند ابتدائی سال تھے، جو انھوں نے اپنے والد کے برابر شفیق ماموں اور خسر مولوی حافظ سید عبید اللہ صاحب مرحوم (فرزند حضرت سید شاہ ضیاء النبی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مئی ۱۹۳۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا) کے زیر سایہ بسر کیے، بھائی

سید ابوالخیر صاحب مرحوم نے ۲؍رجون ۱۹۷۰ء میں انتقال کیا۔

بھائی مرحوم سے ان کی تین اولادیں ہوئیں، دو بچیاں اور ایک بچہ سالم، یہ سب شیر خوارگی ہی میں ان کو داغ مفارقت دے گئے، ایسا پڑھا لکھا جوڑا ہمارے خاندان میں مشکل سے ہوگا، لیکن ان کی قسمت میں ان معلوم و نامعلوم حکمتوں کی بنا پر جن کا علم خدائے علیم وخبیر، رحیم وکریم کو ہے، اور کسی کو نہیں، لطف ومسرت کے یہ دن ۱۹۴۳ء کو ختم ہوگئے، اور ان کو وہ داغ پیش آیا جو ہندوستان کی شریف خواتین کے لیے عام حالات میں ناقابل برداشت ہوتا ہے، لیکن انھوں نے اپنی قوتِ ایمانی اور کسی قدر علمی مشغلے اور ذوق کی مدد سے اس کو نہ صرف برداشت کیا بلکہ ان کی زندگی کا یہ موڑ ان کی ہزاروں ترقیوں اور سعادتوں کا ذریعہ بن گیا اور ع

طے شود ایں جادہ بآہے گاہے

کا ظہور ہوا، ان کی تنہائی کی یہ بقیہ زندگی جو تیس پینتیس برس کا عرصہ ہے اپنے بھائیوں کے پاس گزری، اور اسی گھر کے دروازہ سے وہ آخری بار رخصت ہوکر اپنی والدہ محترمہ کے پہلو میں ہمیشہ کے لیے آسودۂ خاک ہوگئیں۔

یہ وہ زمانہ ہے، جب ان کا وقت لکھنے پڑھنے اور خدا کے سامنے ہاتھ پھیلانے اپنا دردِ دل کہنے، دعا ومناجات، ذکر واذکار، تلاوت قرآن اور تحریر وتصنیف کے سوا اور کسی چیز میں نہیں گزرتا تھا۔

آزمائش سخت تھی، اور ان کا دل کمزور، دردمند اور حد درجہ حساس تھا، اس کا امکان تھا کہ ان کے دل ودماغ پر ایسا اثر پڑ جائے کہ اس کا تحمل نہ کرسکیں، اس موقع پر بھائی صاحب مرحوم نے (جو شفیق بھائی بھی تھے، اور حاذق طبیب بھی) ان کے علاج کے لیے ایک نسخہ تجویز کیا، جو طب نبوی سے ماخوذ تھا، انھوں نے ان کے ذہن کو مشغول اور قلب کو مطمئن کرنے کے لیے مشورہ دیا کہ وہ مشہور محدث امام نووی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۶۷۶ھ) کی مشہور اور سراپا برکت کتاب ''ریاض الصالحین'' کو اردو میں منتقل کردیں، یہ کتاب بھائی

صاحب مرحوم کو بہت عزیز تھی، اور انھیں کی تحریک سے وہ پہلی مرتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں شامل کی گئی اور اب وہ بلاد عربیہ کے دینی ودعوتی حلقوں کی مقبول ترین کتاب ہے، اس وقت تک اس کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوا تھا، لیکن کام آسان نہ تھا، اصل کتاب متوسط سائز کے باریک مصری ٹائپ میں ساڑھے چار سو صفحات سے زیادہ میں آئی ہے، اس میں احادیث کی تعداد ایک ہزار نو سو تین (۱۹۰۳) ہے، اس میں صحاح کی وہ احادیث بھی ہیں، جن کی شرح میں بڑے بڑے مشکل مقامات آتے ہیں، اور چوٹی کے علماء نے اس کی تشریح میں درجنوں اور بیسیوں صفحات رنگین کئے ہیں، انھوں نے حدیث باقاعدہ حدیث کے (کسی مدرسہ اور دارالعلوم کا کیا ذکر) کسی استاد سے بھی نہیں پڑھی تھی، اور خانگی تعلیم ومطالعہ اور مدرسہ کی باقاعدہ تعلیم میں بڑا فرق ہوتا ہے، لیکن اللہ نے ان کو ہمت دی اور انھوں نے ''زادِ سفر'' کے نام سے اس کا ترجمہ ذیلی عنوانات اور تشریحی نوٹس کے ساتھ مکمل کرلیا، یہ ترجمہ جس کا چوتھا ایڈیشن پیش نظر ہے دو حصوں اور آٹھ سو بہتر صفحات میں آیا ہے، اس وقت غور کرتا ہوں تو یہ بات ایک کرامت سی معلوم ہوتی ہے، معلوم نہیں یہ مخلص بھائی کی کرامت تھی یا دردمند اور مجروح وشکستہ قلب کی جس کے متعلق ارشاد باری ہے ''انا عند المنکسرۃ قلوبھم'' (میں شکستہ دلوں کے پاس ہوتا ہوں) بہرحال اب جب حدیث کی اس ضخیم کتاب پر نظر ڈالتا ہوں جس نے انشاء اللہ ان کے اس سفر روحانی میں ''سفینۂ نورانی'' کا کام دیا ہوگا، تو جلیل مانک پوری کا یہ مصرعہ بے اختیار یاد آجاتا ہے ؎

مل گیا زادِ سفر مجھ کو سفر سے پہلے

مولانا شاہ حلیم عطا صاحب نے اس مسودے پر نظر ثانی کی اور مفید مشورے دیئے اور ان کی خوش قسمتی تھی کہ فاضل یگانہ اور محقق زمانہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے از راہ شفقت وعنایت (۱۵ رشعبان ۱۳۶۵ھ کو) اس پر مقدمہ لکھا، انھوں نے اپنے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے:۔

''ہم کو اس اظہار میں بڑی خوشی ہے کہ امام نوویؒ کی اس کتاب ''ریاض الصالحین'' کا ترجمہ اسی گھرانے نے کیا ہے، جس نے سنت نبوی

کی اشاعت اور بدعت کے ازالہ کا کام ایک صدی پہلے سے شروع کر رکھا ہے، اور جن کے انوار و برکات ملک میں ہر جگہ نمایاں ہیں "اللھم زد فزد ولا تنقص"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

''مترجمہ موصوفہ نے ترجمہ میں زبان کی سلاست اور روانی کا لحاظ رکھا ہے، جگہ جگہ حاشیے بڑھائے ہیں، ہر حدیث کا عنوان قائم کیا ہے، جن سے حدیث کے مغز سخن تک پہنچنے میں ناظرین کتاب کو بڑی آسانی ہو جاتی ہے''۔

زاد سفر کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۵ء کے وسط میں نکلا، کتاب کی غیر معمولی مقبولیت کا ایک اظہار تو بہت سے ان تعزیتی خطوط سے ہوتا ہے، جو ان کی وفات پر موصول ہوئے ہیں، اور جن کے لکھنے والوں نے اس کتاب سے اپنے گہرے تاثرات اور استفادہ کا ذکر کیا ہے، دوسرے یہ کہ شاید وہ پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جن کی تصنیف جدہ کے سعودی ریڈیو اسٹیشن سے بالاقساط اردو کے پروگراموں میں نشر ہوئی اور رابطہ عالم اسلامی نے اس کے کئی سو نسخے خرید کر اردو بولنے اور سمجھنے والے ملکوں میں بھیجے، اس لیے ذوق کا یہ مصرعہ بالکل ان کے حسب حال ہے ؎

تری آواز مکے اور مدینے

اس کتاب کے پہلے حصہ کا ہندی اڈیشن بھی شائع ہو گیا ہے، یہ اڈیشن لکھنؤ کے ایک ہندو فاضل جناب نند کمار اوستھی نے خود شائع کیا ہے، جن کا ہندی میں ترجمۂ قرآن عرصہ میں ہوا چھپ کر پھیل گیا ہے، ان کو یہ کتاب ایسی پسند آئی کہ انھوں نے مجھ سے اسے ہندی میں شائع کرنے کی اجازت مانگی، میں نے کہا کہ حدیث کی اچھی اچھی کتابیں اردو میں ہیں، آپ ان میں سے کسی بڑی کتاب کا ترجمہ کیجیے، انھوں نے کہا کہ میں اسی کتاب کو مفید سمجھتا ہوں، اور اسی کو ہندی میں شائع کرنا چاہتا ہوں، ان کی اس خواہش اور تقاضے پر

اس کی اجازت دی گئی اور ہندی ایڈیشن شائع ہو گیا۔

اس کتاب کی کھلی ہوئی برکت یہ ظاہر ہوئی کہ اس کے مکمل کرنے کے بعد ہی اللہ نے ان کو سفر حج کی سعادت نصیب فرمائی، اور اس بارگاہ قدس پہنچایا جس کے کلام و پیام کی انھوں نے اپنی بساط بھر خدمت کی تھی، اس سفر کی کہانی بھی عجیب، موثر اور سبق آموز ہے۔

<u>۱۹۴۷ء</u> کے اپریل کا مہینہ ہوگا کہ مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ امیر جماعت تبلیغ نے مجھے حجاز کے لیے رخت سفر باندھنے کا حکم دیا، اور طے کیا کہ میں وہاں کچھ مدت قیام کر کے اس دعوتی کام کو آگے بڑھانے اور علمی حلقوں میں متعارف کرانے کی کوشش کروں، جس کا آغاز چند ہی سال پہلے کیا گیا تھا، انھوں نے نہ صرف یہ کہ حکم دیا بلکہ سامانِ سفر بھی کر دیا، ہمارے مخدوم اور سراپا شفقت بزرگ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے (اللہ تعالیٰ ان کی عمر و فیوض میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائیں) جن کی خصوصی نظر شفقت شروع ہی سے مجھ نااہل پر رہی ہے، حکم دیا کہ میں والدہ محترمہ، اپنی اہلیہ اور خواہرزادہ عزیز مولوی محمد ثانی کو بھی ساتھ لے لوں تاکہ دلجمعی کے ساتھ وہاں دعوت کے کام میں مشغول رہ سکوں، وہ گھڑی کبھی نہ بھولے گی جب ہمشیرہ مرحومہ جو اس سفر کی باتیں کئی دنوں سے سن رہی تھیں، اچانک میرے کمرہ میں داخل ہوئیں، اور بے قراری کے ساتھ روئیں اور کہا کہ علی! کیا تم ہم کو یہیں چھوڑ جاؤ گے، مجھے خود گریہ کو ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا، ان کی زندگی کے سارے واقعات میرے سامنے تھے، میں نے کہا نہیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے بغیر نہیں جاؤں گا، آپ اطمینان رکھیں، آپ جائیں گی تو ہم بھی جائیں گے، ورنہ کوئی نہیں جائے گا، وہ سن کر خاموش چلی گئیں۔

میں نے کہنے کو یہ کہہ دیا لیکن مشکل تھی کہ اس وقت جب کہ جنگ ختم ہوئے اور حجاز کا راستہ کھلے ہوئے ایک ہی سال ہوا تھا، سفر کے لیے مسافروں کا کوٹہ مقرر تھا، درخواست دینی پڑتی تھی، پھر پرمٹ آتا تھا، اور وہی لوگ جا سکتے تھے، جن کا محکمۂ حج کی طرف سے پرمٹ آ گیا ہو، ہم تین کے پرمٹ آچکے تھے، لیکن عزیزی محمد ثانی اور ہمشیرہ

کے لیے اس وقت تک کوئی درخواست نہیں دی گئی تھی، اور قوی اندیشہ تھا کہ وقت نکل جانے کی وجہ سے ان کے لیے انکار ہو جائے، میں تن بہ تقدیر دہلی گیا، اس وقت لال شاہ گورنمنٹ آف انڈیا میں حج آفیسر تھے، میں ان سے ملا، انھوں نے کہا کوٹے میں اب کوئی گنجائش نہیں، میں مایوس آ رہا تھا کہ انھوں نے پھر مجھے آواز دی اور کہا، مولانا! گنجائش تو نہیں ہے، مگر ایک بات نجی طور سے کہتا ہوں کہ اگر آپ بندرگاہ پر پہنچ گئے تو گنجائش نکل آئے گی، جان میں جان آئی، میں نے لکھنؤ آ کر بہن کو یہ مژدہ سنایا کہ اب آپ کی دعا کی ضرورت ہے، کراچی تک ہم سب ساتھ چلیں گے، آگے آپ کی دعا اور اللہ کی رحمت۔

وہ اس مشکوک صورت حال میں بھی چلنے کے لیے تیار ہو گئیں، ان کی گویا اسی دن عید ہو گئی، برسوں کے بعد ان کو خوشی کی ایک ساعت نصیب ہوئی تھی، وہ خوش خوش رائے بریلی اپنی بہنوں سے ملنے اور سب سے رخصت ہونے گئیں، بالآخر اس مبارک سفر کی گھڑی آ گئی، جس کی داستان بڑی تفصیل سے میں نے اپنے مضمون "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" میں لکھی ہے، جو رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی مقبول کتاب "آپ حج کیسے کریں؟" میں شروع سے شامل ہے، اور جس کو پڑھ کر بہت سے بندگانِ خدا اپنے گہرے تاثرات کا اظہار کر چکے ہیں، جی چاہے تو پوری داستان وہیں پڑھ لیجیے، میں یہاں صرف انھیں واقعات کا ذکر کروں گا جن کا تعلق ہمشیرہ مرحومہ سے ہے۔

۲۶ رجون ۱۹۴۷ء (شعبان ۱۳۶۶ھ) کو یہ چھوٹا سا قافلہ جو ایک ہی گھر کے پانچ افراد پر مشتمل تھا، پنجاب میل سے روانہ ہوا، سارا راستہ امید و بیم کی حالت میں گزرا، راستہ میں ہمشیرہ جو زنانہ ڈبہ میں تھیں والدہ مرحومہ کی پُر اثر مناجاتیں پڑھ کر سناتیں جس میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکر ادا کیا گیا تھا، لاہور کے راستہ ہم لوگ کراچی پہنچے، بمبئی ہم سے قریب تھا، لیکن وہاں اس وقت تک کسی سے تعارف نہیں تھا، کراچی کا انتخاب حاجی عبدالجبار صاحب کی وجہ سے کیا گیا جو دہلی کی پنجابی برادری سے تعلق رکھتے تھے، کراچی کے مشہور و معروف تاجر اور تبلیغی جماعت کے وہاں داعی اول اور سرگرم کارکن تھے، ان سے

نظام الدین میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی زندگی اور سایۂ عاطفت میں تعارف ہوا تھا، کراچی ہم لوگوں کا پہنچنا اچانک ہوا، اب یاد نہیں کہ حاجی صاحب کو تار کیوں نہیں دیا گیا، رات تو ہم لوگوں نے جیسے تیسے حاجی کیمپ میں گزاری، پھر میں حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچا اور ڈرتے ڈرتے کہا کہ ہمارے ساتھ دو رفیق بغیر پرمٹ کے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے، سنتے ہی کہا، آپ کچھ فکر نہ کیجیے، سب کا انتظام ہو جائے گا، اسی وقت اپنے صاحبزادے کو حکم دیا کہ گاڑی لے کر جاؤ اور سب کو لے آؤ، اور بھائی صاحب (حاجی عبدالستار) کے یہاں ٹھہراؤ، اسی وقت شاداں وفرحاں یہ قافلہ حاجی عبدالستار صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گیا، ان کی کوٹھی کا بالائی حصہ جو کئی کمروں پر مشتمل تھا ہم لوگوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا، اللہ ان دونوں بھائیوں کے درجے بلند فرمائے، اور کروٹ کروٹ آرام پہنچائے کہ حاجی عبدالجبار صاحب نے دلجوئی ورفاقت اور حاجی عبدالستار صاحب اور ان کے اہل خانہ نے خاطر داری اور ضیافت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، ہم لوگوں کے ٹکٹ علوی جہاز سے تھے، جو چھوٹا بھی تھا، اور اس کی تاریخ بھی قریب تھی، ادھر ہمشیرہ مرحومہ نے مستورات کے بعض تبلیغی جلسوں میں اپنا کوئی دینی مضمون یا زادِ سفر کا کوئی حصہ پڑھ کر سنایا، ادھر میں بھی تبلیغی میدان میں اب سے زیادہ نمایاں تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حاجی عبدالجبار صاحب مرحوم نے یہ صائب مشورہ دیا (جس کی حکمت بعد میں معلوم ہوئی) کہ آپ علوی جہاز کے بجائے اسلامی جہاز سے سفر کریں، جو بڑا بھی ہے، اور آرام دہ بھی اور جس کی روانگی سے پہلے ہم کو ہفتہ عشرہ مزید استفادہ کا موقع مل جائے گا، ان کے اصرار اور محمد شفیع صاحب قریشی مرحوم کی تائید سے جو اس وقت کراچی میں مقیم تھے، اور تبلیغی جماعت کے صف اول کے کارکن تھے، ان کا مشورہ مان لیا گیا، جن لوگوں نے علوی جہاز سے سفر کیا، انھوں نے سخت تکلیف اٹھائی اور بڑی تاخیر سے پہنچے، اس کے علاوہ اسلامی جہاز میں سفر کرنے میں کئی حکمتیں تھیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

اسلامی جہاز میں فرسٹ کلاس کا جو کیبن ہم کو ملا اس سے ملے ہوئے دو کیبن میں

بمبئی کے ایک بڑے میمن تاجر حاجی احمد اوران کے خاندان کے لوگ تھے، وہاں بھی وہی پیش آیا جوکراچی میں پیش آیا تھا، جہاز میں تبلیغی اوردعوتی فضاتھی، مستورات کے الگ جلسے ہوتے تھے، وہاں کسی طرح جہاز کی مسافر خواتین کومعلوم ہوگیا کہ ہمشیرہ مصنف اوراہل قلم ہیں، اوردینیات سے واقف ہیں، بس کیا تھا ایک ہی دومضامین کے بعد یہ خواتین ان کی گرویدہ ہوگئیں، ان میں سب سے زیادہ گرویدگی اورتعلق حاجی احمد صاحب کے خاندان کوخصوصیت کے ساتھ ان کی خوش دامن صاحبہ کوہوا، وہ توبالکل ماں کا سا سلوک کرنے لگیں، ہمشیرہ کادل ہمیشہ سے کمزورتھا، اورصدموں نے اوربھی کمزورکردیا تھا، سمندرمیں طوفان تھا، اورجہاز میں غیرمعمولی حرکت اورآواز، ان کواختلاج ہونے لگا اوردہشت طاری ہوگئی، اس موقع پر یہ نیک دیندارخاتون فرشتۂ رحمت بن کر سامنے آئیں، وہ ان کو ہرطرح سے تسلی کرتیں، اپنے کیبن میں لے جاتیں، اورخاطرداری کرتیں، ان کی جدائی گوارہ نہ تھی، عقیدت وشفقت دونوں ان میں جمع تھی، یہ تعلق ایسا بابرکت اورپائدار ثابت ہوا کہ حج سے واپسی کے بعد اوران مرحومہ کی وفات تک جوکراچی میں پیش آئی، انھوں نے اپنے خطوط، تحائف کا سلسلہ بندنہیں کیا، ہمشیرہ مرحومہ اس خاندان کی شرافت ومحبت کوجب یادفرماتیں توان کے ہرانداز سے ممنونیت کا اظہارہوتا، اوران کا رُواں رُواں آخرتک ان کے لیے دعا کرتارہا، بندرگاہ پراترنے میں بھی انھوں نے بڑی مددکی اورحرمین شریفین میں بھی برابروہ آتے جاتے اپنے ساتھ لے جاتی تھیں، ہم لوگوں کی واپسی پربمبئی میں انھوں نے باصرار اس زنانہ قافلہ کواپنی کوٹھی پرٹھہرایا، ہمشیرہ ہی نہیں، بلکہ جن جن بچیوں سے ان کوخاص تعلق تھا، ان کے ساتھ بھی وہ اپنی محبت کا اظہارکرتی رہیں، بمبئی ہی میں محمد ثانی سلمہٗ کے یہاں پہلی ولادت کی اطلاع ملی، توانھوں نے اس بچی کے لیے جوماشاء اللہ اب خوددوبچوں کی ماں(۱) ہے، کپڑے اورکھلونے بھیجے، والدہ مرحومہ کی برکت یاہمشیرہ مرحومہ پراللہ کی رحمت کہ اس سفرمیں قدم قدم پراللہ کی مدداورعنایت کاکھلی آنکھوں مشاہدہ ہوتارہا۔

---

(۱) جن کانام اُمامہ حسنی ہے، اورجواب معاون مدیررضوان ہیں۔

داستان طویل ہے، ہم لوگ پہلے مدینہ طیبہ گئے کہ ابھی حج کا زمانہ دور تھا، اللہ نے تقریباً پورا رمضان وہاں کا نصیب فرمایا، مرحومہ نے اس قیام کی خوب خوب برکتیں لوٹیں، ذوق وشوق سے سلام پڑھتیں، مسجد شریف ہی کے قریب مدرسہ علوم شرعیہ کے ایک مکان میں ہم لوگوں کا قیام تھا، اس لیے پانچوں وقت نماز مسجد میں ہوتی، گنبد خضرا (علیٰ صاحبہ الف الف سلام) بالکل سامنے تھا، ایک رات خاص اُحد میں میدانِ کارزار کے قریب مولانا سید محمود مدنیؒ (برادر اصغر شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ) کے مکان میں گزاری، اسی زمانہ کے لکھے ہوئے سلاموں کا مجموعہ الگ شائع ہوا، اور بہت مقبول ہوا، اورخدا کے بعض نیک مخلص بندوں نے اپنے تعزیتی خطوط میں اطلاع دی ہے کہ انھوں نے بعض مرتبہ ان کا لکھا ہوا سلام مواجہہ شریف میں پڑھا۔

ذیقعدہ کے آخری عشرہ میں مکہ معظّمہ روانگی ہوئی، بیت اللہ شریف پر پہلی نظر پڑی تو مرحومہ کی عجیب حالت ہوئی، تقریباً ایک مہینہ رباط ٹونک میں قیام رہا جو حرم شریف سے قدرے دور محلّہ شامیہ میں ہے، لیکن نماز میں حاضری ہوتی رہی، اس میں عزیزی محمد ثانی کی ہمت اور خدمت کو بڑا دخل ہے، وہی ان مستورات کو لاتے اور لے جاتے، اس وقت حضرت شیخ کی دور بینی اور دور اندیشی کی تصدیق ہوئی۔

حج میں خاص طور سے میدان عرفات میں بڑی مشغولیت اور دعا ومناجات میں وقت گزرا، ان کا حال عرفات کی دعائے ماثور کے الفاظ کی تصویر تھا۔

"أنا البائس الفقير المستغيث المستجير الوجِل المشفق"

(میں دکھیارا محتاج، فریادی، پناہ چاہنے والا، لرزاں وترساں)

حج کے بعد یہ قافلہ مدرسہ فخریہ میں اٹھ آیا، جو باب ابراہیم پر گویا بیت اللہ کے حدود ہی میں تھا، ایسا کہ بعض اوقات مستورات امام حرم کے پیچھے ہی کمرے میں نماز پڑھ لیتیں، صفیں نیچے وہاں تک آجاتیں، اکثر حرم شریف میں جانا ہوتا۔

تقریباً تین مہینے......مکہ معظّمہ میں قیام رہا، اس میں چھوٹا بڑا سب عمرہ انھوں

نے کیا(۱) غالباً صفر کے آخر (جنوری ۱۹۴۸ء کی شروع تاریخوں میں) جب ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا، اور اس ملک کی آبادی خون کے دریا میں نہا کر نکلی تھی، ہم لوگوں کی بمبئی براہ کراچی واپسی ہوئی، اس لیے کہ ٹکٹ کراچی تک کے تھے، اس سفر کا ذکر وہ مزہ لے لے کر آخر تک کرتی رہیں، ہم بھائی بہن جب جمع ہوتے تھے، اور ہمارے بھانجے بھتیجے اور ان کے بچے بچیاں (اللہ سب کو زندہ اور سلامت رکھے) آ کر بیٹھ جاتے تو اکثر اسی مبارک سفر کا قصہ چھڑ جاتا، اور گویا نور و سرور کا ایک دفتر کھل جاتا۔

حج سے آنے کے بعد ان کا سب سے اہم اور مقدس مشغلہ والدہ صاحبہ مرحومہ کی خدمت اور ان کی مدد تھی جو روز بروز ضعیف اور معذور ہوتی جارہی تھیں، اور عمر کے آخری برسوں میں ان کی بصارت بالکل جاتی رہی، یہ کام مشکل بھی تھا، اور نازک بھی، ہر وقت کی ذمہ داری، ضعف و معذوری کے تقاضے اور لوازمات اور ماں کا معاملہ، یہ انھیں کی سعادت وہمت تھی کہ انھوں نے آخری دم تک اس کو ایسی خوبی سے نباہا اور "فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا" پر ایسا عمل کیا کہ وہ اس دنیا سے مسرور و مطمئن اور ان کے حق میں دعا گو گئیں، یہ ایک دو سال کا معاملہ نہ تھا، تقریباً دس دس برس ضرور اس مسلسل اور صبر آزما خدمت کے گزرے، یہ ان کی زندگی کا ایک روشن باب ہے، اور آخرت کی زندگی کا ایک بڑا قیمتی ذخیرہ، رضوان کے ایک خصوصی نمبر میں جو والدہ صاحبہ کے انتقال پر نکلا تھا، ان کا جو مضمون شائع ہوا تھا، اس میں اس دور کی کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے غریب خانہ رائے بریلی تشریف لائے تھے تو انھوں نے والدہ محترمہ اور خاندان کی دوسری بیبیوں اور بہنوں کے ساتھ ان کے ہاتھ پر بیعت اور توبہ کی تھی، پھر ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کی تجدید کی، اور آخر وقت تک ان سے محبت و عقیدت کا

---

(۱) تنعیم سے جو عمرہ ہوتا ہے وہ چھوٹا کہلاتا ہے، اس لیے کہ اس کا فاصلہ کم ہے اور جعرانہ سے جو عمرہ ہوتا ہے، وہ بڑا کہلاتا ہے، اس لیے کہ اس کا فاصلہ زیادہ ہے۔

تعلق رہا، خط وکتابت کی بھی نوبت آئی، انھوں نے ایک مرتبہ مولانا کی خدمت میں ایک بڑا دردانگیز اور پُر اثر خط لکھا تھا، اور دعا وتوجہ کی درخواست کی تھی، مولانا نے اس کا غیر معمولی شفقت اور نہایت خصوصیت کا جواب دیا تھا، جو میری نظر سے گزرا تھا، اس کے لفظ لفظ سے ان کے گہرے تاثر اور بزرگانہ شفقت کا اظہار ہوتا تھا، اس میں انھوں نے ان کو بڑی تسلی دی تھی، اور اظہار ہمدردی فرمایا تھا، ہماری بڑی بہن اور گھر کے کئی افراد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے بیعت وتربیت کا تعلق رکھتے تھے، ہمشیرہ مرحومہ کو بھی حضرت شیخ سے خصوصی عقیدت تھی، اور ایک مرتبہ انھوں نے خادمانہ شکوہ کیا کہ وہ بڑی بہن کو (جن کی خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہتا تھا) تنہا سلام لکھتے ہیں اور دعا دیتے ہیں، حضرت شیخ نے اس کے بعد التزام کرلیا کہ ہر خط میں ان کو ضرور سلام لکھیں اور دعا میں شریک رکھیں۔

ہمشیرہ مرحومہ نے اس زمانہ میں متعدد دینی مضامین اور رسالے لکھے، مجھے جب خدا نے عربی میں بچوں کی زبان میں مدارس کے ابتدائی نصاب کے لیے تین حصوں میں انبیاء علیہم السلام کے قصے لکھنے کی توفیق عطا فرمائی جو "قصص النبیین للاطفال" کے نام سے شائع ہوئے تو انھوں نے اس کا آزاد ترجمہ کیا جو ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، اور "بچوں کی قصص الانبیاء" کے نام سے شائع اور مقبول ہو چکا ہے، بھائی کو تو اس وقت تین ہی حصے لکھنے کی توفیق ہوئی لیکن بلند ہمت بہن نے چوتھا اور پانچواں حصہ لکھ کر اس سلسلے کو مکمل کرلیا، چوتھے میں حضرت شعیبؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت داؤد وسلیمان علیہم السلام وغیرہ کے قصے ہیں، اور پانچواں حصہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر مشتمل ہے، جو "ہمارے حضورؐ" کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے، اب پورے تیس برس کے بعد اس عاجز کو چوتھا، پانچواں حصہ لکھنے کی توفیق ہوئی۔

ہمارے خاندان میں ایک دعائیہ نظم بڑی مقبول اور مروج ہے، پریشانی اور اکثر وظیفہ کے طور پر بڑے ترنم اور رقت سے پڑھی جاتی ہے، یہ خاندان کی مستورات اور لڑکیوں کو زبانی یاد ہے، یہ کسی غیر معروف لیکن برگزیدہ شاعر کی لکھی ہوئی ہے، جن کا تخلص ہاتفؔ

تھا، اس میں خدا کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ایک نام لے کر اس سے دعا کی گئی ہے، یہ ''نعمت عظمیٰ'' کے نام سے مشہور تھی، ہمشیرہ مرحومہ کو اس سے خاص طور پر شغف تھا، انھوں نے اس کو ''مناجات ہاتف'' کے نام سے شائع کرایا، اس کتاب کی اشاعت بھی ان کے حسنات میں سے ہے۔

اس زمانہ میں ایک مشغلہ ان مناجاتوں اور اشعار کا نقل کرنا بھی تھا، جو والدہ مرحومہ موزوں کرتیں، وہ خود نہیں لکھ سکتیں تھیں، اس لیے لکھاتیں، یہ کام زیادہ تر انھیں کو کرنا پڑتا تھا، اسی کے ساتھ انھوں نے اپنی بڑی بہن کے گھر کا انتظام بھی جو ماشاء اللہ بڑا اور آباد گھر ہے، اپنے شوق سے اپنے ذمہ لے لیا اور ان کو تقریباً اس فکر سے فارغ کر دیا، اپنا دل بہلانے اور خدمت کے جذبہ سے انھوں نے روز مرہ کی ضروریات کا سامان بھی رکھنا شروع کیا، اور اس طرح تجارت کی ایک سنت بھی ادا ہو گئی، اس سے ان کو اکثر اوقات بڑی پریشانی اٹھانی پڑتی تھی، اکثر یہ سامان قرض پر جاتا تھا، اور ان کی بڑی بڑی رقمیں لوگوں کے ذمہ رہ جاتی تھیں، کئی مرتبہ ان سے کہا گیا کہ وہ یہ تردد اور دردسری کیوں مول لیتی ہیں، وہ اس کا جواب دیتی تھیں کہ ہم یہ سامان نہ رکھیں تو لوگوں کو پریشانی ہو جائے گی، اس سے وقت بے وقت لوگوں کا کام چل جاتا ہے اور عزیزوں کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے، یاد رہے کہ ہم لوگوں کا مسکن شہر سے دور ہے اور قریب کوئی بازار اور دوکان نہیں۔

دسمبر ۱۹۵۶ء سے عزیزی مولوی محمد ثانی سلمہٗ اور ان کی ادارت میں مسلمان بچیوں اور عورتوں کا دینی رسالہ ''رضوان'' نکلنا شروع ہوا، اس سے ان کو لکھنے پڑھنے کا اور مشغلہ ہاتھ آ گیا، اس میں وہ برابر مضامین لکھتیں اور ان کی نظمیں اس میں شائع ہوتیں، یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔

یہ تو سب ان کی کتاب زندگی کے ضروری باب اور عنوان ہیں، جو سوانح نگاری کے لیے ضروری ہیں، لیکن ان کی کتاب زندگی کا سب سے قیمتی ورق اور سب سے نورانی نوان ان کا درد دل، ذوق دعا، ان کے دل کی بیتابی، ان کی آنکھوں کی اشکباری اور ان کی

دن رات کی آہ وزاری ہے، جو ظاہراً تو ان کے خصوصی حالات کا نتیجہ، لیکن حقیقتاً ان کے اظہار بندگی کے لیے سامانِ غیبی، ان کی ترقی اور رفع درجات کا بہانہ ہے، مبارک ہیں وہ مقدمات جو ایسے نتائج پیدا کریں اور مبارک ہیں وہ حالات و کیفیات جو اس طرح مالک کے سامنے رلائیں اور اشکوں کے دریا بہائیں، جن کو سن کر خدا کی رحمت جوش میں آئے، اور پتھر دل بھی پانی ہو، ذرا ایک مرتبہ رخصت ہونے سے پہلے یہ اشعار پڑھئے، کس دل سے نکلے ہیں، اور انھوں نے دریائے رحمت میں کیسا تلاطم برپا کیا ہوگا، آج بھی دل کے ساکن سمندر میں تلاطم پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

کب سے کھڑی ہوں یارب امید کے سہارے   یہ دن نہ جانے میں نے کس طرح سے گزارے
بے چین و مضطرب دل جا کر کسے پکارے   وہ کون ہے جو حالت بگڑی ہوئی سنوارے

ہے باب یہ کرم کا خالی نہ پھیر یارب
دینا اگر تجھے ہے پھر کیوں ہے دیر یارب

کنج قفس سے بدتر اپنا ہے آشیانہ   اس قید بے کسی میں گزرا ہے اک زمانہ
مغموم دل پہ یارب لازم ہے رحم کھانا   کرتی ہوں میں شکایت تجھ سے یہ عاجزانہ

بارِ الم ہے دل پر طاقت نہیں ہے دل میں
کیونکر ہو صبر مجھ سے ہمت نہیں ہے دل میں

اس نظم کے دو شعر دل تھام کر اور سن لیجیے۔

کب سے لیے کھڑی ہوں میں کاسۂ گدائی
اب تک ملا نہ مجھ کو اور شام ہونے آئی

اور یہ دوسرا شعر ہے، اور کون بڑے سے بڑا صاحب علم اور صاحب درد ہے، جو اس شعر کو پڑھ کر بندگی اور عاجزی کا مزانہ لے۔

بندہ نواز! میری منت کی لاج رکھ لے
میری نہیں تو اپنی رحمت کی لاج رکھ لے

یہ سب اشعار ان کے مجموعہ ''باب کرم'' سے لیے گئے ہیں، جو چھپ کر دعا ومناجات کا ذوق رکھنے والے مردوں اور عورتوں میں مقبول ہو چکا ہے۔

آخر وہ وقت آ گیا کہ وہ جس کے دروازہ پر برسوں سے دستک دے رہی تھیں، اور فریاد کر رہی تھیں، اور اپنی والدہ محترمہ کے الفاظ میں یہ کہنے کا حق رکھتی تھیں کہ۔

عمر گزری ہے ترے دربار میں آتے ہوئے
گڑگڑاتے مانگتے اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے

اس کی رحمت کا فیصلہ ہوا کہ وہ اب اپنی اس عاجز درماندہ، دردمند، پرسوز بندی کو اس دار المحن سے اپنے اس جوار رحمت میں بلائے جس کے مکینوں کے لیے اس کا ارشاد ہے ''لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ''۔

رجب، شعبان ۱۳۹۵ھ ستمبر واکتوبر ۱۹۷۵ء سے ان کو کچھ اندرونی تکلیفیں رہنے لگی تھیں، جس کی صحیح تشخیص آخر تک نہ ہو سکی، رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ (۱۹۷۵ء) کہ جس کا ان کو بڑا انتظار واشتیاق تھا، اس مرتبہ اس کے صرف دس روزہ رکھ سکیں کہ ضعف ولرزہ کا سخت حملہ ہوا، رائے بریلی کے ایک تجربہ کار ڈاکٹر کے علاج سے وہ کیفیت تو جاتی رہی، لیکن طاقت نے عود نہیں کیا، چلنے پھرنے لگیں، لیکن کمزوری بڑھتی جا رہی تھی، اِدھر ہم لوگ ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی منعقدہ ۳۱ر اکتوبر تا ۳ر نومبر کی تیاریوں میں ایسے مصروف ہوئے کہ ہم کو خود اپنے سر وپا کا ہوش نہیں رہا، لیکن جب اجلاس سے فارغ ہو کر غالباً ۷، ۸ر نومبر کو رائے بریلی پہنچا تو گھر میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے وہ اپنے کمرہ سے نکل کر دروازہ تک آئیں، اور کہاں کہ علی! مبارک ہو، تمھارا جلسہ بہت کامیاب ہوا، ہماری دونوں بہنیں اور گھر کی مستورات، چھوٹے بڑے سب جلسہ کے لیے روز وشب دعا کر رہے تھے، ان میں سے کوئی لکھنؤ نہ جا سکا، لیکن آنے والے عزیزوں سے ان کو خبریں ملتی رہیں، ان کی وہ خوشی ابھی تک یاد ہے، جو ہم لوگوں کی زبانی جلسہ کے حالات سن کر ان کو ہوتی تھی۔

جلسہ اور ضروری کاموں سے جب ہم لوگوں کو فراغت ہوئی، تو ان کے چھوٹوں

نے اصرار کیا کہ لکھنؤ چل کر ڈاکٹروں کو دکھا دیں، اور صحیح تشخیص ہو جائے، ان کو اس میں بڑا تامل تھا، لیکن چھوٹوں کا اصرار غالب آیا، اور وہ ۷ار جنوری ۱۹۷۶ء کو لکھنؤ گئیں، چلتے وقت انھوں نے کسی سے کہا "معلوم نہیں شاید موت ہم کو لے جارہی ہے" اس سے پہلے بھی انھوں نے ایسے اشارے کئے تھے، ان کو اپنی خالہ زاد بہن کی لڑکی فاطمہ سلمہا اہلیہ عزیز گرامی قاری سید رشید الحسن صاحب (نبیرۂ نواب سید نورالحسن خاں مرحوم) مقیم حال کراچی سے اولاد کی سی محبت تھی، انھوں نے اس کو بیٹی کی طرح رکھا تھا، یہ رشتہ بھی انھیں کی پسند اور کوشش سے ہوا تھا، اور بچی کی ماں کے زندہ ہونے کے باوجود حقیقی ماں کی طرح اس کی شادی کی تھی، انھوں نے نواب صاحب مرحوم کا وہ دور دیکھا تھا، اور ان کی بیگم صاحبہ کی شفقتیں سب آنکھوں کے سامنے تھیں کہ ہم لوگوں کو اپنی اولاد ہی کی طرح سمجھتے تھے، اس لیے ان کو اس رشتہ سے بڑی خوشی تھی، کئی برس سے یہ بچی جو ماشاء اللہ اب کئی بچوں کی ماں ہے (سلمہم اللہ تعالیٰ) رائے بریلی نہیں آئی تھی، وہ یہاں سے بھی ان کے بچوں کو برابر تحفے بھیجتی تھیں، قاری صاحب کا جب خط آیا کہ ہم لوگ آنے والے ہیں تو انھوں نے سنتے ہی کہا کہ اب ہم سے کیا ملاقات ہوگی؟

ہمشیرہ مرحومہ جس دن لکھنؤ پہنچیں اسی دن مجھے ناگپور، اورنگ آباد اور پونہ کے دورہ پر روانہ ہونا تھا، میں ۷ار جنوری کی شام کو دارالعلوم سے گھر آیا کہ ان کو سلام کرتا، دعائیں لیتا سفر پر روانہ ہوں گا، اس وقت کوئی علامت فوری خطرہ اور تشویش کی نہ تھی، میں دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا، چلتے وقت مجھے حسب معمول رخصت کیا، اور والدہ مرحومہ کی عادت کے مطابق "اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْآنَ لَرَادُّکَ اِلٰی مَعَادٍ" پڑھ کر خدا کی حفاظت میں کیا، کیا معلوم تھا کہ شعور و ہوش کی حالت میں ان سے یہ آخری ملاقات ہے۔

قصہ مختصر دورانِ سفر میں مجھ پر واپسی کا ایسا شدید تقاضا ہوا کہ اپنے مزاج و عادت کے خلاف کسی کا اصرار غالب نہ آنے پایا، اور آگے کا سارا پروگرام ملتوی کر کے اورنگ آباد سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی اور دہلی سے بذریعہ ٹرین کانپور، اور کانپور سے بذریعہ کار

۲۵ / جنوری کو بعد مغرب لکھنؤ پہنچا، محبی ڈاکٹر محمد اشتیاق صاحب قریشی اور عزیزی مولوی معین اللہ صاحب ندوی (نائب ناظم ندوۃ العلماء) ہمراہ تھے، موٹر سے قدم رکھتے ہی یہ خبر بجلی بن کر دل پر گری کہ وہ بالکل بے ہوش ہیں، کئی مریضوں کا حال دیکھ چکا ہوں اور ایک طبی گھرانہ سے تعلق ہے، اس لیے اس کے آخری نتائج بجلی کی طرح آنکھوں کے سامنے آگئے، پھر یہ دو دن اور تین راتیں کس طرح گزریں، اس کو تفصیل سے سنانے کا یارا نہیں، بہرحال زندگی کے سخت ترین دنوں میں ان کا شمار ہے، انسان کی بے بسی، زندگی کی بے حقیقتی دنیا کی بے ثباتی، اللہ کے ارادہ کی قاہری اور فرمانروائی، سب حقیقتیں منکشف ہوگئیں، بالآخر ۲۸ / جنوری کو صبح تقریباً ۱۰ بجے اسی گھر میں جس میں انھوں نے باپ اور بھائی کے سایے میں بچپن، جوانی اور کہولت اور غم اور خوشی کے بہت دن گزارے تھے، جان جانِ آفریں کے سپرد کردی، اور جگر کا یہ مصرعہ بالکل حسب حال ہوا ع

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا

اسی دن خدا کی اس امانت کو جو ہم سب کو بہت عزیز تھی، وطن آبائی کے راستہ وطن اصلی تک پہنچانے کا سامان کیا گیا کہ "اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی" اور اسی دن ۲۸ / جنوری کو بعد نماز عصر ایک کثیر جماعت کے ساتھ جس میں علماء، طلبا اور صلحاء کی بڑی تعداد تھی، نماز جنازہ پڑھی گئی، اور ان کو ان کی شفیق ماں کے پہلو میں سپرد خاک کردیا، جن کی ہم سب میں سب سے زیادہ انھیں نے خدمت کی تھی، ایک طرف ان کے باکمال نامور باپ، دوسری طرف ان کے شفیق و مشفق بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم اور بیچ میں خاندان حسنی وقطبی کی برگزیدہ ترین شخصیتیں حضرت شاہ علم اللہ نقشبندی اور حضرت سید محمد عدلؒ وغیرہ ہیں، اللہ کی رحمتیں سب پر اور اس کا درود وسلام اس کے حبیب سید المرسلین شفیع المذنبین پر جن کی بدولت صراط مستقیم، راہِ نجات اور علو درجات کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

❑❑❑

محمد الحسنیؒ (محمد میاں)

جون ۹۷۹اء) کی ۱۱ یا ۱۲ تاریخ تھی اور میں بمبئی میں تھا، رات کو میں نے خواب دیکھا کہ لکھنؤ میں محمد علی لین والا ہمارا پرانا مکان ہے، بھائی صاحب مرحوم (ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء) کا زمانہ ہے، اور گھر کا وہی نقشہ ہے جو ان کی زندگی میں تھا، وہ خود زندہ سلامت ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میرا انتقال ہوگیا ہے، میں عالم برزخ سے اپنے اس پرانے مسکن میں جس میں بچپن اور جوانی گزری، گھر والوں سے ملنے آیا ہوں، مجھے پھر وہیں واپس جانا ہے، مجھے اس کا رنج بھی ہے کہ میں جلد ان عزیزوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور تھوڑا سا سہم بھی کہ مجھے قبر میں جانا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کا افسوس بھی کر رہا ہوں کہ میری عمر بہت کم ہوئی، خواب ہی میں مجھے اس کا شعور ہے کہ بھائی صاحب نے عمر طبعی پائی(۱) اور میں اس عمر کو نہیں پہنچا، اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی، میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں خاص طور سے معنی خیز جن میں آنے والے واقعات کی طرف اشارہ یا کسی امر کا انکشاف ہو، میں دیر تک سوچتا رہا کہ اس خواب کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے؟

غالباً اگلے ہی دن شب میں ایک دوست کے یہاں سے دیر میں واپس آیا، معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے ٹیلیفون سے اطلاع دی ہے کہ میرے بھتیجے محمد میاں اچانک علیل ہوگئے، ان کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے، میں جتنی جلد ہو سکے لکھنؤ پہنچ جاؤں، ہونے والی بات، یہ سنتے ہی دل پر غیر معمولی اثر ہوا جو عزیزوں کی علالت کی عام اطلاع سے نہیں ہوا کرتا، وسط مئی میں جب میں ''پیام انسانیت'' کے کام

---

(۱) ان کا انتقال ہجری حساب سے ۶۹ سال کی عمر میں ہوا۔

کے لیے کرناٹک کے دورہ پر روانہ ہوا تھا تو محمد میاں اچھے خاصے اور چاق و چوبند تھے، وہ بہت کم بیمار ہوتے تھے اور کبھی ایسے بیمار بھی نہیں ہوئے تھے جس سے آئندہ کے لیے فکر وتردد پیدا ہو، لیکن سنتے ہی ماتھا ٹھنک گیا کہ اللہ خیر کرے، ایسے غیر معمولی طریقہ پر اطلاع دینے کا اہتمام کیا گیا ہے، طبیعت پر فکر وتردد سے زیادہ حزن ویاس کی ایک کیفیت طاری ہوگئی، خواب بھی یاد آیا، دنیا میں اگر (اپنی ساری خامیوں اور کمزوریوں کے احساس کے ساتھ) میرا کوئی مثیل بلکہ ''صورت مثالی'' ہوسکتا ہے تو محمد میاں ہی ہوسکتے ہیں، وہ جب بچے تھے تو ان کی والدہ مرحومہ دعا کرتی تھیں کہ وہ اپنے چچا کے بالکل مثیل ہوں، اور اُردو کے زنانہ محاورہ کے مطابق ''اپنے چچا کو پڑیں'' اور انھی کا نمونہ ہوں، اللہ نے جن کو دو پیدا کیا ہے وہ دو ہی رہتے ہیں، پورے طور پر ایک کبھی نہیں ہوسکتے، لیکن دو میں جو زیادہ سے زیادہ وحدت، مماثلت اور مشابہت ہوسکتی ہے وہ ہم دونوں چچا بھتیجے میں تھی، اس کا گواہ خاندان کا ایک ایک فرد ہے، اس لیے دل کو اور دھڑکا لگ گیا کہ دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے؟ کہیں میں نے اپنی شکل میں ان کی مفارقت کو نہ دیکھا ہو۔

واقعہ اسی شب میں پیش آچکا تھا، لیکن میرے رفیق سفر اور معاون مولوی معین اللہ ندوی (نائب ناظم ندوۃ العلماء) نے ٹیلیفون پر یہ خبر سن کر بھی مجھ سے چھپایا کہ شاید میں سفر کے قابل بھی نہ رہ سکوں اور تھوڑی سی جو اُمید ان کا آخری دیدار کر لینے اور ان کی آخری خدمت میں شریک ہونے کی ہے وہ بھی جاتی رہے گی، میرے مزاج وجذبات کے لحاظ سے یہ بات بعید از قیاس بھی نہ تھی، میرے مخلص ومحسن میزبان محمد بھائی (مالک بمبئی، آندھرا ٹرانسپورٹ) نے جن کی کوٹھی میں میں ٹھہرا ہوا تھا اور ان کے تمام گھر والوں نے علم کے باوجود مجھے اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔

ٹیلیفون کا پیغام پہنچنے کے بعد ہی ہم لوگ ہوائی اڈہ روانہ ہوگئے کہ پہلی پرواز سے دہلی اور صبح کی پرواز سے لکھنؤ پہنچ جائیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ محرومی نہ ہوتی جو قسمت میں لکھی تھی، اور جوان کے والد اور اپنے باپ کی طرح بھائی کے معاملہ میں اس سے پہلے (مئی

۱۹۶۱ء) میں پیش آچکی تھی اور اس کا داغ زندگی بھر رہے گا، مولوی معین اللہ صاحب نے یہ بھی انتظام کرلیا تھا کہ دہلی میں بھی یہ بات مجھ سے راز رہے اور لکھنؤ پہنچ کر ہی مجھے اس روح فرسا واقعہ کا علم ہو، پھر اللہ ہی حافظ وناصر ہے، وہی ڈوبتوں کو سہارا دیتا ہے، وہی ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے، قسمت کی نیرنگی، کہ بڑی کوشش اور اس کے باوجود کہ ہوائی اڈہ کے عملہ کے بعض لوگوں سے ہمارے میزبان کے تعلقات بھی تھے، نصف شب میں روانہ ہونے والے جہاز میں کسی طرح جگہ نہ مل سکی اور مجبوراً اگلے دن ۱۴؍جون کو دن کے جہاز سے دہلی پہنچنا ہوا، ہوائی اڈہ پر جامعہ ملیہ کے جو عزیز ملنے آئے ان کے مغموم چہرے غمازی کرتے تھے کہ واقعہ پیش آچکا ہے، لیکن نہ انھوں نے زبان سے کچھ کہا، نہ مجھے پوچھنے کی ہمت ہوئی، نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں ۲، ۳ گھنٹے ٹھہرنا ہوا، وہاں بھی زبانوں اور لبوں پر مہر لگی رہی، رات کی گاڑی سے لکھنؤ روانگی ہوئی، کانپور اسٹیشن پر بھی بعض عزیز ملے لیکن وہاں بھی یہ راز افشانہ ہوا، گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پہنچی تو ایک بڑا مجمع پلیٹ فارم پر موجود تھا، سوگوار اور غم میں ڈوبا ہوا، لیکن زبانیں بند، میں اس غیر معمولی مجمع ہی سے سمجھ گیا کہ اتنے سب دوست اسٹیشن پر کیوں آئے؟ سفر تو میری زندگی کا معمول بن گیا ہے اور میں ملک کے باہر بھی نہیں گیا تھا، لیکن زبان بے زبانی کہے دیتی تھی کہ واقعہ پیش آچکا ہے، پلیٹ فارم سے باہر آیا تو رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے گلوگیر اور مرتعش آواز میں واقعہ کی خبر دی، اور میں اسی وقت موٹر سے رائے بریلی روانہ ہوگیا، یہ راستہ جس طرح گزرا اور وہاں جاکر جو کچھ پیش آیا وہ الفاظ میں ادا کرنے کی چیز نہیں، بس اللہ سے دعا ہے کہ پھر کبھی یہ آزمائش پیش نہ آئے۔

ان سطور کے لکھواتے وقت اچانک وہ دن یاد آگیا جب اکتوبر ۱۹۳۵ء کی کسی تاریخ کو بمبئی سے (جہاں بھائی صاحب مرحوم ہی نے ڈاکٹر امید کر سے ملنے کے لیے بھیجا تھا) واپسی پر اچانک گھر میں محمد میاں کی ولادت کا مژدہ سننے میں آیا(۱) جو میرے

(۱) ان کی ولادت ۱۷؍رجب ۱۳۵۴ھ (۱۵؍اکتوبر ۱۹۳۵ء) کو ہوئی۔

پہنچنے سے دو چار دن پہلے کا واقعہ تھا، پانچ بیٹیوں کے بعد اللہ نے بھائی صاحب کو فرزند اور گھر کا چراغ عطا فرمایا تھا، اس پر گھر کے بچہ بچہ اور خاندان کے ایک ایک فرد کو جو خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، پھر وہ وقت آیا کہ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھنؤ کے قیام کے دوران اپنی خواہش اور تقاضائے قلبی سے ۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک ہمارے مکان پر تشریف لے آئے، بھائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ ''محمد کو لاؤ'' میں دوڑا ہوا گیا اور ان کو گود میں لے کر آیا، مولانا نے ان کے سر پر دست شفقت پھیرا پھر اگست ۱۹۴۱ء میں جب دوبارہ تشریف آوری ہوئی تو ان کی مکتب نشینی کا وقت آ گیا تھا، مولانا ہی نے ان کی بسم اللہ کرائی، کیا عجب ہے کہ ان کی وہبی تحریری صلاحیت میں یہ برکت بھی شامل رہی ہو۔

محمد میاں کی تعلیم کا قصہ بھی عجیب ہے، اگر بیان کرنے والوں پر اعتبار نہ ہو تو اس کا یقین کرنا مشکل ہے ع

حدیث گرچہ غریب است راویاں ثقہ اند

ان کی تعلیم کا قصہ تفصیل کے ساتھ ان کے بڑے بھائی خواہرزادۂ عزیز مولوی سید محمد ثانی حسنی سلمہٗ نے بیان کیا ہے(۱)۔ ان کا ہر وقت کا ساتھ تھا، مختصر یہ کہ خاندانی دستور کے مطابق قرآن شریف ختم کرنے کے بعد انھوں نے پہلے اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی عربی پڑھنے کے قابل ہوئے تو بھائی صاحب نے خود ہی ان کو پڑھانا شروع کیا، بھائی صاحب نے اگرچہ قدیم طرز کے مطابق عربی کی تعلیم حاصل کی تھی اور ماہر اساتذہ سے درسیات کی تکمیل کی تھی اور ہر فن میں ان کی استعداد نہایت پختہ تھی، لیکن میری اور محمد میاں کی تعلیم کے بارے میں انھوں نے بالکل مجتہدانہ طریقہ اختیار کیا، میری تعلیم کے بارے میں کم لیکن محمد میاں کی تعلیم کے بارے میں زیادہ، وہ اس بات کے قائل تھے اور ایک حد تک داعی اور مبلغ تھے کہ ابتداء میں زبان کی تعلیم صرف ونحو کے قواعد کی مدد کے بغیر دی جائے،

(۱) ملاحظہ ہو تعمیر حیات کا خصوصی نمبر۔

گویا قیاس کے بجائے استقراء کے اصول پر اور عربی کی تعلیم قرآن مجید سے شروع کی جائے، عرصہ تک تو ایک گھر میں رہنے کے باوجود مجھے یہ خبر نہیں ہوئی کہ محمد میاں کیا پڑھ رہے ہیں، یہ زمانہ میری بحرانی تدریسی و تبلیغی مصروفیت کا تھا اور میں طویل طویل عرصہ تک سفر میں رہتا تھا، بھائی صاحب کی باقاعدہ تعلیم کے علاوہ محمد میاں میں اردو اور عربی کی ہر اس کتاب کے مطالعہ کا ذوق تھا جو ان کے ہاتھ لگ جائے، یہ ذوق ہم لوگوں میں موروثی طور پر لت اور مرض کی حد تک پہنچا ہوا ہے، ان کو عربی میں ابھی شد بد ہوئی تھی کہ انھوں نے ہر چیز کو پڑھنا شروع کر دیا، قدرتی طور پر ان کو زیادہ تر میری عربی تحریروں اور مضامین اور رسائل ملے اور انھوں نے اس کو صرف پڑھا ہی نہیں بلکہ جذب کر لیا، اس بارے میں میرے ساتھ ان کا معاملہ وہی تھا جو میرا اپنے والد صاحب مرحوم کی تصنیفات اور تحریروں کے ساتھ تھا کہ بچپن میں انھی کی چیزیں پڑھنے کو ملیں، اور میں نے انھی کی طرز تحریر اور انشاء و ادب کو معیاری و مثالی سمجھا، اسی کی تقلید میں فخر محسوس کیا، اور اسی کا چربہ اتارنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ خط سے خط ملانے کی کوشش بھی کی اور مجھے اس سے بڑا فائدہ پہنچا، محمد میاں کا میری تحریروں کے ساتھ بھی یہی حال تھا کہ وہ ان کو پڑھتے ہی نہیں تھے بلکہ پی جاتے تھے اور اسی کے اسلوب کی تقلید کرتے تھے۔

ابھی مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے عربی کتنی پڑھ لی اور ان کی استعداد کیا ہوئی کہ ایک روز اچانک جب ان کی عمر ۱۳، ۱۴ سال سے زیادہ کی نہ ہوگی، انھوں نے شرماتے ہوئے مجھ سے اپنے عربی کے ایک مضمون کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، میرے لیے یہ ایک انکشاف تھا کہ وہ عربی میں مضمون لکھنے لگے ہیں، میں نے بڑے شبہ و استعجاب کے ساتھ ان کا مضمون دیکھنا شروع کیا، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ عربی میں ان کا قلم چل گیا ہے اور وہ مضمون نگاری کے قابل ہو گئے ہیں، ۱۹۴۹ء میں جب ان کی عمر ۱۴، ۱۵ سال سے زیادہ نہ تھی، میں نے لکھنؤ کے ایک تبلیغی اجتماع میں ''صورت و حقیقت'' کے عنوان سے ایک تقریر کی، اس وقت کے حالات و تاثرات کی وجہ سے یہ تقریر بڑی مؤثر و طاقتور بن گئی

تھی، بعض یادداشتوں اور حافظے کی مدد سے میں نے اس کو اردو میں خود مرتب کرلیا، اور وہ "صورت وحقیقت" ہی کے عنوان سے چھپ گئی، اسی زمانہ میں مجھے حجاز کا دوسرا سفر درپیش تھا، جس میں مجھے وہاں طویل قیام کرنا تھا، اور وہاں کے علمی وادبی حلقوں میں (دینی وذہنی تحریک پیدا کرنے کا عزم تھا، اس مقصد کے لیے مجھے ایسے دعوتی لٹریچر کی ضرورت تھی جو وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اہل علم کے حلقوں میں ایک جنبش وتموج پیدا کرسکے، میں نے امتحانانہ یہ تقریر محمد میاں کے حوالہ کی کہ وہ اس کا ترجمہ کردیں، خیال تھا کہ میں اس پر محنت کرکے اس کو چھپنے کے قابل بنادوں گا لیکن جب وہ ترجمہ کرکے لائے تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں اصل تقریر کا جوش اور طاقت موجود ہے اور مجھے اس پر کسی خاص محنت کی ضرورت نہیں، یہ ان کے ترجمہ اورانشاء کا پہلا کامیاب تجربہ تھا" بین الصورۃ والحقیقۃ" کے نام سے یہ رسالہ عربی ٹائپ میں قیمہ پریس بمبئی میں چھپوا کر جون ۱۹۵۰ء میں اپنے ساتھ لے گیا، میں جتنے دعوتی رسائل اپنے ساتھ لے گیا تھا ان میں یہ رسالہ سب سے زیادہ مؤثر ومقبول ہوا، اور بعض بڑے علمائے نے اپنی مجلس میں اس کو خود پڑھ کر سنایا، اس کے بعد سے اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں اور وہ بہت سے عرب ممالک میں بڑے ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

کسی خاص محنت، کسی مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم اور صرف ونحو اور مبادی کا لفت خواں سر کیے بغیر محمد میاں کو عربی تحریر کا جو ملکہ حاصل ہوگیا اور وہ بے تکلف بڑے بڑے عرب ادباء اور اہل قلم کی کتابیں اور مضامین پڑھنے لگے، اس کو میں بھائی صاحب کی ایک کرامت ہی سمجھتا ہوں، انھوں نے اپنے کم سن یتیم بھائی (راقم السطور) کو جس خلوص، دلسوزی اور جانکاہی کے ساتھ عربی زبان وادب اور دینیات کی تعلیم دلائی اور اس بارے میں اپنے والد ماجد کا منشا پورا کیا، جس طرح ہرفن کے ماہر اساتذہ کا انتخاب کیا اور اس دوربینی اور بلند نگاہی کے ساتھ (جس کا ہندوستان کے حالات اور وقت کے دینی وعلمی مشاغل سے کوئی جوڑ نہ تھا) اس کو عربی زبان میں دعوت وتبلیغ کے کام کے لیے تیار کیا، صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا صلہ اور انعام محمد میاں کی شکل میں عطا فرمایا کہ ان کی ساری لیاقت وصلاحیت

کا معاملہ محض وہبی اور خداداد تھا، اور "عمل قلیلاً و اجر کثیراً" کا مصداق۔

ان کے میرے قلم سے قلم ملا دینے کی بات جب قلم کی زبان پر آ ہی گئی ہے تو یہ لطیفہ سنا تا چلوں کہ ایک مرتبہ (غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے) جب "تاریخ دعوت و عزیمت" کی پہلی جلد لکھ رہا تھا اور مرکز دعوت و تبلیغ کچہری روڈ لکھنؤ میں جہاں میرا قیام تھا، امام غزالیؒ کی "احیاء العلوم" کی ایک طویل عبارت کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھا، اس وقت محمد میاں کہیں سے آ نکلے، میں دیر سے ترجمہ میں مصروف تھا اور مجھے اٹھنے کی ضرورت تھی، میں نے ان سے کہا کہ "یہاں سے تم ترجمہ کردو میں ابھی آتا ہوں" انھوں نے قلم برداشتہ ترجمہ لکھنا شروع کردیا، میں جب فارغ ہو کر آیا تو وہ خاصہ حصہ لکھ چکے تھے، میں نے اس کے آگے سے لکھنا شروع کردیا، اس حصہ کو مکمل کرنے کے بعد جب میں نے دیکھا تو مجھے قطعاً یہ پتہ نہیں چلا کہ میں نے کہاں شروع کیا تھا اور انھوں نے کہاں سے شروع کر کے ختم کیا، انھوں نے قلم سے قلم اور پیوند سے پیوند ایسا ملا دیا تھا کہ میں نہ ان کے اور اپنے خط میں، نہ زبان و اسلوب میں امتیاز کرسکا، اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ پوری تحریر میرے ہی قلم کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ان کا ذہنی و ادبی ارتقاء تیزی کے ساتھ جاری رہا، عمر و مطالعہ کے ساتھ اور جو حالات مشرق وسطیٰ میں پیش آ رہے تھے ان کے اثر سے ان کے قلم کی روانی اور اس سے بڑھ کر ان کے قلم کی طاقت اور جوش تحریر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ سچی بات ہے کہ وہ اس میں مجھ سے بازی لے گئے، ان میں فطری طور پر (اور کسی حد تک یہ بات موروثی بھی ہے کہ بھائی صاحب مقرر نہ تھے اور ان کی کم سخنی خاندان اور حلقہ میں ضرب المثل ہے) خطابت کا مادہ نہ تھا، خطابت کی یہ طاقت بھی زبان سے قلم ہی کی طرف منتقل ہوگئی اور ان کی عربی تحریر میں خطیبانہ جوش، بے ساختگی اور برجستگی اور آمد و روانی ایسی پیدا ہوگئی جو آتش نوا اور شعلہ بار خطیبوں کا شیوہ اور ان کی تقریروں کا خاصہ ہے۔

اسی زمانہ میں انھوں نے میری بعض عربی تصنیفات کا ترجمہ کیا، دونوں زبانوں پر ان کو یکساں قدرت معلوم ہوتی ہے لیکن خطابت اور جوش کا عنصر ان کی عربی تحریروں میں

زیادہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو تحریر میں سلاست وحلاوت ان کو اپنے دادا (مولانا سید عبدالحیؒ) سے ورثہ میں ملی، میری کتاب "الطریق الی المدینة" کا ترجمہ کاروان مدینہ "الأرکان الأربعة" کا ترجمہ ارکان اربعہ "ربانیة لا رھبانیة" کا ترجمہ تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک، سب کے آخر میں "السیرة النبویہ" کا ترجمہ نبی رحمت، جو انھوں نے بڑے ذوق وشوق اور اہتمام واحترام کے ساتھ کیا، اس کے شاہد عادل ہیں۔

اسی زمانہ میں مشہور نومسلم یہودی النسل جرمن فاضل علامہ محمد اسد کی کتاب "ROAD TO MACCA" کا عربی ترجمہ "الطریق الی مکہ" سامنے آیا، میں اس کتاب سے بہت متاثر ہوا، کتاب نہایت فکر انگیز، خیال افروز بلکہ ایمان افروز تھی، لیکن وہ بڑی بلند پایہ، علمی وادبی زبان میں لکھی گئی تھی، اس میں کثرت سے نفسیات، فلسفہ سیاسیات اور علم الاجتماع کی اصطلاحیں استعمال کی گئی تھیں، مغربی بالخصوص امریکی مذاق کی رعایت سے مصنف نے اپنے تاثرات ومشاہدات اور اپنے فکر ومطالعہ کے نچوڑ کو اپنی زندگی کی ایک داستان کی شکل میں پیش کیا تھا، پھر اس داستان کو پڑھنے والوں کی دلچسپی کے خیال سے توڑ کر کتاب میں پھیلا دیا تھا اور ان کے مختلف ٹکڑوں کو آگے پیچھے کر دیا تھا، اس میں کسی تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا تھا، میں نے پوری کتاب پڑھ کر اور اس پر محنت کر کے اس کے ٹکڑوں کو تاریخی طور پر مرتب کر دیا، میں اس کتاب کے ترجمہ کو ذہین واعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں خصوصیت کے ساتھ غیر مسلم اہل فکر کے لیے (جو مسلمان کی کسی تحریر کو خاطر میں نہیں لاتے اور خاص طور پر دعوتی لٹریچر کو سطحی ہونے کا طعنہ دیتے ہیں) بہت مفید سمجھتا تھا، لیکن مجھے اس بارے میں بڑا شک تھا کہ اس کے عربی ترجمے کو جو مصنف کے زیر نگرانی ہوا ہے، اردو میں کوئی منتقل کرنے میں کامیاب ہو سکے گا، ہندوستان میں عربی کی ایسی بلند پایہ، عمیق ودقیق کتابیں (درسی، فقہی وکلامی کتابوں کو مستثنیٰ کر کے) کم ہی پہنچتی ہیں، اور ان کے پڑھنے والے تو خال خال ہی ہیں، میں نے بڑے تردّد کے ساتھ یہ کتاب محمد میاں کو دی، میں نے کہا کہ اس کے ترجمہ کی کوشش کرو، انھوں نے انگریزی میں بھی استعداد پیدا

کرلی تھی، میں نے کہا انگریزی اصل بھی سامنے رکھو اور جہاں وقت پیش آئے مخدومی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے مدد لو، انھوں نے کام شروع کردیا، علمی اصطلاحات کے ترجمہ میں جہاں ان کو دقت پیش آئی انھوں نے مولانا سے رجوع کیا، مولانا نے فلسفہ کے مشہور فاضل ومصنف صاحبزادہ ظفر حسین خاں مصنف ''مآل ومشیت'' کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا، تھوڑے عرصہ میں انھوں نے ترجمہ مکمل کردیا، جو ''طوفان سے ساحل تک'' کے نام سے چھپا، یہ ترجمہ کسی طرح اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ یہ ایک ایسے نوعمر مترجم کے قلم سے نکلا ہے جس نے کسی عربی مدرسہ میں تعلیم پائی نہ کسی کالج میں، مصنف نے ازراہِ کرم ہماری مجلس ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' ندوۃ العلماء لکھنؤ کو برصغیر ہندوپاکستان کے لیے اس کی اشاعت کی اجازت دے دی اور اس کے یورپین ناشر سے بھی اجازت دلوادی، اس وقت سے اس برصغیر میں یہی ترجمہ چل رہا ہے، ہندی میں بھی اسی سے ترجمہ کیا گیا ہے، کتاب پڑھنے کے بعد کوئی انصاف پسند قاری ترجمہ کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا، کہیں سے اس میں ترجمہ پن کی بو نہیں آتی، معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے قلم سے براہ راست یہ کتاب اردو میں نکلی ہے، خدا کا شکر ہے کہ یہ ترجمہ ان کے والد ماجد کی زندگی ہی میں شائع ہوگیا اور انھوں نے اپنے لائق اور ہونہار فرزند کی تحریری قابلیت اور ترجمہ کا کمال دیکھ لیا۔

ان کی اردو تحریر وانشاء اور تصنیف وتالیف کا ذکر شروع ہوا ہے تو اس کو مکمل کرتا چلوں کہ ۱۹۶۲ء میں طبیعت پر اس کا شدید تقاضا ہوا کہ بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی شایانِ شان سیرت وسوانح ندوۃ العلماء کی طرف سے مرتب کی جائے کہ یہ ایک ایسے ادارے اور جماعت کا اخلاقی وعلمی فرض ہے جو ان کا لگایا ہوا قلم ہے، اور جس نے بڑی تعداد میں ایسے اہل قلم پیدا کیے، جنھوں نے سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کا میدان اختیار کیا اور اس میں اپنی کامیابی اور برتری کا نقش قائم کردیا ہے، بہت سی حیثیتوں سے یہ میرا فرض تھا کہ میرے قلم سے متعدد سوانح عمریاں نکل چکی تھیں، لیکن اس زمانہ میں

میری نظر بہت کمزور تھی اور نزول الماء کی وجہ سے میں ایسا تصنیفی کام کرنے قاصر تھا جس میں کثرت سے باریک تحریروں کو پڑھنا اور مواد اور حوالے تلاش کرنا ضروری ہے، میری نظر ہندوستان کے بعض اچھے اہل قلم پر پڑی جن کو دینی شخصیتوں کی سوانح نگاری سے خاص مذاق اور شغف تھا، میں نے ان سے خط وکتابت بھی کی، لیکن کام شروع نہ ہوسکا، پھر اس غرض سے دار العلوم کی بالائی عمارت میں اس سوانح کی ترتیب وتحریر کے لیے باقاعدہ دفتر قائم کیا، دار العلوم کے ایک اہل قلم استاد کی خدمات بھی اس کے لیے لیں اور کتاب کا مواد، ماخذ اور ضروری کتابیں جمع کردیں، لیکن کام میں کچھ پیش رفت نہیں ہوئی، اسی دوران ایک روز اچانک معلوم ہوا کہ محمد میاں (جن کا ''البعث الاسلامی'' کا دفتر اسی کمرہ میں تھا) بغیر کسی کو بتلائے اپنے شوق سے یہ کام شروع کرچکے ہیں اور ان کی بڑی تمنا ہے کہ یہ کام ان کے ہاتھوں انجام پائے، یہ غالباً اس تعلق کا نتیجہ تھا جو ان کے دادا مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب اور حضرت مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری کے درمیان رہ چکا ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس کام کو خالص اپنی سعادت سمجھ کر انجام دے رہے ہیں اور ان تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں جو اہل اللہ اور برگزیدہ اصحاب کی سوانح اور سیرت کی تصنیف وترتیب میں ملحوظ رکھنے چاہئے۔

تھوڑے عرصہ میں انھوں نے سوانح کا مسودہ میرے حوالہ کیا کہ میں اس پر اصلاحی نظر ڈال لوں، کتاب میرے تصور وتوقع سے بلند نکلی، مجھے آج بھی اس میں بہت شبہ ہے کہ میں اس کو اتنے اچھے طریقہ پر لکھ سکتا اور اس کے حقوق سے عہدہ برآ ہوسکتا تھا؟ کتاب میں ان کے قلم کی پختگی کے ساتھ ان کے ذہنی بلوغ اور پختگی کا بھی اظہار ہوتا ہے، اور کسی طرح یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ایک ایسے مصنف کے قلم سے نکلی ہے جس کی عمر صرف ۲۵ سال ہے اور جس نے کسی تصنیفی ادارہ یا کسی استاد سے تصنیف وتالیف کی تربیت نہیں حاصل کی، کتاب میں متانت تحریر، توازن اور اسی کے ساتھ ادبیت وتاثیر ہے، اور وہ سیر وسوانح کی ان شرائط کو پورا کرتی ہے جو ایک جامع کمالات ہستی اور ایک عہد آفریں

تحریک کے بانی کی سوانح کے لیے ضروری ہیں۔

۳۱/ اکتوبر، ۱، ۲، ۳، نومبر ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن، دار العلوم ندوۃ العلماء کے وسیع احاطہ میں منعقد ہوا، شرکائے اجلاس کے مرتبہ ومقام، موقر عرب وفود کی کثرت، عرب ممالک کی سربرآوردہ علمی ودینی شخصیتوں کی موجودگی، شیخ الازہر علامہ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود صدر اجلاس کی دلآویز شخصیت اور ان کی اقتداء میں جمعہ کی نماز کی ادائیگی (جس میں ایک لاکھ سے زائد کے مجمع کا اندازہ کیا جاتا ہے) اجلاس کے دوران سکینت وبرکت کی ایک روحانی فضا کا احساس، جلسوں کا نظم وضبط، حاضرین کا گہرا تاثر یہ سب وہ خصوصیات تھیں جو ہندوستان کی تاریخ میں اس سرزمین پر مدت دراز سے دیکھنے میں نہیں آئی ہوں گی، لیکن جو لوگ اس جشن میں شریک نہیں تھے ان کو جشن کا صحیح تاثر دینا اور اس کی قلمی تصویر کھینچنا اگر ناممکن نہیں تو نہایت دشوار معلوم ہوتا تھا۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش راچساں خواہد کشید

لیکن اس جشن کی روداد کا مرتب نہ کرنا اور جو کچھ دیکھا ہے اس کو دوسروں کو دکھانے کی کوشش نہ کرنا بھی سمجھ میں نہ آیا، آخر میں محمد میاں ہی پر نظر پڑی کہ وہ اس میں عملاً شریک بھی تھے اور ان احساسات وجذبات میں بھی ان کا حصہ تھا جو اس اجلاس کے پیچھے کام کررہے تھے، یہ ان کے گھر کی کہانی تھی اور ان کے دادا اور باپ کے خون اور پسینے سے سینچے ہوئے پودے کی نکھار اور فصل بہار کی داستان اور بقول شاعر۔

داستانِ فصل گل خوش می سراید عندلیب!

انھوں نے میرے عربی خطبۂ استقبالیہ کا ترجمہ اردو میں اس طرح کیا تھا کہ بعض جگہ وہ عربی سے بھی بڑھ گیا تھا، شعر کی جگہ شعر رکھنا اور ہندوستانی ومقامی ماحول کی ر[illegible]ایت سے الفاظ کا انتخاب بڑی سبک دستی بلکہ چابکدستی کا کام تھا، انھوں نے روداد مرتب کی اور گویا الفاظ میں ریکارڈنگ کا کام اس طرح کیا کہ پڑھنے والے کو دل کی دھڑکنیں ذہن

کے اندیشے، انبساط کی کیفیت اور سانس کی آواز بھی سنائی دے، جب یہ ''رودادِ چمن'' کے نام سے شائع ہوئی تو مخدومی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی علیل اور بڑی حد تک معذور ہو چکے تھے، انھوں نے کتابوں پر مختصر تبصرہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا، لیکن ''رودادِ چمن'' انھوں نے خود مطالعہ فرمائی اور اس پر ایسا تبصرہ کیا جو عرصہ سے انھوں نے کسی کتاب پر نہیں کیا تھا، ان کا یہ جملہ بڑا معنی خیز اور پوری عبارت کا قائم مقام ہے کہ ''مصنف نے پروپیگنڈہ کو لٹریچر بنادیا ہے'' آج بھی کتاب موجود ہے اور اس میں مصنف کے قلم کی مصوری کا کمال دیکھا جاسکتا ہے۔

گھر کے ماحول خاندانی اثرات اور فطرت سلیمہ کی بنا پر محمد میاں کو اہل قلوب اور خاصانِ خدا سے گہری عقیدت تھی اور تزکیۂ نفس اور تعلق مع اللہ کی اہمیت وضرورت سمجھتے تھے، اسی جذبہ نے اس زمانہ میں جب وہ اپنے علمی وادبی مشاغل میں منہمک تھے ان کے قلم سے اپنے خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت سید احمد شہیدؒ کے جدامجد اور گیارہویں صدی ہجری کے ممتاز ترین متبع سنت وحامئی شریعت شیخ حضرت سید شاہ علم اللہؒ کی سیرت لکھوائی، جو جولائی ۱۹۷۰ء میں ''تذکرۂ حضرت سید شاہ علم اللہؒ'' کے نام سے شائع ہوئی، وہ ان کی مؤثر ترین تحریروں میں ہے، حضرت مولانا حسین صاحب مدنی ان کے گویا خاندانی شیخ تھے، اور ان کے والد والدہ دونوں ان سے بیعت تھے، مولانا لکھنؤ میں بھائی صاحب کے گھر کے علاوہ کہیں قیام نہیں فرماتے تھے، ڈاکٹر صاحب سے جو تعلق خاص تھا اس کی بنا پر محمد میاں پر بھی بڑی شفقت کی نظر تھی، مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۵۷ء میں بھائی صاحب مولانا کی عیادت کو دیوبند تشریف لے گئے تو میں اور محمد میاں بھی ہمرکاب تھے، ایک دن مولانا نے مجھ سے پوچھا ''محمد میاں کیا کرتے ہیں''؟ میں نے کہا کہ عربی کا رسالہ ''البعث الاسلامی'' کے ایڈیٹر ہیں، فرمایا کہ ''آپ ان کو دارالعلوم کا کوئی سبق نہیں دیتے'' میں نے بعض مصالح کا ذکر کیا جو اس کے منافی تھے، فرمایا کہ ''کیا آپ لوگوں کے کہنے سننے کا خیال رکھتے ہیں''؟ پھر عربی کے دو شعر پڑھ کر جن کا مطلب یہ تھا کہ زبانِ خلق سے تو کوئی بڑی

ہستی بھی محفوظ نہیں رہی، فرمایا کہ ان کو دارالعلوم سے جو قلبی لگاؤ اور اس کے کاموں میں دلسوزی و دلچسپی ہوگی وہ ہر ایک کو تو نہیں ہو سکتی۔

اس عقیدت کا نتیجہ تھا کہ محمد میاں نے مولانا کی سیرت لکھنے کا ارادہ کیا جو مولانا کے حلقۂ عقیدت بلکہ ہندوستان کی ملت اسلامی کے ذمہ قرض ہے، جس کے لیے انھوں نے قربانیاں دیں، انھوں نے یہ کام شروع بھی کر دیا تھا، لیکن ان کی اچانک وفات کی وجہ سے وہ مکمل نہ ہو سکا۔

اپنے زمانہ کے شیوخ وصلحاء میں ان کو حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے بڑی عقیدت تھی، حضرت کی لکھنؤ کی مجلسوں میں تو وہ شریک ہوتے ہی تھے، رائے پور بھی گئے اور وہاں حضرت کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے حضرت کی آخری علالت میں ان کو لاہور پہنچا دیا، حضرت کا حادثۂ وفات ان کے سامنے ہی پیش آیا، جنازہ کے ساتھ گئے اور حضرت کے وطن ڈھڈیاں جا کر تدفین میں شرکت کی۔

اپنے مرشد کے علاوہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے بھی عقیدت ومحبت تھی، متعدد بار وہ رمضان المبارک میں سہارنپور جا کر ان کی صحبت اور ان کی مبارک مجالس میں شرکت سے مستفید ہوئے، حضرت شیخ کی مشہور کتاب ''فضائل نماز'' کا عربی میں ترجمہ بھی کیا جو "الصلوٰۃ ومکانتها فی الاسلام" کے نام سے چھپی ہے، جس سے حضرت کی دعائیں ان کو حاصل ہوئی اور تبلیغی جماعت کے عرب حلقوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، آخری دور میں ان کو حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری سے بڑا تعلق ہو گیا تھا، اور مولانا کی بھی ان پر خصوصی نگاہ شفقت تھی، مولانا کے عارفانہ کلام کو جمع ومرتب کرنے میں خاص طور پر ان کی تحریک شامل تھی اور انھی کے بار بار تقاضے سے ''دیوان محبت'' کے نام سے مجموعہ مرتب ہوا جس کے عناوین انھی کے تجویز کئے ہوئے ہیں، مولانا کی خدمت میں وہ وقتاً فوقتاً حاضر بھی ہوا کرتے تھے، مولانا کو ان کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا، ان کی مجلسوں میں اب بھی ان کا برابر تذکرہ ہوتا ہے۔

محمد میاں پڑھنے لکھنے میں جتنے پکے تھے، سفر میں اتنے ہی کچے تھے، یہ وراثت

ان کو اپنے والد ماجد سے ملی تھی جو برسوں سفر نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ والدہ صاحبہ کے اشارہ و ہدایت سے میں ان کو مسلم مجلس مشاورت کے دورۂ گجرات میں ساتھ لے گیا، جو دسمبر ۱۹۶۸ء میں ہوا تھا، اس سلسلہ میں احمد آباد اور اس کے نواح گودھرا، بڑودہ، سورت اور بھڑوچ ان کا جانا ہوا، حجاز کے سفر بھی انھوں نے میرے دوسرے عزیزوں اور رفیقوں کے مقابلہ میں کم کئے تھے، پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء کو انھوں نے حجاز کا سفر کیا تھا، اور وہاں چھ مہینے قیام کر کے واپس ہوئے تھے، دوسرا سفر انھوں نے تنہا ۱۹۷۲ء میں "الندوة العالمية للشباب الاسلامی" کی دعوت پر جس کا مرکز ریاض میں ہے کیا، اور سالانہ کانفرنس میں شرکت اور حج سے فراغت کر کے واپس ہو گئے، تیسرا سفر ۱۹۷۴ء میں میری معیت میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس استشاری کے موقع پر پیش آیا، ہوائی جہاز کے سفر سے ان کے اعصاب پر بڑا اثر پڑتا تھا، اور وہ سفر میں ٹرین کو ترجیح دیتے تھے لیکن بیرونی ممالک کے سفر میں ہوائی جہاز سے چارہ نہیں تھا، اس لیے وہ حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے، انتقال سے کچھ ہی دن پہلے ان کو ایک طرف قبرص (سائپرس) کی مسلم صحافت کی اس کانفرنس میں شرکت کے لیے جو رابطہ عالم اسلامی کے اہتمام میں ہو رہی تھی، دعوت نامہ ملا، اور دوسری طرف ماسکو سے وہاں کی ایک صحافتی کانفرنس میں شرکت کے لیے دعوت نامہ آیا ہوا رکھا تھا، لیکن انھوں نے ان دونوں سفروں میں سے کسی میں جانا پسند نہیں کیا اور اس کی نوبت آنے سے پہلے وہ دنیا سے سفر کر گئے، قبرص میں بجائے ان کی موجودگی کے ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی اور فاتحہ پڑھ کر ثواب پہنچایا گیا۔

۶–۸ جولائی ۱۹۷۸ء کو رابطہ اسلامی کی طرف سے کراچی میں پہلی اسلامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی، اس وقت میں حجاز میں تھا، مجھے معلوم ہوا کہ محمد میاں کے نام بھی دعوت نامہ گیا ہے، میری بڑی خواہش تھی اور میں نے اس کے لیے حرم شریف میں دعائے کی کہ وہ اس کی شرکت کے لیے آمادہ ہو جائیں اور پاکستان کے سفر و قیام میں ان کا ساتھ ہو، اللہ نے یہ دعا قبول کی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی معیت میں وہ عین وقت پر پہنچ گئے۔

اس کانفرنس سے فراغت کے بعد وہ میرے ساتھ پاکستان کے مختصر دورے میں شریک رہے، فیصل آباد، اسلام آباد، راولپنڈی، سرگودھا، اکوڑہ خٹک اور لاہور کے سفر میں ساتھ رہا، اس سفر میں وہ اپنے مرشد حضرت مولانا رائے پوری کے وطن ومدفن دھڈیاں بھی گئے، دودن وہاں قیام رہا، ہندوستان آکر انھوں نے اپنی بہنوں سے کہا کہ یہی سفر کا حاصل تھا، اور جو سکون وہاں نصیب ہوا پورے سفر میں نصیب نہیں ہوا، اس موقع سے ان کو دور افتادہ عزیزوں نے بھی ان کو دیکھ لیا، جنھوں نے ان کو دیکھا نہیں تھا اور ان کا نام اور قابلیت کی شہرت سنتے تھے...... انھوں نے اس پورے سفر میں اپنے کو ایک معمولی رفیق اور شریک قافلہ سے زیادہ نہیں سمجھا اور ہر جگہ چھوٹے بن کر رہے۔

ان کا ذہنی و علمی نشوونما دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ماحول میں ہوا تھا، ان کا رابطہ وہاں کے اساتذہ اور فضلاء سے مسلسل اور مستقل طور پر رہا، آمدورفت، مجالس کی شرکت اور علمی مذاکرات کے ذریعہ وہاں کے ماحول اور فضا سے قریب رہے، ندوہ سے ان کو دو یا تین پشتوں کا تعلق تھا، وہ اس کے مقاصد اور دعوت سے بچپن سے آشنا اور مانوس تھے، پھر ان کا مطالعہ جتنا بڑھتا گیا اس پر ان کا اذعان اور اس کی صحت وصداقت پر یقین بھی بڑھتا گیا جس کا اندازہ ان کے ان اردو اور عربی مضامین سے ہوتا ہے جو وہ وقتاً فوقتاً ندوۃ العلماء کے ترجمان "تعمیر حیات" اور "البعث الاسلامی" میں لکھتے رہے، نیز ان مضامین ورسائل سے جو انھوں نے پچاسی سالہ تعلیمی جشن کے لیے لکھے، اس آزاد علمی استفادہ کے علاوہ انھوں نے مولانا شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم شیخ الحدیث دارالعلوم کے درسِ حدیث میں سال بھر باقاعدہ شرکت کی اور ان سے صحاح کا درس لیا۔(۱)

محمد میاں کا ذہن شروع سے وسیع تھا، ان میں کہیں سے سید جمال الدین افغانی کے آتش کدہ کی ایک چنگاری اڑ کر آگئی تھی جو ان کو بے چین بنانے اور وسیع خطوط پر سوچنے پر مجبور کرتی تھی، انھوں نے ہندوستان سے تو کیا اپنے شہر لکھنؤ سے بھی بہت کم باہر قدم نکالا

(۱) اس درس میں مولوی ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری (حال مستشار علمی رئیس القضاۃ ابوظبی) ان کے رفیق وشریک تھے۔

تھا، ان کے سفروں کی حد یہی دو تین قریبی اضلاع تھے، جن سے ان کو وطنیت یا قرب کا تعلق تھا، لیکن وہ لکھنؤ میں بیٹھے بیٹھے عالم اسلام کے اسلام پسند اور حوصلہ مند نوجوانوں کی تنظیم کے خواب دیکھتے تھے، رجب ۱۳۷۹ھ (جنوری ۱۹۶۰ء) میں انھوں نے اپنے رسالہ ''البعث الاسلامی'' میں سال نو کے تحفہ کے طور پر اس تنظیم کے قیام کی تجویز پیش کی، پھر اگلے شمارہ شعبان ۱۳۷۹ھ (فروری ۱۹۶۰ء) میں ''مشروع اسلامی کبیر'' کے عنوان سے انھوں نے اس کے قیام کا اعلان کر دیا اور نوجوانوں کو اس کی رکنیت کی دعوت دی، عربی میں اس کا نام ''جمعیۃ الرابطۃ الاسلامیہ'' تھا اور انگریزی میں ''INTERNATIONAL CULTURAL ISLAMIC ORGANIZATION'' یہ نوجوانوں کی بین الاقوامی اسلامی تنظیم تھی جس کا مقصد آپس میں تعارف، ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت، مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے کام میں تعاون، ان کو صحیح مشورہ اور رہنمائی پیش کرنا تھا، اس کی طرف سے عربی انگریزی میں رسائل ومضامین بھی شائع ہوئے اور وہ دوسرے ملکوں تک پہنچے، بہت سے نوجوانوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور رکنیت قبول کی، یاد رہے کہ یہ رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ کے قیام سے دو سال پہلے کی بات ہے۔

اردو تحریر وتصنیف اور ان کے سفروں اور بعض دعوتی وتنظیمی کاموں کے اس ضمنی تذکرہ کے بعد جو محمد میاں کی زندگی اور ان کے علمی وادبی کاموں میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے، ہم ان کی عربی تحریر وانشاء کی طرف واپس آتے ہیں کہ یہی ان کا اصل میدان اور ان کے تفوق وامتیاز کا نشان ہے، عربی میں ان کا زور قلم بڑھتا رہا اور ان کو اپنی تحریر وانشاء کے لیے ایک نئے اور مستقل میدان کی ضرورت جلد پیش آ گئی، وہ بڑے سے بڑے اہم موضوع پر قلم برداشتہ اور برجستہ لکھ لیتے تھے، ان کے مضامین وتحریریں آمد ہی آمد تھی، مجھے بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ میں نے کچھ لکھنا چاہا لیکن لکھنے کا موڈ نہ تھا، بعض کہنہ مشق اساتذۂ ادب اور عربی لکھنے والوں کے سپرد کیا تو مطلب کی بات ادا نہ ہوئی، مجبور ہو کر میں نے ان کے حوالہ کیا اور وہ تھوڑے وقت میں قلم برداشتہ لکھ کر لے آئے اور میں اس کو پڑھ کر بالکل مطمئن

ہوگیا کہ میری صحیح ترجمانی اور مضمون کا حق ادا ہوگیا، بعض نہایت نازک اور ذمہ دارانہ موقعوں پر مثلاً ۲۲ر اپریل ۱۹۷۴ء کو سعودی سفیر ہزا کسلینسی انس یوسف یاسین کی آمد اور ۳ر فروری ۱۹۸۷ء کو امام حرم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن حسن کی تشریف آوری اور نماز جمعہ کی امامت کے موقع پر ندوۃ العلماء کی طرف سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا وہ انھیں کا لکھا ہوا تھا، حقیقت میں یہ کام میرے کرنے کا تھا لیکن وقت کم تھا اور طبیعت مضمحل، وہ دن گزر چکے تھے جب طبیعت جوش سے بھری ہوئی اور قلم کی کمان چڑھی ہوئی تھی، میں نے کہا کہ "محمد میاں یہ سپاس نامہ تم لکھو" ان میں سعادتمندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور میرے ساتھ معاملہ تو ایک سعید فرزند کا تھا، طبیعت شگفتہ تھی یا افسردہ، وہ گئے اور اس طرح مضمون لکھ کر لے آئے کہ جیسے کمپیوٹر میں سے کوئی چیز نکل آئے، دیکھا تو اول سے آخر تک مرصع، کہیں قلم رکھنے کی گنجائش نہیں، پھر زور بیان، برجستگی اور دلآویزی مستزاد، پڑھ کر دل خوش ہوگیا اور دل سے دعا نکلی، مضمون علماء وادباء کی موجودگی میں جلسہ میں پڑھا گیا اور سب نے داد دی، ان لوگوں کی بہت بڑی تعداد رہی ہوگی جو سمجھتے ہوں گے کہ میں نے لکھا ہے، میں نے ایک فاضل دوست سے سنا ہے کہ جب "البعث الاسلامی" کے آتشیں اور شعلہ بار اداریے ان کے نام سے چھپے ہوئے بعض اہل ذوق نے پڑھے تو کہا کہ "یہ سب مولانا ابوالحسن علی کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں، محمد میاں کا نام ہوتا ہے"۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ مجھے اپنی کتاب "الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ" کے نئے ایڈیشن کے لیے آخری مضمون لکھنا تھا جس میں پوری کتاب کا عطر آجائے اور وہ پڑھنے والے میں ایک نئی روح اور نیا ولولہ پیدا کردے، کتاب کا اردو اور انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوچکا تھا، ادھر مجھ سے بعض اہل ذوق نے یہ کہا تھا کہ کتاب کا آخری مضمون پوری کتاب کے مقابلہ میں کسی قدر سست اور ڈھیلا ہے، اور ناظرین وہی تأثر لے کر کتاب بند کرتے ہیں جو اس کے آخری باب یا فصل سے ان پر طاری ہوتا ہے، میں نے کچھ دیر تو سوچا کہ میں عربی میں لکھوں یا اردو میں، پھر فیصلہ کیا کہ

اردو میں لکھوں اتفاق سے اسی زمانہ میں پاکستان کے ایک موقر دینی رسالہ کے مدیر(۱) کی (جو مجھے بہت عزیز ہیں) فرمائش آئی ہوئی تھی کہ میں ان کے رسالہ کے لیے کوئی مضمون بھیجوں، میں نے سوچا کہ "بیک کرشمہ دو کار" میں یہ مضمون بھی ان کو بھیج دوں گا اور اس کو خود عربی میں منتقل کر دوں گا، طبیعت موڈ پر تھی اور کتاب کو مؤثر ونتیجہ خیز بنانے کا عزم تھا، اس لیے طبیعت میں آمد ہوئی اور میں نے ایک نشست میں پورا مضمون لکھوا دیا، جو "حرف آخر" کے عنوان سے اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں نظر آئے گا، مضمون سے فارغ ہونے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اب عربی میں اس کے لکھنے میں وہ آمد اور زور نہیں رہے گا جو براہِ راست مضمون کے لکھنے میں تھا، اتفاق سے محمد میاں رائے بریلی آئے، میں جانتا تھا کہ ماشاء اللہ ان کی کمان چڑھی رہتی ہے اور ان کا اشہب قلم ساز و یراق سے آراستہ رہتا ہے، میں نے کہا کہ محمد میاں اس کے عربی میں ترجمہ کی کوشش کرو، مجھے خود یہ کام مشکل معلوم ہوتا ہے، میرے ایک دو مرتبہ کہنے کے بعد وہ گھر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد مضمون لکھ کر لے آئے، دیکھا تو معلوم ہوا کہ جیسے کسی عمدہ مشین سے ڈھلا ڈھلایا نکلا ہو، جہاں تک یاد ہے کہیں انگلی رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، عربی کتاب "الصراع بين الفكرة الاسلامية والفكرة الغربية" میں یہ مضمون "خاتمۃ البحث" کے عنوان سے موجود ہے، مترجم کا نام کتاب میں نہیں ہے، جس کا جی چاہے پڑھ لے، اور فیصلہ کرے کہ کیا کتاب میں دو قلم ہیں، یا ایک ہی؟ بلکہ بہت سے اہل ذوق محسوس کریں گے کہ یہ کتاب کا سب سے طاقتور حصہ ہے اور کتاب کی روح سمٹ کر اس میں آ گئی ہے۔

اس پر ایک دوسرا واقعہ یاد آیا، انھوں نے "الاسلام بين لا و نعم"؟ (جواب ان کے ایک پورے مجموعہ مضامین کا نام ہے اور مصر میں زیر طبع ہے) کے نام سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس تضاد کا اظہار کیا تھا جس کو مسلمان حکومتیں معاشرے اور افراد اسلام کے بارے میں اختیار کیے ہوئے ہیں، مضمون میں انھوں نے حسب معمول اپنا دل نکال کر

---

(۱) مولانا سمیع الحق صاحب مدیر رسالہ "الحق" اکوڑہ خٹک ضلع پشاور۔

رکھ دیا تھا، غالباً ۱۹۶۳ یا ۱۹۶۴ء تھا میں رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس کے سلسلہ میں مکہ معظمہ میں مقیم تھا، مصر اور تحریک اخوان کے مشہور خطیب وادیب استاد عبدالحکیم عابدین جو بانیٔ تحریک "الاخوان المسلمون" الامام الشہید حسن البناء کے بہنوئی اور ایک زمانہ میں جماعت "الاخوان المسلمون" کے سکریٹری جنرل بھی رہے اور مصر سے جلاوطنی کے بعد بیروت میں وکالت کرتے تھے، مجھ سے ملنے عزیزی ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی کے مکان پر آئے، میں کسی ضرورت سے کمرہ سے باہر گیا، واپس آیا تو دیکھا کہ وہ "الاسلام بین لا و نعم" پڑھ رہے ہیں، ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر رہے ہیں، میں کمرے میں داخل ہوا تو مجھ سے روتے ہوئے کہا "من هذا الأخ الذی کتب هذا المقال"؟ (یہ کون صاحب ہیں جنھوں نے یہ مضمون لکھا ہے؟) میں نے کہا کہ میرے بھتیجے ہیں، رو کر کہنے لگے کہ میرا اسلام پہنچانا اور مضمون کی داد دینا۔

۱۹۵۲ء میں جب مصر میں انقلاب آیا اور زمام اختیار وقیادت صدر ناصر کے ہاتھ آئی اور قومیت عربیہ کی وہ تیز وتند آندھی اٹھی جو عرب نوجوانوں بلکہ پختہ کار عربوں کی بھی ایک بڑی تعداد کو اڑا لے گئی، بڑے بڑے تناور درخت اور علم وادب کی کوہ پیکر شخصیتیں اس طوفان میں پتہ کی طرح اڑتی اور اس سیلاب مین تنکے کی طرح بہتی نظر آتی تھیں، اس وقت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ فکر اسلامی اور دعوت اسلامی کی ترجمانی کے لیے عربی کا ایک رسالہ نکالا جائے، اس وقت اس پورے تحتی براعظم میں عربی کا کوئی رسالہ نہ تھا، ندوۃ العلماء کا ارگن "الضیاء" ۱۹۳۵ء ہی میں بند ہو گیا تھا، عربی صحافت کا مزاج ایسا بگڑا تھا کہ جو لوگ اس فتنۂ عالم آشوب سے متاثر نہیں تھے اور قومیت عربیہ اور مصری قیادت پر تنقید کرنا چاہتے تھے، ان کے مضامین کا کسی اخبار ورسالہ میں چھپنا بھی دشوار تھا، اور اگر وہ کہیں چھپتے تو یہ رسائل ان غضب ناک نوجوانوں کے عتاب کا نشانہ بن جاتے جو اس فلسفہ پر ایمان لا چکے تھے اور جن پر قومیت واشتراکیت کا نشہ چھایا ہوا تھا۔

۱۹۵۵ء میں جب یہ تحریک اپنے شباب پر تھی اور سارا مشرق وسطیٰ (الا ماشاء اللہ)

اس نشہ سے مست اور اپنے جامہ سے باہر ہو رہا تھا، ہم لوگوں نے عربی رسالہ ـــ ارادہ کیا، اس سے کچھ پیشتر محمد میاں کا ایک مضمون رسالہ "المسلمون" میں "العالم الاسلامی علی مفترق الطرق" (دنیائے اسلام دوراہے پر) کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ "المسلمون" اپنے عہد کا معیاری اور صف اول کا عربی رسالہ اور فکر و دعوت اسلامی کا بین الاقوامی ترجمان تھا، جس میں عالم عربی اور دنیائے اسلام کے چیدہ و برگزیدہ اہل قلم وارباب فکر لکھتے تھے، اس بلند پایہ رسالہ میں لکھنا ہر ایک کا کام نہ تھا، اس وقت صاحب مقالہ کی عمر ۲۰ سال سے بھی زیادہ نہ تھی، رسالہ کے مدیر ڈاکٹر سعید رمضان اس وقت تک ہندوستان نہیں آئے تھے، وہ بالکل نہیں سمجھ سکے کہ مضمون نگار عربی کا ایک نوعمر لکھنے والا ہے جو جلد اسلامی عربی صفحات کے افق پر ستارہ بن کر چمکنے والا ہے۔

۱۹۵۵ء میں "البعث الاسلامی" کے نام سے یہ رسالہ نکلا، اس کے مدیر، مالک سب کچھ محمد میاں ہی تھے، بھائی صاحب مرحوم نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی محمد میاں کے دوست اور دارالعلوم کے لائق استاد مولوی سعید الرحمٰن ندوی ان کے معاون خاص تھے۔

خوش قسمتی سے اس رسالہ کو اسی حسنی گھرانے کے دو اور لائق فرزند محمد میاں کے پھوپھی زاد بھائی مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولوی سید واضح رشید ندوی کا قلمی تعاون بھی حاصل ہوگیا، یہ دونوں بھائی (اللہ ان کی عمر میں برکت دے) عربی صحافت کی ممتاز صلاحیت رکھنے کے ساتھ انھیں جذبات وخیالات سے سرشار تھے، جو محمد میاں کے سینہ میں موجزن تھے، ان چاروں نے ایک ٹیم کی طرح کام کیا اور رسالہ کو تیزی کے ساتھ ترقی دی، جب رسالہ کی افادیت ومقبولیت نمایاں ہوئی تو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی نے (۱۹۶۰ء میں) اس کو ندوۃ العلماء کے ترجمان کی حیثیت سے لینے کا فیصلہ کیا، اور بھائی صاحب مرحوم کی فراخ دلی اور محمد میاں کے ایثار سے یہ رسالہ ندوۃ العلماء کی طرف سے خوبصورت ٹائپ میں چھپنے لگا، پہلا شمارہ جو ندوۃ العلماء کی جانب سے نکلا اور جس پر "تصدرها ندوة العلماء" لکھا ہوا ہے، وہ رمضان وشوال ۱۳۷۹ھ (مارچ واپریل ۱۹۶۰ء) کا پرچہ ہے۔ اسی

کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۵۹ءؔ سے ایک پندرہ روزہ اخبار ''الرائد'' بھی نکلنا شروع ہوا جس کے مدیر خصوصی مولوی محمد رابع ندوی، شریک ادارات مولوی واضح رشید ندوی تھے اور خصوصی مضمون نگار محمد میاں، اس اخبار نے رسالہ کو کمک پہنچائی اور دونوں نے مل کر صحیح خیالات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔

''البعث'' نے ایک ایسی حکومت، دعوت اور تحریک کے خلاف محاذ کھول دیا جو عصر حاضر کی ان تمام طاقتوں سے مسلح تھی جو کسی بڑی حکومت، وسیع ملک، اور شاطر قیادت کو حاصل ہوتی ہیں، کہاں مصر کا سحر سامری اور دبدبۂ فرعونی جس کے جلو میں صحافیوں، ادیبوں، خطیبوں، مصنفین، اہل قلم کا لشکر اور ذرائع ابلاغ کے زبردست مرکز تھے جنھوں نے اچھی اچھی مخالف عرب حکومتوں کے چھکے چھڑا رکھے تھے، کہاں محدود تعداد میں معمولی ٹائپ و کاغذ پر چھپنے والا عربی کا یہ غریب رسالہ جس کے عملہ کا حال یہ تھا کہ ع

خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گِل کوزہ

لیکن اس کے صاحب ایمان نوجوان مدیر کا جوش جنوں، اس کی غیرت ایمانی اور زورِ قلم کی وجہ سے جس نے سید جمال الدین افغانی کے ''العروۃ الوثقیٰ'' کے مخصوص مقالات اور مولانا آزاد کے ''الہلال'' کے آتشیں اداریوں کی یاد تازہ کردی تھی، بہت جلد اس رسالہ نے اسلام پسند حلقوں میں جو مصر کی اس ''خانہ برانداز'' تحریک سے بے چینی محسوس کرتے تھے لیکن کھل کر اپنی بیزاری کا اظہار اور مصر کی قیادت پر تنقید نہیں کرسکتے تھے مقبولیت حاصل کرلی اور انھوں نے اس کو نہ صرف اپنے خیالات کا ترجمان سمجھا بلکہ اپنے زخموں کا مرہم اور اپنے درد کی دوا سمجھے، اس کا اندازہ ان تعزیتی خطوط اور تعزیتی نوٹس سے ہوگا جو عالم عربی کے بلند پایہ اسلامی الفکر صحافیوں، عالموں، ادیبوں اور رہنماؤں نے اس جواں سال مسلم صحافی کی وفات پر لکھے اور جن کے متعدد نمونے مرحوم کے تازہ مجموعۂ مضامین ''تناقض تحار فیه العیون'' کے آخر میں شائع ہوئے ہیں۔

''البعث'' کے اداریوں اور مقالات کی گونج صرف اسلامی ہی حلقوں میں نہیں

سنی گئی بلکہ مصر وشام کے ادبی صحافی حلقوں اور حکومت کے ایوانوں میں بھی سنی گئی، مجھے ایک باخبر ومعتبر مصری دوست نے بتایا کہ صدر ناصر کو جو چند رسائل اوراخباروں کے تراشے مطالعہ کے لیے پیش کیے جاتے تھے ان میں ''البعث الاسلامی'' بھی ہوتا تھا، ہندوستان کے مصری سفارتخانہ نے حکومت ہند سے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا اور ایڈیٹر سے جواب طلبی بھی ہوئی، لیکن انھوں نے روش نہیں چھوڑی اوران کے زورقلم میں کوئی کمی نہیں آئی، راقم السطور سے مشہور عرب رہنما اور مجاہد شیخ محمد محمود الصواف (رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالم اسلامی) نے خود ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''البعث الاسلامی'' نے ناصر کو بے نقاب کرنے کے سلسلہ میں جو کردار ادا کیا ہے وہ پورے عالم عربی میں کسی رسا[illegible] بارے نہیں ہوسکا۔

''البعث الاسلامی'' کی مقبولیت اسلا[illegible]ں میں برابر بڑھتی گئی، سعودی عرب نے جو ملک فیصل مرحوم کی قیادت میں مصر کی اس تحریک کا خاص طور پر مقابلہ کررہا تھا، خاص طور پر اس کی اہمیت محسوس کی اور وہاں کے بعض صاحب حمیت عالموں اور شیوخ نے ''حسبۃً للہ'' اس کی تبلیغ واشاعت کا کام کیا، مجھے یاد ہے کہ محمد میاں جب پہلی مرتبہ (۱۳۸۷ھ-۱۹۶۷ء میں) میرے ساتھ حجاز گئے اور وہاں کے وزیر تعلیم معالی الشیخ حسن ابن عبداللہ بن حسن سے ملنے کے لیے ہم لوگ شیخ محمد محمود الصواف کی معیت میں طائف گئے تو انھوں نے بڑی گرمجوشی سے ''البعث'' کے جوان مدیر کا استقبال کیا اور رسالہ سے اپنی گہری دلچسپی وتاثر کا اظہار۔

اسی سفر میں (۱۳؍رجب ۱۳۸۷ھ ۱۶؍اکتوبر ۱۹۶۷ء کو) وہ سنگین حادثہ پیش آیا جس میں اللہ نے ہم دونوں کو بال بال بچایا، ہوا یہ کہ جب ہم طائف سے واپس آرہے تھے تو حدودِ مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ڈرائیور کی آنکھ جھپک جانے کی وجہ سے گاڑی الٹ گئی اور ایسی الٹی کہ چھت بالکل زمین پر تھی اور چاروں پہیے دفتی کے ڈبہ کی طرح اوپر، ڈرائیور کا خیال تھا کہ ہم دونوں اب اس عالم میں نہیں ہیں، اس نے لیٹے لیٹے پوچھا ''یاشیخ أأنت حیّ؟'' واقعہ بھی ایسا تھا، گاڑی جب رکی تو پہلے محمد میاں باہر آئے اور انھوں نے کہا کہ چچا میاں باہر آجایئے، اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کی مدد فرمائی اور صاف جان بچالی، ایسا کس طرح اور

کیسے ممکن ہوا یہ محض قدرت الٰہی کا کرشمہ ہے، مفتی امین الحسینی صاحب مرحوم نے مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ آپ گاڑی سے اس طرح نکلے جیسے حضرت یونس شکم ماہی سے نکلے تھے، معلوم ہوتا ہے ابھی اللہ کو محمد میاں سے کام لینا تھا اور ''البعث الاسلامی'' کے ذریعہ عالم عربی میں ہندوستان کی ایک بے سروسامان جماعت کی نحیف آواز پہنچانی تھی۔

محمد میاں کے ان زلزلہ انگیز اداریوں کا سلسلہ جاری رہا اور صحیح الفکر عرب نوجوان روز بروز ان کے گرویدہ ہوتے گئے، جس ماحول اور تربیت میں ان کا نشو ونما ہوا تھا، اس کے بالمقابل دنیائے اسلام بالخصوص عالم عربی کی مذہب بیزار اور اسلام گریز قومی، اشتراکی، بعثی مادی تحریکوں اور دعوتوں اور بہت سے ممالک عربیہ (اور خاص طور پر ان ممالک کی جن کو دعوت اسلامی کا مرکز اور اسلامی دنیا کے لیے نمونہ ہونا چاہئے تھا) مادہ پرستانہ زندگی نے ان کی طبیعت کے اندر ایک شدید کشمکش پیدا کردی اور (جیسا کہ میں نے ان کی معرکۃ الآرا کتاب ''الاسلام الممتحن'' کے مقدمہ میں لکھا ہے۔)

''ان کے قلم کو ایک ایسے آبشار میں تبدیل کردیا جو چٹانوں سے ٹکرانے کی وجہ سے ابلتا ہے، اور بڑے جوش وشور کے ساتھ گرتا ہے، اس کے نتیجہ میں ایسے مضامین ان کے قلم سے نکلے جن میں آبشار کا شور اور طوفان کا زور ہے''۔

اس کا نمونہ ان کے مجموعہ مضامین ''الاسلام الممتحن'' اور ''تناقض تحار فیه العیون'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ان کے آخری زندگی کے مضامین میں ایک اہم مضمون وہ تھا جس میں انھوں نے اس تضاد کا نقشہ کھینچا ہے جو اسلامی ممالک میں عمومیت کے ساتھ اور بعض ان عرب ممالک میں (جو اسلام کی نمائندگی، مقاماتِ مقدسہ کی خدمت وحفاظت اور دین صحیح کی دعوت کے دعویدار اور علمبردار ہیں) وہاں کے سربراہوں اور ذمہ داروں کے اقوال وافعال اور اسلام کی تعلیمات اور وہاں کی روزمرہ کی زندگی میں پایا جاتا ہے اور جس کو دور کیے بغیر نہ اسلام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے آسکتی ہے، نہ یہ ممالک خطرہ سے نکل سکتے ہیں، انھوں نے اس

مضمون میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا اور خون کے آنسو روئے تھے، یہ مضمون ان کے رسالہ ''البعث کے رجب ۱۳۹۹ھ (جولائی ۱۹۷۹ء کے) شمارہ میں ''سوال حائر یحتاج الی جواب'' کے عنوان سے شائع ہوا، میں اہتمام سے البعث اور الرائد پڑھتا ہوں لیکن ان دنوں میں بعض تحریری کاموں کی تکمیل کے سلسلہ میں ایسا مشغول ہوا کہ میں یہ نمبر نہیں پڑھ سکا، ان کے حادثۂ وفات کے بعد جب مولانا منظور نعمانی صاحب کے منھ سے اس کی تعریف سنی اور انھوں نے یہ بتایا کہ انھوں نے ٹیلیفون پر ان کو اس جرأتمندانہ اور مؤثر مضمون پر دل کھول کر داد دی اور ان سے فرمائش کی کہ وہ اس کا ترجمہ خود کر دیں وہ اس کو اپنے رسالہ ''الفرقان'' میں شائع کردیں (۱) گے۔

مرحوم کے انتقال کے بعد جب میں بمبئی سے واپس ہوا تو میں نے وہ مضمون پڑھا اور پڑھ کر مسرت کے ساتھ یہ حسرت ہوئی کہ میں نے مضمون ان کی زندگی میں کیوں نہ پڑھ لیا تھا، اگر میں ان کی زندگی میں یہ مضمون پڑھ لیتا تو ان کا ہاتھ چومتا اور پیشانی کو بوسہ دیتا، اس کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے اگر چہ یہ بات عجیب معلوم ہوتی اور ان کے لیے آزمائش بن جاتی، لیکن اس کے بغیر اس پسندیدگی کا اظہار ممکن نہ تھا جو اس مضمون کے پڑھنے سے ہوتی ہے، افسوس ہے کہ اس کی نوبت نہ آئی اور یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

شاید بہت سے لوگوں پر یہ بات گراں گزرے اور کچھ پڑھنے والے اس کو مبالغہ اور جانبداری پر محمول کریں کہ وہ اپنے اس جوش تحریر وزور قلم میں سید قطب شہید سے آنکھیں ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور تعجب نہیں کہیں (ایک عجمی نژاد نوعمر ایک عربی الاصل پختہ کار ادیب کا فرق ذہن میں رکھتے ہوئے) ان سے بڑھ جاتے ہوں کہ فوارہ کی روانی اس کے جوش دروں کا نتیجہ ہوتی ہے، اور یہ ''جوش دروں'' ان کو اپنے آبائے کرام

(۱) مرحوم کی اچانک وفات نے اس کی مہلت نہ دی، خدا کو منظور تھا کہ یہ کام ان کے ہونہار فرزند سید عبداللہ حسنی ندوی سلمۂ کے قلم سے تکمیل پائے، انھوں نے بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ اس مضمون کو اردو میں منتقل کیا جو الفرقان ماہ شوال ۱۳۹۹ھ میں ''ایک تضاد جس کی کوئی توجیہ ممکن نہیں'' کے عنوان سے شائع ہوا، اور بہت پسند کیا گیا اور اس طرح فارسی کا وہ جملہ صادق آیا، اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔

اور حضرت سید احمد شہید کے تعلق وعقیدت سے ملا تھا، جس کی نظیر مشرق وسطیٰ میں (مغربی تعلیم وتربیت اور مغربی تہذیب وتمدن کے اثر سے) اگر مفقود نہیں تو قلیل الوجود ضرور ہے، میں نے اپنے اس مقدمہ میں اس حقیقت نگاری کی معذرت کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''میرا اور صاحب کتاب کا رشتہ ایک طرح سے باپ بیٹے اور استاد وشاگرد کا سا ہے، اس کتاب کا مقدمہ لکھتے وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا میں اپنی کسی تصنیف کا مقدمہ لکھنے جا رہا ہوں، جس کا یہ نتیجہ ہوسکتا ہے کہ لوگ اس کو ''اپنے منھ اپنی تعریف'' اظہارِ کمال اور خود پسندی پر محمول نہ کریں اور یہ ایک ایسی کمزوری ہے، جس کو دین وشریعت اور اخلاق وتہذیب نے کبھی پسند نہیں کیا، اور میں خود بھی امکانی حد تک اس سے بچنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔

لیکن جب میں نے اپنے اس احساس کا حقیقت پسندانہ اور غیر جانبدارانہ جائزہ لیا اور اس کا تجزیہ کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں درحقیقت لوگوں کے تبصرہ اور قیل وقال سے ڈر رہا ہوں، اس خوف واحساس نے اس مسئلہ کو غیر شعوری طور پر ایک اخلاقی رنگ دے دیا ہے، میں طبیعت کی اس کمزوری کو ایک اخلاقی کمزوری سمجھ رہا ہوں، میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے اس جذبہ واحساس کے سامنے سپر ڈال دی اور اس خوف سے ایک قابل قدر کتاب کا مقدمہ لکھنے سے باز رہا کہ وہ میرے ایک خورد اور عزیز کی کتاب ہے تو میں ایک خیالی اخلاقی کمزوری اور کوتاہی کا ارتکاب کروں گا، اس لیے کہ قرآن کی اخلاقی تعلیمات جہاں اعزہ واقارب (اگر وہ برسر باطل ہوں) کے خلاف شہادت دینے کو ضروری قرار دیتی ہیں وہیں ان اعزہ واقارب کے حق میں (اگر وہ برسر حق ہوں) شہادت دینے کو بھی واجب گردانتی ہیں، قرآن مجید میں جہاں یہ فرمایا گیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى

اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَيۡنِ.(۱)

اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار بنے رہو اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو، خواہ یہ گواہی تمہاری اپنی ذات، ماں باپ اور عزیزوں کے خلاف پڑے۔

وہیں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهۡلِهَا وَاِذَا حَكَمۡتُمۡ بَيۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡكُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمۡ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيۡعًا بَصِيۡرًا.(۲)

خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالہ کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو، خدا تمھیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بے شک خدا سنتا اور دیکھتا ہے۔

اس نابغۂ جواں سال جس نے اپنی عمر کی صرف ۴۴ بہاریں دیکھیں، اسلام کے اس پر جوش داعی وسپاہی اور اس پر مستزاد اپنے گھر کے اس "گوہر شب چراغ" اور لخت جگر کے انتقال سے دل ودماغ پر جو گزری اور گزر رہی ہے اس کو امیر خسرو کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں جو انھوں نے کسی ایسے ہی حادثہ پر اپنے مالک حقیقی کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ حقیقت حال کی عکاسی اور دل کی ترجمانی اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز

□□□

(۱) النساء:۱۳۵۔ (۲) النساء:۵۸۔

مولوی اسحٰق جلیس ندوی

ہمارے دینی عربی مدارس عرصۂ دراز سے ہر قسم کے ہنگامہ سے دور، اور زندگی کے سمندر میں خاموش اور الگ تھلگ جزیروں کی حیثیت رکھتے ہیں، ہندوستان میں انگریزوں کے عہد سے جو تعلیمی انقلاب شروع ہوا، پھر اس ملک میں جو سیاسی، اقتصادی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے نتیجہ میں آسودہ حال، ذہین و باصلاحیت خاندانوں کے بچے اور ہونہار نوجوان زیادہ تر اپنے شہروں اور قصبات کے اسکولوں، کالجوں اور اگر اس سے زیادہ حوصلہ مندی اور وسائل ہوئے تو پھر اٹاوہ کے اسلامیہ اسکول اور علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی بھیجے جاتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے یہ قومی ادارے اور جدید تعلیم کے مرکز مسلمان ''شاہین بچوں'' کا مرکز بن گئے، اور انھی نے دورِ آخر میں انگریزی زبان کے ادیب وانشاء پرداز، سیاسی اور قومی میدان کے خطیب ومقرر اور محکموں کے اعلیٰ افسر، قانون ساز مجالس کے ممبر، وزارت وحکومت میں حصہ لینے والے پیدا کئے، ہونا تو نہیں چاہئے تھا مگر ہوا یہی کہ عام طور پر جن سرپرستوں اور والدین کے پاس اعلیٰ تعلیم دلانے کے وسائل نہیں تھے (یا ان پر کسی وجہ سے دینی جذبہ کا غلبہ تھا) وہ اپنے بچوں کو عربی مدارس میں بھیجتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں پڑھنے والوں کی بڑی تعداد، جدت فکر، ''جرأت اندیشہ'' اور طباعی کے اس جوہر سے محروم ہوتی جو اقتصادی، نسلی فطری اور روایتی اسباب کی. ہر جدید دانش گاہوں کے حصہ میں زیادہ آئی۔

لیکن نہ یہ عربی مدارس کے حق میں کوئی کلیہ تھا جس میں کوئی استثناء نہیں، نہ

جدید دانش گاہوں کے حق میں، دونوں طرف بہ کثرت استثنائی مثالیں ملتی ہیں جدید تعلیم گاہوں میں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پانے والوں کی ایک بڑی تعداد ذہانت وجرأت کے جوہر سے محروم، لکیر کی فقیر اور رٹے ہوئے طوطوں کی طرح اپنے ذہن ودماغ سے کام لینے کے جوہر سے عاری ہے، اور اس کے برخلاف مدارس میں تعلیم پانے والے سادہ اور محدود ماحول میں زندگی گزارنے والے طلباء میں ایسے لوگ نکلتے رہتے ہیں جن میں بعض اوقات عقابی روح اور شاہین کا جگر ہوتا ہے، لیکن عام طور پر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی اچھی کان کا ہیرا یا کسی پھلنے پھولنے والے باغ کا ثمر نورس، کسی علمی اور دینی خاندان کا نونہال (جس کے سلسلہ میں پشتہا پشت سے علم اور ذہانت چلی آرہی ہے) آجاتا ہے، پھر انھی مدارس سے ایسے فضلاء نکلتے ہیں جن کی ذہانت وطباعی، جرأت وہمت، خود اعتمادی وخود شناسی، شخصیت کی دلآویزی ودلربائی، قوت تقریر وتحریر کے سامنے کسی بڑی سے بڑی ملکی یا بیرونی دانش گاہ کے فضلاء اور مغربی زبان کے ماہرین کا چراغ نہیں جلتا، وہ جس میدان کی طرف رخ کرتے ہیں اپنی ذہنی وعلمی صلاحیت، اپنی قوت عمل اور اپنے امتیاز کا نقش قائم کردیتے ہیں اور اقبال کا یہ شعر یخ بستہ مدارس پر بھی صادق آتا ہے کہ ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ وبالا

اس کی بڑی بڑی مثالیں دی جاسکتی ہیں اور قدیم نظام تعلیم کے ساختہ پرداختہ اور عربی مدارس کے ایسے فضلاء کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں، جن کا سارے ہندوستان نے نہیں بلکہ ساری دنیا نے لوہا مان لیا اور ان سے ہندوستان کا نام روشن ہوا، انھوں نے آزادی کی تحریک میں قائدانہ کردار ادا کیا، عربی، فارسی اور اردو کتب خانوں کو اپنی بلند پایہ تصنیفات سے مالامال کردیا، اپنے ملک کی زبان وادب کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی اپنی برتری اور انفرادیت ثابت کردی، تاریخ وتحقیق کی طرف متوجہ ہوئے تو اس میدان میں بھی

جھنڈے گاڑ دیئے، سیاست کی طرف رخ کیا تو اس میدان میں بھی اپنی ضرورت تسلیم کرالی، یہ فہرست بہت طویل ہے اوران باوقار ناموں کے درج کرنے میں یہ نزاکت بھی ہے کہ کہیں کوئی اہم نام چھوٹ جائے اور یہ بھی خطرہ ہے کہ ان سے مماثلت نہ سمجھ لی جائے، کہنا صرف یہ ہے کہ ان مدارس میں بھی وقتاً فوقتاً ایسے بچے یا نوجوان آجاتے ہیں جن میں فطری یا خاندانی طور پر ذہانت وطباعی کا خداداد جوہر ہوتا ہے، ان کی طبیعت میں اخذ کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی صلاحیت، ان کی فطرت میں وہ بے چینی وبیتابی ہوتی ہے جو بعض اوقات ان کو ایک شعلۂ جوالہ بنادیتی ہے، قسمت سے اگر کسی ادارہ کو ایسے کچھ نوجوان مل جائیں اور وہ بھی اقبال کے مصرعہ ع

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

پر نظر رکھتے ہوئے کسی جماعت سے منسلک یا کسی دعوت سے مربوط رہیں تو بڑا کام کرلے جاتے ہیں اور ملت کے لیے بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

اس کی ایک چھوٹی سے مثال ہمارے جواں سال وجواں مرگ لائق رفیق وعزیز مولوی اسحاق خاں ندوی تھے۔ ۱۹۵۶ء میں (۱) دارالعلوم میں ایک نوجوان نظر آیا، بلند وبالا قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ، کتابی چہرہ، چوڑی پیشانی اور فراخ اور روشن آنکھیں، معلوم ہوا کہ یہ افغانی النسل، ہندی الوطن لڑکا ہے، اس کے والد (مولوی عبدالستار خاں صاحب) احمد نگر کے (جو ہندوستان کا ایک بڑا فوجی مرکز ہے) ملٹری سنٹر کے جامع مسجد کے امام اور فوج کے مولوی ہیں، ہندی، مراٹھی، ابتدائی انگریزی اور عربی وہیں کے اسکول اور مدرسہ میں حاصل کی، اب آگے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی اللہ کے بندے کے مشورہ اور تحریک سے یہاں آئے ہیں، پشتو اب بھی ان کے خاندان میں بولی جاتی ہے اور یہ خود بھی بول لیتے ہیں، تھوڑے دن کے بعد جب زیادہ ملنا جلنا ہوا تو معلوم ہوا کہ ان کے والد سخت

---

(۱) ان کا دارالعلوم میں داخلہ ۶ رجون ۱۹۵۶ء کو درجۂ پنجم میں ہوا، وہ مرہٹی کا سکنڈری امتحان کا سٹیفکیٹ حاصل کر چکے تھے، اور ابتدائی عربی، مقامی مدرسہ میں پڑھ کر آئے تھے، ان کے سٹیفکیٹ پر پیدائش کی تاریخ ۷ رجولائی ۱۹۳۴ء لکھی ہوئی ہے، اس طرح وہ جب دارالعلوم آئے تو ان کی عمر ۲۲ سال ہوگی۔

کٹر بریلوی عقائد کے ہیں، مزاجاً نہایت سخت، غصہ ور بے لوچ ہیں، مزاج میں ضد ہے، آدمی ذاکر شاغل اور خوش اوقات ہیں، اخوند صاحب سوات (حضرت حاجی عبد الغفور نقشبندیؒ) کے سلسلہ میں کسی شیخ سے بیعت ہیں۔ معلوم نہیں کس طرح وہ اپنے بیٹے کو ندوہ بھیجنے پر راضی ہوگئے، باپ بیٹے میں مزاجوں کا بڑا تباین اور مسلک کا اختلاف ہے، گھر بھی بعض خاص وجوہ کی بنا پر خانگی کشمکش کی آماجگاہ ہے، اسحاق خاں کی والدہ کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے، والد نے دوسری شادی کر لی ہے اور اس طرح وہ شفقت مادری اور کسی حد تک محبت پدری سے بھی محروم ہیں۔

دن گزرتے گئے، مولوی اسحاق خاں حالات کا مقابلہ کرتے رہے اور دار العلوم میں پڑھتے رہے، تھوڑے ہی دن میں ان کے جوہر کھلنے لگے، چستی و مستعدی، ہمت وجرأت اور ذہانت ووجاہت انھوں نے وراثت میں پائی تھی، جو کام سپرد کر دیا جائے، بہت جلد وقت میں خوبی کے ساتھ انجام دیتے، پڑھنے میں بھی اچھے تھے اور اجتماعی ومجلسی کاموں میں تو بہت مستعد اور پیش پیش، طلباء کی انجمن الاصلاح سے تعلق پیدا ہوا تو ان کی تقریر اور تنظیمی صلاحیت کے جوہر کھلے، وہ بہت جلد طلباء میں ہر دلعزیز اور معتمد علیہ بن گئے، کتب بینی اور مطالعہ کا ان کو شوق تھا، اردو کا بہت بڑا لٹریچر انھوں نے پڑھ لیا، اخبارات ورسائل اور سیاسیات سے بھی دلچسپی تھی، جدید مضامین وہ کچھ پڑھ کر آئے تھے، کچھ یہاں کے مطالعہ سے اور پڑھ لیا، کوئی بڑے سے بڑا آدمی آتا تو اس سے بات کرنے اور اس کے ساتھ رہنے میں ان کی آنکھ نہ جھپکتی، وہ بھی ان کی ذہانت اور خوش تقریری سے متاثر ہوتا، دار العلوم کے اساتذہ اور کارکنوں میں وہ راقم السطور سے زیادہ قریب اور مانوس تھے، تبلیغی کام میں بھی جس کا مرکز اس زمانہ میں شہر میں تھا وہ دلچسپی لینے لگے، ان کے ماموں پہلے سے بھی تبلیغی جماعت سے منسلک تھے، انھوں نے ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۹ء) میں عالمیت پاس کیا اور ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۱ء) میں فضیلت کے آخری سال کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے، اس درجہ کی کامیابی کے لیے ایک تحقیقی مقالہ عربی میں لکھنا ضروری ہوتا ہے، ان کے مقالہ کا عنوان

تھا "تدوین الفقه فی الهند" ان کو اس میں ۱۰۰/۷۰ نمبر ملے۔

مولوی اسحاق صاحب تو خانگی حالات کی وجہ سے، کچھ والد صاحب کے مزاج ومسلک سے عدم توافق کی بنا پر اور کچھ فطرتاً بے چین طبیعت کے واقع ہوئے تھے، اور یہ اکثر ذہین نوجوانوں کی خصوصیت ہے، یہ بے چینی اور طبیعت کی ہمہ گیری اکثر اوقات عدم استقلال اور تلون پیدا کر دیتی ہے اور جب اس کو کنٹرول میں رکھنے والی کوئی شخصیت یا طاقت نہیں ہوتی تو اکثر ایسے نوجوانوں کو ضائع ہوتے دیکھا ہے، مولوی اسحاق خاں بھی سالہا سال...... اس خطرہ سے دوچار ہوئے، وہ خود اپنی اس کمزوری یا آزمائش کو سمجھتے تھے، ان کے خطوط میں اس کا بہ کثرت اظہار اور اس کا شکوہ ہے، اس کی وجہ سے وہ زندگی کے مختلف نشیب وفراز سے گزرے، متعدد اور بعض اوقات متضاد میدان اختیار کئے اور اگرچہ اپنی ذہانت، قوت عمل اور خلوص کی وجہ سے ہر میدان میں انھوں نے کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل کی اور اپنے رفقاء میں وہ جلد ہر دلعزیز بن گئے لیکن ان کی طبیعت کو سکون حاصل نہ ہوا، لیکن ایک اطمینان کی بات یہ تھی کہ ان میں فطری طور پر سعادت تھی اور انھوں نے مجھ سے مستقل رابطہ قائم رکھا اور یہ طے کر لیا کہ وہ میرے مشورے اور حکم پر عمل کریں گے۔

دارالعلوم کی چھٹیوں میں وہ احمد نگر جاتے تھے، وہ اپنے والد ماجد کے بدستور نہایت سعید فرزند تھے، ان کے حکم کی حتی الامکان تعمیل کرتے تھے اور ان کے فرائض منصبی میں بھی ہاتھ بٹاتے تھے۔ ۱۳/ رمضان المبارک ۸ کے ۱۳ھ (۱۹۵۸ء) کے ایک خط میں انھوں نے اطلاع دی ہے کہ وہ فوجی سنٹر کی مسجد میں تراویح کے بعد درس حدیث دیتے ہیں، جس میں نمازی جو تمام تر فوجی ہیں، دلچسپی سے شریک ہوتے ہیں، ہفتہ میں ایک بار تقریر کا پروگرام ہوتا ہے جس میں مسلمان فوجی سپاہیوں اور افسروں کے علاوہ، ہندو، سکھ سپاہی اور آفیسر بھی شریک ہوتے ہیں، طرز "پیام انسانیت" کا ہوتا ہے، تبلیغی کام بھی جاری ہے۔

یہ چھ صفحے کا ایک طویل خط ہے جس سے اظہار ہوتا ہے کہ ان کو اپنی خامیوں کا شدید احساس اور ان پر سخت گھٹن ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ "ان باتوں پر غور کر کے اب

مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ندوہ پہنچائے تو اپنے آپ کو آپ کے حوالہ کردوں گا، والد صاحب نے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دے دی ہے، میں آپ کی علمی رہنمائی اس سے بھی زیادہ آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کا متمنی ہوں''۔

میں نے جواب میں لکھا کہ دارالعلوم کے طلباء کی بڑی تعداد میں آپ پر خصوصیت کی نگاہ پڑتی تھی، اور ہمیشہ چاہا کہ آپ کی ذہنی صلاحیت پرورش پائے اور اس سے آپ بھی فائدہ اٹھائیں اور ملت کو بھی اس سے فائدہ اور فیض پہنچے۔

۱۹۵۹ء میں ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' دارالعلوم میں قائم ہوچکی تھی جس کا بڑا مقصد جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے رابطہ پیدا کرنا، اس کے لیے مؤثر ودلآویز اسلامی لٹریچر، انگریزی اردو اور علاقی زبانوں میں شائع کرنا اور اس ''ذہنی اور تہذیبی ارتداد'' کے خطرہ کا مقابلہ کرنا تھا، جس کی نشاندہی بڑی وضاحت وقوت کے ساتھ راقم نے اپنے عربی رسالہ "ردة ولا أبابكر لها" میں کیا تھا اور جس کا اردو ترجمہ ''نیا طوفان اور اس کا مقابلہ'' اور انگریزی ''THE NEW MENACE AND ITS ANSWER'' کے نام سے شائع ہوا، اس مجلس میں آفس سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے اپنے حلقہ وفضلائے دارالعلوم میں مولوی اسحاق خان سے زیادہ کوئی موزوں نظر نہیں آیا، ان کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی، ۱۹۶۱ء سے انھوں نے اسی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا، اور اچھی صلاحیت کا اظہار کیا، لیکن ان کی ذہنی کشمکش (جس کو ان کے خانگی حالات، زندہ ومتحرک کرتے رہتے تھے) دور نہ ہوئی، ان کو خود بھی اس کا احساس تھا کہ ان کی طبیعت عجلت پسند اور انقلابی واقع ہوئی ہے، اسی کے ساتھ ان کو تعلق مع اللہ اور قلب کی اصلاح کی اہمیت کا بھی احساس رہا، اس کشمکش سے وہ ایک مرتبہ مغلوب ہوکر کوئی لمبی چھٹی لے کر احمد نگر چلے گئے اور وہاں کے قیام پر غور کرنے لگے، میں نے ۲ رفروری ۱۹۶۲ء کو کویت سے ان کے نام جو خط لکھا ہے، اس میں یہ جملے آئے ہیں۔

''آپ کی صلاحیتوں کا مجھے پورا احساس ہے، اس لیے آپ کو چھوڑنا نہیں، اور آپ کے

احمد نگر کے مستقل قیام سے ہمیشہ اختلاف کرتا رہا، آپ مایوسی اور احساس کہتری کو دور کریں۔

برخود نظر کشاز تہی دامنی مرنج
در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

انھوں نے اس کے جواب میں لکھا:۔

''شفقت نامہ نے سرفراز کیا، برخود نظر کشاز تہی دامنی مرنج الخ... کو انجمن الاصلاح کے ایک کتبہ میں بارہا پڑھا تھا، مگر حضرت والا کے عنایت نامہ میں اس حیات بخش پیغام کو دیکھ کر اثر ہی کچھ اور ہوا۔ اور ''بنا ہے شہ کا مصاحب'' کی سی کیفیت طاری ہوگئی''۔

لیکن ان میں قوت فیصلہ کی کمی تھی اور متضاد حالات کا شکار تھے جس نے ان کی قوت ارادی کو کمزور کردیا تھا، غالباً مئی ۱۹۶۳ء تک وہ احمد نگر ہی رہے جون ۱۹۶۳ء میں پھر مجلس آگئے اور آفس سکریٹری اور لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام شروع کردیا، اس عرصہ میں ان کے والد صاحب نے جو ضعیف ہوگئے تھے اور بیمار رہنے لگے تھے اپنی جگہ ان کے لیے فوج میں مستقل ملازمت کی کوشش کی اور اس کی ضرورت ومنافع بتاتے ہوئے مجھے ایک طویل خط لکھا، میں اس کو ایسے باصلاحیت انسان کے حق میں خودکشی کا مرادف سمجھتا تھا اور مولوی اسحاق صاحب کا رجحان بھی نہ تھا، میں نے ان کے والد صاحب کو ۲۶ راگست ۱۹۶۳ء کو خط لکھا جس میں اس سے اختلاف ظاہر کیا اور موصوف سے درخواست کی کہ وہ ان کو اسی لائن میں رہنے دیں جس میں وہ ہیں، میں نے لکھا کہ:۔

''عزیز موصوف کو اللہ نے بڑی اچھی علمی وذہنی صلاحیت عطا فرمائی ہے، اور وہ اسی کام کے اہل ہیں جو وہ کررہے ہیں، آپ جو ملازمت ان کے لیے تجویز کررہے ہیں اس میں ان کا کامیاب ہونا مشکل ہے اور وہ ہمیشہ ذہنی انتشار میں مبتلا رہیں گے''۔

لیکن وہ اپنی اسی ذہنی کشمکش اور قوت فیصلہ کی کمی کی وجہ سے مجلس سے تعلق کو زیادہ دن قائم نہ رکھ سکے اور پھر احمد نگر پہنچ گئے، لیکن وہاں جاکر بھی مطمئن نہیں ہوئے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''احمد نگر میں تو قیام کا ارادہ نہیں، کیوں کہ چھوٹا شہر ہے اور اختلافات کی کثرت، پونا یا بمبئی کا خیال ہے، ان دونوں مقامات پر صحافتی کام اور ہائی اسکول یا کسی اردو میڈیم کالج میں کوئی کام کیا جا سکتا ہے، اگر ممکن ہوا تو بمبئی سے ڈائجسٹ کے اجراء کا جائزہ لینے کا خیال ہے۔

قربت و تعلق سے محرومی کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے لکھنے پڑھنے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں گویا سلب ہوگئی ہیں''۔

پونہ کے زمانۂ قیام میں انھوں نے اپنی انگریزی استعداد بڑھائی اور مارچ ۱۹۷۰ء میں سکنڈری اسکول سرٹیفیکٹ اکزامنیشن پاس کرلیا۔

۱۹۷۰ء میں وہ اپنی دیرینہ خواہش کے مطابق پونا منتقل ہوگئے اور وہاں لیڈی حوا بائی گرلس اسکول میں ملازمت کرلی لیکن وہاں سے بھی وہ اپنے خطوط میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے رہے اور ان کو ہمیشہ یہ خیال تکلیف دیتا رہا کہ انھوں نے میرے مشورے اور منشاء کے خلاف عمل کیا اور اپنی لائن بدل دی ہے، اس سلسلہ میں وہ مجھے برابر خط لکھتے اور اس طرح اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے رہے، بالآخر اُن کو میں نے ایک مفصل خط لکھا جس میں ان کی ان ذہنی آزمائشوں کا صفائی سے ذکر کیا جو اُن کے لیے پریشانی کا باعث اور ترقی کی راہ میں مانع بنی ہوئی ہیں، اس خط کا ایک اقتباس درج ذیل ہے اس لیے بھی وہ نقل کیا جارہا ہے کہ وہ گوناگوں صلاحیتیں رکھنے والے بہت سے بے چین نوجوانوں اور ''تازہ واردانِ بساطِ عمل'' کے لیے مفید ہوسکتا ہے۔ میں نے لکھا کہ:۔

''آپ کی دقت اور آزمائش یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں وہ ایک وسیع عملی و دینی ماحول کی طالب ہیں اور آپ اپنی بے چین طبیعت اور ذکاوت حس کی وجہ سے اس ماحول کی وقتی مشکلات اور فطری مرحلوں پر (جو عبوری ہوتے ہیں) صبر نہیں کر پاتے، اگر آپ عجلت

میں یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ نہ کرتے تو اس وقت تک بہت مفید کام
انجام دے چکے ہوتے، بہر حال جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا، اب عزم و فیصلہ کے
ساتھ اپنے کسی بہی خواہ اور واقف کار پر اعتماد کریں جو آپ کی صلاحیتوں
سے واقف بھی ہو اور آپ کے اندر فیصلہ کرنے اور حالات کا مقابلہ کرنے
کی جو کمی ہے اس کو پورا کر سکے اور زمامِ کار اس کے حوالہ کر دیں ع

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ"

احمد نگر کے اس قیام کے زمانہ میں وہ خاص خاص موقعوں پر لکھنؤ آتے رہے، کچھ دن قیام کرتے اور اس زمانۂ قیام کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے، جس سے ان کی تنظیمی وتحریری صلاحیت کا ایسا اظہار ہوتا کہ پھر منھ میں پانی بھر آتا کہ یہ ادارے اور جماعت سے منسلک رہیں اور اپنی صلاحیتوں کو ایک ہدف اور نشانہ پر لگائیں، اگست ۱۹۶۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مسلم مجلس مشاورت کا تاسیسی تاریخ ساز اجلاس منعقد ہوا جس کو ہندوستان کی ملت اسلامی کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مولوی اسحاق صاحب نے اس کے انتظامات میں مدد کی، پھر اس جلسہ کی کارروائی اور اس کی تصویر کشی اتنی خوبی اور کامیابی سے کی کہ ان کی صحافتی اور تحریری صلاحیت نمایاں ہو کر سامنے آ گئی، اس میں صرف ان کی تحریری صلاحیت ہی کا اظہار نہ تھا، ان کا جذبہ بھی شامل تھا جس نے اس میں جان ڈال دی تھی۔

اسی زمانہ میں وہ پونا سے ایک موقر و معزز وفد لے کر لکھنؤ آئے، جس نے پورا سفر کار سے طے کیا تھا، اور جس میں شہر کے اچھے قومی ملی کام کرنے والے فعال اور صاحب فکر مسلمان تھے، مقصد یہ تھا کہ شمالی ہند کے مسلم رہنماؤں بالخصوص مجلس مشاورت کے ذمہ داروں سے مل کر راہ عمل دریافت کی جائے اور کام کا پروگرام معلوم ہو، اس وفد نے لکھنؤ اور دہلی کا سفر کیا، اس کے روح رواں مولوی اسحاق صاحب ہی تھے۔

پونا کے دورانِ قیام میں وہ شہر کی قومی، سیاسی اور تعلیمی زندگی اور تحریکوں میں نہ صرف دخیل رہے بلکہ پیش پیش، وہ جس اسٹیج پر پہنچ جاتے اور جس پلیٹ فارم سے خطاب

کرتے چھا جاتے، اُردو اور مراٹھی زبان پر قدرت، بیچ بیچ میں انگریزی زبان سے مدد لینا، حالات حاضرہ سے واقفیت، ملک کی سیاسیات میں خود اپنا مطالعہ اور ذاتی خیال، پھر سب سے بڑھ کر خلوص اور جوش، پورے جلسہ پر حاوی ہو جاتے اور اکثر جلسہ کو لوٹ لیتے۔

لیکن ان سب مشغولیتوں اور کارگزاریوں کے ساتھ ان کا دل اندر سے مطمئن نہ تھا اور ان کو یہ محسوس ہوتا رہتا تھا کہ جیسے انھوں نے میدانِ جنگ سے فرار اختیار کیا ہے یا اپنے گھر سے روٹھ کر آ گئے ہیں، اس ۱۹۷۱ء کے اوائل سے دار العلوم کے کارکنوں پر خاص طور پر مجھ پر اس خیال کا غلبہ ہوا کہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کی جدید تنظیم کی جائے اور اس کے لیے لائبریری سائنس کے کسی ایسے واقف کار سے مدد لی جائے جو مشرقیات، و دینیات کے کوچہ سے بھی نابلد نہ ہو، ادھر ندوۃ العلماء کا اُردو ترجمان "تعمیر حیات" دینی حلقوں میں مقبول ہوتا جا رہا تھا، لیکن اس کو ابھی تک کوئی ایسا مستقل ایڈیٹر نہیں ملا تھا جو اس کو مستقل مزاجی اور انہماک کے ساتھ چلائے، اس کے لیے بھی مولوی اسحاق صاحب ہی پر نظر پڑی جو ایک پیدائشی صحافی اور ایڈیٹر تھے، پھر ندوۃ العلماء کی تحریک کے بہترین ترجمان بھی، چنانچہ ان سے اس سلسلہ میں خط و کتابت شروع کی گئی، ادھر وہ بھی گرلس اسکول کی ٹیچری سے غیر مطمئن اور خائف تھے، فروری ۱۹۷۱ء سے پھر ان سے مراسلت شروع ہوئی، میں نے ان کو ایک خط میں مفتی صدر الدین خاں آزردہ کا وہ مشہور شعر لکھ دیا جو مجھے بہت محبوب ہے اور میں اس کو اپنے بہت سے خطبات و مقالات میں پیش کر چکا ہوں۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

غالباً اسی سے متأثر ہو کر انھوں نے لکھنؤ آنے کا فیصلہ کر لیا اور یہ لکھ دیا کہ میں تجویز کردہ دونوں خدمات انجام دوں گا، اسی کے ساتھ انھوں نے صلاح لینے کے لیے یہ بھی لکھا کہ میں لائبریری سائنس کا ایک کورس لے چکا ہوں، اگر اجازت ہو تو اس کو مکمل کر لوں تا کہ کتب خانہ کے کام کے لیے زیادہ مفید بن سکوں، میں نے اپنے ۲۵ / مارچ

۱۹۷۱ء کے خط میں ان کو لکھا کہ آپ لائبریری سائنس کا کورس ضرور پورا کر لیں، وہ ہمارے ہی کام کی ایک کڑی ہے۔

اتفاق سے اپریل ۱۹۷۱ء میں خود پونا کا ایک سفر پیش آگیا، جو غالباً انھی کی تحریک و دعوت پر تھا، وہاں ان کے اثرات، مقبولیت اور افادیت کو دیکھ کر میں خود تردد میں پڑ گیا کہ ان کو لکھنؤ بلانا اور اس ماحول اور حلقہ کو جس میں وہ بہت مفید کام انجام دے رہے ہیں، ان سے محروم کر دینا صحیح ہوگا؟ لیکن پھر اندازہ ہوا کہ وہ لکھنؤ میں زیادہ مفید اور وسیع تر کام انجام دے سکتے ہیں، اور ان کی قدرتی جگہ وہیں ہے، درمیانی راہ یہ سمجھ میں آئی کہ فی الحال ان کو طویل چھٹی پر عارضی طور پر لکھنؤ بلایا جائے، پھر اگر ان کا جی لگ جائے اور یہ تجربہ کامیاب ہو تو وہ مستقل آجائیں، چنانچہ انھی کے مشورہ سے ۲۱ر جولائی ۱۹۷۱ء کو لیڈی حوا بائی گرلس ہائی اسکول کے صدر سلیمان یوسف صاحب کو خط لکھا جس میں ان سے درخواست کی کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے ان کی خدمات کو ہمارے ادارہ کو منتقل کر دیں، یہ کوشش کامیاب ہوئی اور وہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کو لکھنؤ آ گئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ دن نہیں رہ سکے، دسمبر ۱۹۷۱ء میں پھر پونا چلے گئے۔

پونا کے دورانِ قیام میں انھوں نے کئی مفید کام انجام دیئے، مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک پر ایک بڑا الزام تھا کہ خود مسلم خواتین اس کے ساتھ نہیں ہیں، وہ خود ان معاشرتی نظام اور قانون نکاح وطلاق میں ترمیم وتبدیلی چاہتی ہیں، مشہور تجدد پسند اور باغی عبدالحمید دلوائی نے مسلم خواتین کا ایک اجتماع بھی کیا، جنھوں نے اس کا مطالبہ کیا اور موجودہ مسلم پرسنل لا سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا، ضرورت تھی کہ اس کی عملی تردید کی جائے اور اس کو چیلنج کیا جائے اور ثابت کیا جائے کہ مسلمان خواتین اپنے مذہبی، معاشرتی قوانین پر پورا عقیدہ رکھتی ہیں، اس سے وابستہ رہنا چاہتی ہیں، اور اس میں کسی ترمیم و تنسیخ کی خواستگار نہیں ہیں، مولوی اسحاق صاحب نے اپنے رفقاء واحباب کے ساتھ خواتین کے ایک جلسہ کا انتظام کیا جو بہت کامیاب رہا جس میں ہزاروں خواتین نے شرکت کی اور یہ ثابت ہوگیا کہ مسلم خواتین

میں سے جنھوں نے اختلاف ظاہر کیا تھا ان کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔

۱۴؍جنوری ۱۹۷۲ء کے میرے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پونا میں ہیں اور کتب خانہ کی تنظیم اور ''تعمیر حیات'' کے لیے پھر ان کو بلایا جا رہا ہے، اس مراسلت کے نتیجہ میں وہ یکم رمضان ۱۳۹۲ھ (۱۰؍اکتوبر ۱۹۷۲ء) کو کتب خانہ کی تنظیم کا کام شروع کرنے کے لیے لکھنؤ آ گئے اور تقریباً تین مہینہ ٹھہر کر اس کام کو آندھی پانی کی طرح انجام دیا، طلبہ کی ایک ٹیم ان کے ساتھ ہوتی تھی، دیر گئے رات تک وہ اسی کام میں منہمک رہتے اور اپنی صحت وراحت کا بالکل خیال نہ کرتے، طلباء بھی ان کے ساتھ سب کچھ بھولے رہتے۔

بالآخر اس خواب کی تعبیر پوری ہوئی اور انھوں نے مئی ۱۹۷۳ء میں مستقل طور پر کتب خانہ اور ''تعمیر حیات'' کا چارج لے لیا، لائبریری سائنس کا کورس انھوں نے پورا کر لیا تھا اور اس میں بھی وہ لکیر کے فقیر نہیں تھے، کتب خانہ کی نوعیت اور علوم مشرقیہ کے مزاج اور تقاضا کے مطابق انھوں نے جدت واجتہاد سے کام لیا اور اسی کے مطابق کارڈ بنوائے اور کتب خانہ کو آراستہ کیا، دوسری طرف انھوں نے ''تعمیر حیات'' کی طرف توجہ کی، صحافت ان کا پسندیدہ مشغلہ اور ہابی (Hobby) تھی، اس لیے بہت جلد اس میں ایک نئی روح اور نئی زندگی پیدا ہو گئی، اس کام میں محمد میاں (جن کو قلم ہمیشہ سلّمہٗ لکھنے کا عادی تھا اور اب مرحوم لکھنے کا عادی ہو رہا ہے) ان کے معاون اور دست راست تھے، پرچہ پر بحیثیت ایڈیٹر کے شروع سے انھی کا نام آ رہا تھا، لیکن عملاً اب مولوی اسحاق صاحب اس کے مدیر مسئول تھے، دونوں میں بڑا اتحاد مذاق تھا، دونوں کا ذہن نئی نئی تجویزیں سوچتا اور نئی نئی روشیں نکالتا تھا، دونوں کا ذہن وسیع طباع اور ''تخلیقی'' تھا، اس لیے دونوں میں خوب بنی۔

کتب خانہ اور ''تعمیر حیات'' کے علاوہ مولوی اسحاق صاحب نے طلبہ سے رابطہ پیدا کیا، یہ بھی ان کی دلچسپی اور شوق کا خاص میدان تھا، نوجوانوں کی تنظیم، ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا، ان کو متحرک بنانا ان کے لیے بہت آسان تھا، ان دونوں دوستوں مولوی اسحاق خاں اور محمد میاں (جن کو سفر آخرت میں بھی ایک دوسرے کی رفاقت اور آگے پیچھے

جانا تھا) دارالعلوم میں نئی زندگی، نیا ولولہ، طلبہ میں خودداری اور اپنی درس گاہ پر فخر وناز (Sence of Pride) پیدا کرنے کی نئی نئی تدبیریں سوچتے، اسی سلسلہ میں ان کو خیال ہوا کہ دارالعلوم کا ایک ترانہ ہونا چاہیے اور طلبہ کی ایک خاص وردی، دوسری چیز تو بعض مشکلات کی بنا پر نہ چلی، لیکن ترانہ کی میں نے منظوری دے دی اور عزیزی محمد ثانی نے جن کو فطرت سے طبع موزوں اور شاعری کا ملکہ ملا ہے، ایک بڑا ولولہ انگیز ترانہ نظم کر دیا، اس کے پڑھنے کا طریقہ (Tune) بھی مولوی اسحاق صاحب نے ہی بنایا، جن کو اس میں بھی بڑا دخل تھا، اس وقت سے یہ ترانہ طلباء کے جلسوں میں پڑھا جاتا ہے، ندوہ کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے موقع پر جب طلبہ کی ایک جماعت نے اپنے خاص انداز میں یہ ترانہ پڑھا تو جلسہ پر ایک کیف طاری ہو گیا، عرب اور غیر ملکی مہمان جو اُردو نہیں سمجھتے تھے، وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، یہ ترانہ ایسا مقبول ہوا کہ بعض دوسری جامعات اور مدارس نے بھی اپنی تعلیم گاہوں کے لیے ترانے کہلوائے اور مدارس عربیہ میں اس کا رواج ہوا۔

ستمبر ۱۹۷۴ء کے آخر میں ''پیام انسانیت'' کی تحریک شروع ہوئی، اس مہم کا آغاز دسمبر ۱۹۷۴ء میں الہ آباد میں کیا گیا، یہ تحریک مولوی اسحاق صاحب کی فطری صلاحیتوں اور ذہنی ساخت کے بالکل مطابق تھی اور وہ گویا اصلاً اسی کے لیے پیدا کیے گئے تھے، وہ ملک کے حالات سے بہت باخبر، ہر طبقہ کی نفسیات سے واقف اور غیر مسلم تعلیم یافتہ نوجوانوں اور سیاسی کارکنوں کے بہت قریب رہے تھے، ان کو ملک کی تیزی کے ساتھ گرتی اور بگڑتی ہوئی اخلاقی حالت کا پورا اندازہ تھا، ان کو کام کا ایک پسندیدہ میدان اور کام کو ایک لائق اور پُر جوش ترجمان مل گیا، اور ان کی دبی ہوئی صلاحیتیں اور جوہر اُبھر کر سامنے آ گئے، وہ بہت جلد اس موضوع پر بہت اچھی تقریر کرنے لگے کہ سارا مجمع ان کا ہم نوا اور ان کا گرویدہ ہو جاتا، کسی طبقہ کے لوگ اور کسی سطح کے سامعین ہوتے ان کی تقریر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے، ملک کی صورت حال کی تصویر کشی اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی کہانی ہندی اور انگریزی الفاظ اور جملوں کا برمحل استعمال، ان کی تقریر میں خاص دلآویزی پیدا کر دیتا

اور اس کو مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لیے قابل فہم اور دلچسپ بنادیتا، یہاں بھی وہ اور محمد میاں دونوں ایک دوسرے کے کلی طور پر ہم خیال اور شریک حال تھے، دونوں نے مل کر وہ حلف نامہ تیار کیا جو ہر طبقہ پر حاوی اور ہمہ گیر ہے، تحریک کا تعارف کرانے میں بھی دونوں کا قلم یکساں رواں دواں تھا۔

اب اس سلسلہ کے دورے شروع ہوئے، ان دوروں میں بھی مولوی اسحاق صاحب کا دماغ، زبان، دل اور قوت عمل اپنے نقطۂ عروج پر تھی، جہاں پہنچتے آبادی کے مختلف طبقوں، دانش گاہوں، وکلاء و پروفیسران اور سیاسی کارکنوں سے رابطہ پیدا کرتے، مختلف صحبتوں، نشستوں اور عام جلسوں کا پروگرام بناتے، تحریک کے تعارف اور اس کی ضرورت پر سب سے پہلے ان کی تقریر ہوتی اور اکثر اوقات ایسی کافی وشافی کہ اس کے بعد حقیقتاً کسی تقریر کی ضرورت نہ رہتی، کئی بار ایسا ہوا کہ ان کی تقریر سن کر سمجھ میں نہ آیا کہ اب اس کے بعد کیوں تقریر کی جائے، میں نے مراد آباد کے ایک جلسہ میں ایسے ہی ایک موقع پر کہا کہ یہ کوئی مشاعرہ نہیں ہے جس میں ہر شاعر کو اپنی غزل پڑھنی ضروری ہے کہ اس میں محنت کی ہے، مولوی اسحاق صاحب کی اس تقریر کے بعد کسی تقریر کی ضرورت نہیں ہے، میں تقریر سے بالکل معذرت کر دیتا لیکن اس خیال سے کچھ کہے دیتا ہوں کہ میرے نام کی تشہیر کی گئی ہے، اندیشہ ہے کہ بلانے والوں اور جلسہ کا انتظام کرنے والوں پر دروغ گوئی یا فریب دہی کا الزام نہ لگایا جائے۔

اس سلسلہ میں پہلا طویل دورہ مالوہ (مدھیہ پردیش) کا ہوا جو ۳۰ر نومبر ۱۹۷۷ء سے شروع ہو کر ۱۰ر دسمبر ۱۹۷۷ء کو ختم ہوا، اس دورہ کے مقامات میں بھوپال، اندور، دھار، دیپالپور، اجّین مہو تھے، ہر جگہ تحریک کا بڑا استقبال ہوا، اندور کا ٹیگور کلب اور بار ایسوسی ایشن کا جلسہ حاضرین کی دلچسپی وسکون کی حیثیت سے ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے، اس سفر میں محمود خلجی، غیاث الدین اور ناصر الدین خلجی اور ہوشنگ شاہ کے پایۂ تخت اور نویں صدی کے شادی آباد یعنی مانڈو کی سیر کا بھی موقع ملا، مولوی اسحاق صاحب نے واپس آنے

کے بعد مالوہ کے سفر کی سرگزشت ایسے ادیبانہ ومؤرخانہ انداز میں لکھی کہ وہ خاصہ کی ایک چیز اور ایک ادبی وتاریخی مضمون بن گیا(۱)

دوسرا معرکہ کا سفر ہریانہ اور پنجاب کا ہوا جو ۲۱/مارچ ۱۹۷۸ء سے ۳۱/مارچ ۱۹۷۸ء تک جاری رہا، بہت سی حیثیتوں سے یہ دورہ اہم بھی تھا، نازک بھی اور اس میں مہم جوئی اور خطر پسندی کی روح بھی کام کر رہی تھی، ہم ایک ایسی سرزمین میں انسانیت واخوت کا پیام لے کر جارہے تھے جہاں ۳۰، ۳۲ سال پہلے خون کی ہولی کھیلی گئی تھی، قسمت سے یہ ہولی ہی کا زمانہ تھا اور اس کا خطرہ تھا کہ کسی ناگوار اور دشوار صورت حال سے واسطہ نہ پڑے، لیکن توقع اور اندازوں کے خلاف اس دورہ میں اس تحریک کا (خاص طور پر غیر مسلم طبقہ کی طرف سے) سب سے بڑا استقبال ہوا، سکھ وہندو حضرات نے جلسوں کی صدارت کی، اپنے گھروں فارموں اور سردار صاحبان (جن کی کبھی یہاں حکومت رہ چکی تھی) اپنے قلعوں میں لے گئے چندی گڑھ کے جلسہ میں جس کی صدارت ڈویژن کے کمشنر صاحب نے کی جو تعلیم یافتہ اور کتابوں کا مطالعہ کرنے والے ہندو فاضل تھے، ہزاروں کا مجمع تھا، دوبار بجلی چلے جانے اور ایک بار مائک فیل ہوجانے کے باوجود اپنی جگہ سے کسی نے حرکت نہیں کی، جس پر خود صدر صاحب نے اپنی حیرت واستعجاب کا اظہار کیا، اگر کوئی مسلمان اٹھتا تو ہندو اور سکھ بھائی بٹھاتے اور کہتے کہ کہاں جارہے ہو، بیٹھو اور سنو، بعض غیر مسلم سامعین کی زبان سے سنا گیا کہ دیکھو مسلمان ایسے ہوتے ہیں، غرض فضا خوشگوار اور ہوا کا رُخ موافق، جمنا نگر (سابق عبداللہ پور) جوگادری، سرہند، مالیر کوٹلہ، سادھوڑا، بوڑیا اور چندی گڑھ اس کی اہم منزلیں تھیں، اس کے علاوہ اندرون علاقہ (Interior) پہاڑی حصوں اور قصبات ودیہاتوں میں جانا ہوا، جہاں رائے پور (ضلع سہارن پور) کی روحانی مرکز وخانقاہ اور خاص طور پر مرشدنا حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری کی تحریک ومساعی جمیلہ کے نتیجہ میں مدارس، مکاتب اور ذکر وعلم کی بچی کچھی فضائیں قائم تھیں، اور وہاں یہ شعر یاد آجاتا تھا کہ ؎

---

(۱) امید ہے کہ یہ ایک علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع ہوجائے گا۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

بہرحال یہ سفر کام کے نئے میدانوں اور آفاق کو کھولنے والا ہمت وشوق کو بڑھانے والا اور یاس وناامیدی کے بادلوں کو چھانٹنے والا تھا، اور وہاں کی فضا زبانِ حال سے گویا تھی کہ ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف
بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

۱، ۲، ۳، ۴؍دسمبر ۱۹۷۸ء کو مرادآباد کا کامیاب دورہ ہوا، مدرسہ امدادیہ اور ٹاؤن ہال میں بڑے کامیاب جلسے ہوئے، اس دورہ میں شہر کے غیر مسلم حضرات اور شہر کی خدمت اور سیاسی کام کرنے والے ہندو صاحبان نے بڑی دلچسپی لی، مدرسہ امدادیہ کے جلسہ میں مولوی اسحاق صاحب کی بڑی طاقتور اور مؤثر تقریر ہوئی، انھوں نے آگرہ کا بھی ایک دورہ کیا اور وہاں کے کالج میں اعلیٰ تعلیم یافتہ، ہندو وعیسائی معززین اساتذہ اور طلباء کے سامنے ایسی تقریر کی کہ عرصہ تک اس کا شہر میں چرچا رہا اور جب دسمبر ۱۹۷۸ء میں میرا اپنے رفقاء کے ساتھ آگرہ جانا ہوا تو اس کا ذکر اور تعریف سنی۔

دسمبر ۱۹۷۸ء راجستھان کے دورہ میں میرے جبلپور پہنچنے سے پہلے ان کی جے پور کے ایک جلسہ عام میں بڑی زوردار تقریر ہوئی جس نے شہر کی فضا کو "پیام انسانیت" کے کام کے لیے ہموار وتیار کر دیا، اس سفر میں جے پور، اجمیر اور جودھ پور جانا ہوا، کرناٹک کا ذکر تو ہم آخر میں کریں گے جو اُن کے سفر آخرت کی تمہید تھی، اس سلسلہ کو یہیں چھوڑتے ہوئے عنانِ قلم کو ہم ان کی خداداد صلاحیت وقوتِ عمل کے ایک دوسرے میدان کی طرف موڑتے ہیں۔

۳۱؍اکتوبر-۳؍نومبر ۱۹۷۵ء کو ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ تعلیمی جشن منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا اور بھوپال سے جہاں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا جلسہ ہو رہا تھا اس کی تیاری کی مہم شروع کی گئی، مولوی اسحاق صاحب کو گویا اپنی محنت وذہانت، تنظیمی سلیقہ اور تزئین وآراستگی کی قابلیت کے اظہار کا ایک نیا اور وسیع میدان مل گیا، اس تاریخی اجلاس میں جشن

میں پہلی مرتبہ ممالک عربیہ کے ممتاز فضلاء، ماہرین تعلیم، جامعات کے سربراہ (وائس چانسلر) ارکانِ حکومت اورارباب فکر بڑی تعداد میں آرہے تھے، اس کی صدارت عالم اسلام کی سب سے بڑی اور قدیم ترین دانش گاہ کے صدر شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کرنے والے تھے اور خود ہندوستان کے فضلاء اوردانشوروں اور سربرآوردہ مہمانوں کی ایک بڑی تعداد کے شریک ہونے کی توقع تھی، ایک علمی وتاریخی نمائش کا فیصلہ کیا گیا جس میں ملت اسلامیہ ہندیہ کی ہزار سالہ علمی و تصنیفی کارگزاری، اس کی ذہنی شادابی اور زرخیزی، علوم اسلامیہ میں اس کے مجددانہ ومجتہدانہ کردار کی روداد مشکّل ومصوّر شکل میں پیش کرنی تھی اور نقشوں، کتبوں اور چارٹس کے ذریعہ اس تاریخ کا ابھرا ہوا خاکہ نگاہوں کے سامنے پیش کرنا تھا، یہ مشکل اور طویل کام جس کے لیے اب وقت بہت کم رہ گیا تھا مولوی اسحاق صاحب کے ذمہ کیا گیا اور وہ اپنی افتادِ طبع اور معمول کے مطابق جن کی طرح اس سے لپٹ گئے، انھوں نے حسب معمول اونچے درجے کے متعدد طالب علموں کو اپنے ساتھ لے لیا جن میں مولوی نظام الدین رانچوی ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور مہینوں کا کام دنوں میں کر ڈالا، انھوں نے کتب خانہ ندوۃ العلماء کے وسیع اور خوبصورت ہال کو ایسا آراستہ کیا کہ ؎

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

ممالک عربیہ کے فضلاء اور ہندوستان کے اہل ذوق واہل نظر ایک ایک نقشہ کے سامنے کھڑے ہوتے اور ہزاروں صفحات کا عطر ایک صفحہ میں دیکھ لیتے، یہ نمائش جواب بھی اس ہال کی زینت ہے، ان کی قوتِ عمل، حسن تنظیم، مذاق سلیم اور ساتھیوں سے کام لینے کی شاہدِ عادل ہے، اور یہ ان کی ایک ایسی یادگار ہے جو عرصۂ دراز تک ان کی خداداد صلاحیتوں کا اعلان کرتی رہے گی، اس نمائش کے علاوہ بھی انھوں نے دارالعلوم کی آراستگی، نمائش کے لیے صحیح کتبوں اور تحریروں کے صحیح انتخاب میں بنیادی حصہ لیا، اس میں ان کے شریک کار اور مشیر ومعاون حسب معمول محمد میاں مرحوم ہی تھے۔

ایک اور اہم کام بھی میں نے مولوی اسحاق صاحب کے سپرد کیا تھا اور وہ اس کی

تکمیل میں آخر تک مشغول رہے، وہ ''تاریخ تحریک ندوۃ العلماء'' کی ترتیب تھی، ندوۃ العلماء کی تاریخ ساز تحریک کی خود تاریخ ابھی تک نہیں لکھی گئی تھی، اس کا قیمتی مواد جلسوں کی رودادوں، مجلس انتظامی کی کارروائی کے رجسٹروں ''حیات شبلی'' تذکرہ مولانا محمد علی مونگیری'' اور ''حیات عبدالحی'' کے اوراق میں منتشر ہے، مولوی اسحاق صاحب نے از خود ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں کی تصویر کشی اور اہم تجاویز کو ''تعمیر حیات'' کے صفحات میں پیش کرنا شروع کر دیا تھا، میں نے ان کو رائے دی کہ اس کے بجائے وہ تحریک ندوۃ العلماء کی مکمل و مفصل تاریخ مرتب کریں، انھوں نے یہ کام شروع کر دیا اور اپنی افتادِ طبع کے مطابق اپنی صحت وراحت کا خیال کئے بغیر اس میں منہمک ہو گئے، اس کے لیے انھوں نے سیکڑوں، بلکہ ہزاروں متعلق صفحات پڑھے، تحریک کا پس منظر تفصیل کے ساتھ دکھایا، اور ہندوستانی مسلمانوں کی کہانی ۱۸۵۷ء بلکہ اس سے پیشتر کی اصلاحی و تجدیدی تاریخوں سے شروع کی لیکن افسوس ہے کہ ان کا قلم مولانا محمد علیؒ کے دور نظامت اور ان کی کنارہ کشی اور نئے دور کے آغاز تک پہنچا تھا کہ خود ان کی زندگی کا ورق اُلٹ گیا، اور یہ کام پہلی جلد پر ختم ہو کر نامکمل رہ گیا، لیکن یہ ایک جلد بھی ان کی محنت، حسن ترتیب اور سلیقۂ تصنیف کی گواہ ہے اور انشاء اللہ وہ ان کی ایک اچھی تصنیفی یادگار بن کر باقی رہے گی۔ (۱)

نومبر ۱۹۷۶ء میں انھوں نے مولوی سعید الرحمٰن صاحب ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء اور مدیر ''البعث الاسلامی'' کے ساتھ سعودی عرب کا سفر کیا، انھوں نے ریاض کی مؤتمر الفقہ میں جو جامعۃ الامام محمد بن سعود کی طرف سے منعقد ہو رہی تھی شرکت کی، حج و زیارت سے مشرف ہوئے، پھر مولوی سعید الرحمٰن صاحب کے ساتھ کویت اور خلیج کی امارات کا سفر کیا، دسمبر کے آخری ہفتہ میں ابوظبی میں میرا ان کا ساتھ ہوا، جہاں میں عزیزی مولوی محمد واضح ندوی کے ساتھ امارات کے دورہ پر گیا ہوا تھا، اچھی اچھی مجلسیں اور کامیاب

---

(۱) یہ کتاب جلد انشاء اللہ زیور طبع سے آراستہ ہوگی، دوسری جلد کی ترتیب کا کام مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے فاضل رفیق مولوی شمس تبریز خاں کے سپرد کیا گیا ہے۔

جلسے ہوئے، سربرآوردہ اشخاص اور ذمہ دار اصحاب سے ملاقاتیں رہیں۔

دارالعلوم میں کتب خانہ اور "تعمیر حیات" کی بڑھی ہوئی مصروفیت کے ساتھ شہر میں ہونے والی سرگرمیوں تقریبات اور تحریکوں پر وہ پوری نظر رکھتے تھے، اگر باہر سے تعلیم یافتہ اور معزز مہمان آتے تو ان سے رابطہ قائم کرتے، ان کو دارالعلوم اور کتب خانہ دکھاتے اور اگر میں موجود ہوتا تو مجھ سے ملاتے، نومبر ۱۹۷۳ء میں لکھنؤ میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس ہوئی، آنے والوں میں سے متعدد اصحاب سے ان کے پہلے سے روابط تھے اور بعض سے ان کا غائبانہ تعارف، ۲۰/نومبر ۱۹۷۳ء کو انھوں نے میرے مشورہ سے ان مدیرانِ جرائد کو کتب خانہ کے شاندار ہال میں مدعو کیا اور ایک چائے پارٹی کا انتظام کیا، خوش قسمتی سے اس دن مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی مرحوم ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ و مدیر "معارف" بھی تشریف رکھتے تھے، اس سارے اہتمام کا مقصد یہ تھا کہ ان ایڈیٹر صاحبان کے کان میں (جو دوسروں ہی سے کہنے کے عادی ہوتے ہیں اور ان کو سننے کی کم نوبت آتی ہے) کوئی ایسی مفید بات پڑ جائے جس سے ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو اور وہ ملک کے مختلف فرقوں کے جذبات میں ہیجان، باہمی منافرت اور طفلانہ ذہنیت پیدا کرنے کے بجائے اپنے اخباروں اور قلم کی طاقت سے ذہن ودماغ کی تربیت اور بالغ شہری وسیاسی شعور پیدا کرنے کا کام لیں، یہی موقع تھا جب میں نے ان اہل قلم کو مخاطب کر کے فارسی کا مشہور غزلیہ شعر کے مصرعہ

زیر قدمت ہزار جان است

کو بدل کر

زیر قلمت ہزار جان است

پڑھا تھا(۱)

---

(۱) اس تقریب کی رپورٹ اور تقریر "تعمیر حیات" کے شمارہ میں آئی، اردو کے دوسرے اخبارات نے بھی اس کو نقل کیا۔

۶-۸ جولائی کی تاریخوں میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے اپنی پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا، بہت سی حیثیتوں سے یہ کانفرنس بڑی اہمیت رکھتی تھی، ایک تو یہ کہ وہ رابطہ عالم اسلامی جیسی عظیم ترین بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے تھی جس میں مسلم اور عرب ممالک کی سب سے زیادہ نمائندگی ہے، اور اس میں تمام ایشیائی اسلامی ممالک کے ممتاز ترین نمائندوں کے آنے کی امید تھی، دوسری یہ کہ یہ کانفرنس جنرل ضیاء الحق کے برسراقتدار آنے کے بعد اس عالمی پیمانہ پر کراچی میں ہو رہی تھی، پاکستان کے اس انقلاب سے جو جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا، ساری دنیا کے مسلمانوں بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کو جن کا دوسرا گھرانہ پاکستان میں آباد تھا گہری دلچسپی تھی اور انھوں نے جنرل صاحب سے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، ہم لوگوں کی دلچسپی کی ایک تیسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے خاندان کا دو ثلث حصہ پاکستان جا چکا تھا اور دونوں مملکتوں کے دنیا سے الگ قوانین کی بدولت پاکستان جانے کی برسوں نوبت نہیں آتی تھی، یہ وہاں جانے کا بڑا اچھا ذریعہ ہاتھ آیا، میں اپنے رفیق مولوی معین اللہ صاحب ندوی کے ساتھ اس وقت جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس اعلیٰ میں شرکت کے لیے حجاز گیا ہوا تھا، ہندوستان میں میرے اور مولانا منظور صاحب کے علاوہ (جو رابطہ کے مجلس تاسیسی کے مستقل رکن ہیں) مسلم صحافی کی حیثیت سے محمد میاں "مدیر البعث الاسلامی" اور مولوی اسحاق صاحب ایڈیٹر "تعمیر حیات" کے نام بھی دعوت نامہ آیا تھا، ہم لوگوں نے طے کر لیا کہ اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا ہے، مولوی اسحاق صاحب جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، اصلاً صوبہ سرحد ہی کے رہنے والے تھے، اور ان کی حقیقی بہن اور قریب ترین اعزہ وہاں تھے جن سے ان کو ملے ہوئے برسوں ہو چکے تھے، ہم لوگوں نے طے کیا کہ وہ پہلے ہی پاکستان چلے جائیں، وہاں کے حالات کا مطالعہ کریں، اور ایسا پروگرام پہلے سے بنالیں جس کی وجہ سے اس مختصر قیام اور دورہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے اور مختلف حلقوں تک یہ بات پہنچائی جا سکے، وہ پاکستان روانہ ہو گئے اور انھوں نے حسب توقع بہ کام بڑی خوش اسلوبی اور سلیقہ سے

انجام دیا، مختلف حلقوں اور مرکزوں سے رابطہ قائم کیا اور عزیزی مولوی فضل ربی ندوی مالک ''ادارہ نشریات اسلام'' ناظم آباد کراچی (جو پاکستان میں ہماری کتابوں کے ناشر ہیں) اور عزیز گرامی مولوی قاری سید رشید الحسن خطیب جامع مسجد نیوٹاؤن کے مشورہ سے کراچی پہنچنے کے بعد کے ہماری تقریروں و مجالس کا کئی روز کا مفصل پروگرام بنالیا اور اس کو اخبارات میں شائع بھی کرادیا، کانفرنس کے انعقاد کچھ سے پہلے جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ کے مجلس اعلیٰ میں شرکت کے لیے مجھے حجاز کا سفر کرنا پڑا، اس سفر میں مولوی معین اللہ صاحب ندوی میرے ساتھ تھے، کانفرنس کی تاریخیں ۶-۸ جولائی ۱۹۷۸ء تھیں، ہم لوگ ۵/جولائی کو جدہ سے روانہ ہوکر کراچی پہنچ گئے، وہاں مولوی اسحاق صاحب نے پوری زمین تیار کر رکھی تھی، کانفرنس کے بعد یہ پروگرام شروع ہونے والے تھے، ۹-۱۰ جولائی سے ان کا سلسلہ شروع ہوگیا، اس سلسلہ کی اہم تقریروں کا مجموعہ ''حدیث پاکستان'' کے نام سے ''ادارۂ نشریات اسلام'' نے شائع کردیا ہے، ایک مرتبہ کانفرنس میں ایک اور اہم اور نازک مسئلہ پر (جس پر جذبات میں تھوڑی دیر کے لیے ایک ہیجان پیدا ہوگیا تھا) اور اسی طرح ایک دوسرے نازک موقع پر جس میں بڑی احتیاط اور توازن کی ضرورت تھی، انھوں نے تقریر کی اور حاضرین ان کی خطابت، حاضر دماغی اور خلوص سے بہت متاثر ہوئے، کراچی کے بعد وہ پاکستان کے پورے دورے میں (جس کا تذکرہ محمد میاں مرحوم کے تذکرہ میں آچکا ہے) شریک رہے، اسلام آباد سے ہم لوگ محب عزیز مولانا سمیع الحق صاحب مدیر رسالہ ''الحق'' کی شدید خواہش واصرار پر اکوڑہ خٹک روانہ ہوئے، اس طرح ان کو اپنے قدیم آبائی وطن (صوبہ سرحد) کی فضا اور ہوا سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا، ان سطور کے لکھنے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ برادر عزیز سید احمد الحسنی مقیم لاہور کا خط ملا، اس کی حسب ذیل سطور بالکل اسی موقع ومحل سے تعلق رکھتی ہیں، وہ لکھتے ہیں:-

''مرحوم اسحاق جلیس کے ساتھ جب اکوڑہ کار میں جارہے تھے تو وہ رفقائے سفر کو اپنے آبائی وطن کے بارے میں آگاہ کررہے تھے، اتنے

میں ہم نے سڑک کے کنارے ایک نشان راہ دیکھا جس پر لکھا تھا
بفہ (Baffa) یہ عام راستہ سے ہٹ کر ایک راستہ کا نشان تھا، رفقائے
سفر نے انھیں بتایا کہ یہ آپ کے گاؤں کا راستہ ہے"۔

اس سفر کی آخری منزل لاہور تھی، جہاں ہم سب ۸، ۱۰ دن ٹھہرے، اہل علم اور اہل فکر کی ملاقاتوں اور تمام اجتماعات وتقریبات میں وہ رفیق اور میرے معاون خاص تھے، واپسی کا سفر ٹرین سے ہوا اور بڑی مسرت ودلچسپی کے ساتھ طے ہوا، ہم لوگ جولائی کی آخری تاریخوں میں لکھنؤ پہنچے۔

پاکستان کے دورے میں جن اہم شخصیتوں سے بھی ان کی ملاقات ہوئی وہ ان کی ممتاز ذہنی صلاحیتوں، وسیع واقفیت وباخبری، خوش گفتاری اور اخلاق سے متاثر ہوئے، جیسا کہ پروفیسر غفور احمد سکریٹری قومی اتحاد وسابق وزیر مرکزی حکومت پاکستان، مولانا مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل رکن اسلامی نظریاتی کونسل، اور مولانا سمیع الحق صاحب وغیرہ کے تعزیتی خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔

پاکستان کے اس تاریخی سفر کے بعد ان کے دو اور بڑے سفر اندرونِ ملک کے ہوئے، ایک کرناٹک کیرالا کا جہاں وہ اس غرض سے گئے تھے کہ ندوۃ العلماء کے ایک سالانہ جلسہ کے لیے موزوں مقام کا انتخاب کریں اور ندوۃ العلماء کی تحریک نیز "پیامِ انسانیت" کے کام سے لوگوں کو روشناس کریں، اسی سفر میں ان کو میسور وکالی کٹ میں پہلی مرتبہ پیٹ کے درد کی تکلیف ہوئی، کالی کٹ میں تکلیف بہت بڑھ گئی، ڈاکٹروں نے "السر" تجویز کیا اور پہلی مرتبہ انکشاف ہوا کہ ان کو یہ مرض (غالباً بہت دنوں سے) ہے، ان کی طبیعت اپنی صحت، پرہیز اور احتیاط کے بارے میں "لاابالی" واقع ہوئی تھی، جب وہ کسی کام میں لگ جاتے تو پھر ان کو کسی بات کا ہوش نہ رہتا، اس کے بعد بھی جو پرہیز اور علاج ضروری تھا اس میں غفلت ہوتی رہی، وقتی طور پر وہ مسکّن دواؤں کا استعمال کر لیتے اور کام میں لگ جاتے، یہی مرض بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔ "وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا"

ان کے دورہ کرناٹک وکیرالہ سے وہاں کی زمین ''پیام انسانیت'' کے لیے تیار ہوگئی تھی، خاص طور پر بنگلور میں عزیزی سید مصطفیٰ رفاعی نے اس سلسلہ میں بڑا کام کیا تھا، انھوں نے میر جعفر علی صاحب پرنسپل الامین کالج اور بعض رفیقوں کے ساتھ ''پیام انسانیت'' کے ہمدردوں کا ایک بڑا حلقہ بنالیا تھا، جو ہم لوگوں کے دورۂ کرناٹک کا مشتاق اور بے چینی سے منتظر تھا، وہاں اس کا ایک باقاعدہ حلقہ بھی بن گیا تھا، جس کی صدارت جنوبی ہند کی مشہور دینی وعلمی شخصیت مولانا مفتی ابوالسعود صاحب امیر شریعت کرناٹک وناظم دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور نے منظور فرمائی تھی، اس حلقہ کی طرف سے متواتر خطوط اور تار آئے کہ کرناٹک کا جلد دورہ ہونا چاہئے اور میں ضرور آؤں، چنانچہ مئی ۱۹۷۹ء میں دورہ کا پروگرام طے کرلیا گیا، ۲۶؍مئی تا ۴ جون اس کی تاریخیں مقرر ہوئیں، مولوی اسحٰق صاحب پہلے سے بنگلور پہنچ گئے تاکہ وہاں کے کام کے نقشہ کو دیکھ لیں، اور اس تحریک کا مزاج پیدا کرنے کی کوشش کریں، ناگپور کے مشہور داعی دین مولوی عبدالکریم پاریکھ صاحب بھی تشریف لائے، ۲۶؍مئی ۱۹۷۹ء کو میں مولوی معین اللہ صاحب ندوی کی رفاقت میں دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز بنگلور پہنچا، یہ دورہ بھی گزشتہ دوروں کی طرح بڑا کامیاب رہا، بڑی مصروفیت میں وقت گزرا، اس سفر میں بنگلور کے علاوہ میسور، ہاسن، مرکارہ اور بعض دوسرے مقامات پر جانا ہوا، بنگلور کے ایک جلسہ میں وزیر اعلیٰ کرناٹک مسٹر دیوراج ارس اور میسور کے ایک جلسہ میں وہاں کے بشپ اور دو ہندو فرقوں کے سب سے بڑے روحانی پیشوا شریک ہوئے، اس دورہ کی روداد بھی مولوی اسحاق صاحب کے قلم سے ''تعمیر حیات'' میں شائع ہوچکی ہے۔

کرناٹک سے واپسی پر میں بمبئی ٹھہر گیا، مجھے کچھ آرام کی ضرورت تھی اور کچھ تصنیفی کام بھی پیش نظر تھا، مولوی اسحاق صاحب بمبئی ۲، ۳ دن ٹھہر کر احمد نگر چلے گئے، اور مجھے اسی قیام میں محمد میاں مرحوم کی سنگین علالت کی اطلاع ملی اور میں اسی پریشانی کے عالم میں لکھنؤ پہنچا جہاں مجھے ان کی وفات کا علم ہوا، یہ حصہ مفصل طریقہ پر محمد میاں سے متعلق مضمون میں لکھا جاچکا ہے، مولوی اسحاق صاحب میرے بھی بعد لکھنؤ پہنچے، وہ بھی بالکل بے خبر تھے، لکھنؤ پہنچنے پر ان کو یہ صاعقہ اثر خبر معلوم ہوئی، اور وہ کچھ دیر ٹھہر کر [illegible]

رائے بریلی آ گئے، ان پر اس حادثہ کا بڑا گہرا اثر تھا، دونوں ساتھیوں میں بڑا توافق، بہت سی چیزوں میں مناسبت اور بڑا اُنس واتحاد تھا، کوئی چیز کرنی ہوتی تھی تو پہلے دونوں نقشہ بناتے، مشورہ کرتے پھر میرے پاس لاتے تھے، دارالعلوم کی ترقی اور اس میں نئی زندگی پیدا کرنے اور ''پیام انسانیت'' کی تحریک پر دونوں کا دماغ یکساں چلتا تھا، مولوی اسحاق صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کا بازو کٹ گیا اور ایک پشت پناہ جس کی تائید بڑی قیمتی ثابت ہوتی تھی دنیا سے رخصت ہو گیا، زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے خبری کا ایک عبرت انگیز نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی پوری توجہ اور جوش وخروش کے ساتھ (جوان کے ہر کام میں ہوا کرتا تھا) ''تعمیر حیات'' کا خصوصی نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا اور اس کا اعلان کر دیا، اور اپنے عزیز ومحبوب دوست کے متعلق مضامین اور تعزیتی خطوط جمع کرنے لگے، کس کو خبر تھی کہ ایک مہینہ بھی نہ گزرے گا کہ وہ اپنے بچھڑنے والے دوست کے پاس پہنچ جائیں گے، اور جس طرح زندگی کے آخری دور میں وہ ساتھ رہے، وہ اس خصوصی نمبر میں بھی ساتھ رہیں گے، اور اپنے محبوب ومرحوم دوست سے چند گز کے فاصلہ پر اپنا مدفن بنوائیں گے۔

اس حادثہ نے مجھ پر جو اثر ڈالا تھا وہ اس کو دیکھ رہے تھے، ان کی خواہش تھی کہ وہ اس غم کو کسی طرح ہلکا کریں، ان کو اس کا احساس تھا کہ میرے تاثر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مرحوم نے نوعمری میں انتقال کیا اور صرف ۴۴ سال کی عمر پائی، وہ ایک دن ایک کتاب ہاتھ میں لیے میرے پاس آئے، کہنے لگے کہ ''حضرت آپ کے محبوب دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم نے بھی تو ۴۴ سال کی عمر پائی، میں ان لوگوں کی فہرست بنا رہا ہوں جنھوں نے ایسی ہی عمروں میں وفات پائی ہے، اس فہرست میں بڑے بڑے عبقری اور نامور اہل کمال نکلے ہیں'' میں نے کہا کہ آپ کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ مولانا مسعود صاحب کی ۴۴ سال کی عمر ہوئی؟ کہنے لگے کہ آپ نے خود لکھا ہے، یہ کہہ کر میری کتاب ''پرانے چراغ'' میں میرا مضمون دکھایا، جس میں لکھا تھا کہ افسوس ہے کہ انھوں نے ۴۴ سال کی عمر پائی ع

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

دوبارہ انسان کی بے خبری دیکھئے کہ ان کو خبر نہ تھی کہ وہ بھی اسی عمر میں جانے والے ہیں، اور اسی فہرست میں ان کا بھی نام آنے والا ہے۔

جون ۱۹۷۹ء کی آخری تاریخوں میں مجھے جامعہ اسلامیہ کی مجلس اعلیٰ میں شرکت کے لیے حجاز روانہ ہونا پڑا، خیال ہوا کہ وہاں جوارِ نبوی میں مغموم و شکستہ دل کو کچھ تسکین حاصل ہوگی، میں مدینہ طیبہ میں تمام حالات سے بے خبر تھا کہ (غالباً ۵/جولائی کو) صدیق محترم مولانا محب اللہ صاحب ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء کا تار ملا کہ مولوی اسحاق صاحب سخت علیل ہیں، دعا کیجئے، اتنی دور دوسرے ملک تار دینے کا کیا مطلب؟ دل جو پہلے سے چوٹ کھایا ہوا تھا اور ایسی اطلاع کا تجربہ کر چکا تھا، کھٹک گیا، رفیق سفر مولوی معین اللہ صاحب نے کانپور کے دوستوں کو ٹیلکس کیا کہ حالات سے مطلع کیا جائے، وہاں سے پہلے اطلاع آئی کہ کیفیت بدستور ہے، دعا کی جائے، آخر ۸/جولائی ۱۹۷۹ء کو ظہر کے وقت جب ہم لوگ اپنی قیام گاہ بستان نور ولی مدینہ طیبہ میں تھے، ٹیلیفون کی (جو سرہانے ہی رہتا تھا) گھنٹی بجی، مجھ میں تو ہمت نہ ہوئی کہ میں سنوں، مولوی معین اللہ صاحب نے سنا اور میرے استفسار پر کہا کہ "اچھی خبر نہیں ہے" سب کچھ معلوم ہو گیا، لیکن صبر و رضا بالقضاء کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ہندوستان پہنچے تو علالت کی ابتدا و انتہا کی تفصیل میڈیکل کالج لکھنؤ کے اسپتال کے ذمہ داروں کی مجرمانہ غفلت کی روداد، ان کا بار بار اسپتال سے لے چلنے کا مطالبہ، دار العلوم کے ذمہ داروں اور ان کے رفقاء کی امکانی کوششیں، طلبہ کی تیمارداری اور خدمت کا حال، ان کا محمد میاں کو بار بار یاد کرنا اور کہنا کہ وہ میرے منتظر ہیں، ذکر میں مشغولیت، دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی ہمارے خاندانی مقبرہ میں دفن کئے جانے کی وصیت، دل پر پتھر رکھ کر یہ ساری داستان سنی اور پھر جب رائے بریلی پہنچنا ہوا تو بادیدۂ نم ان کی تربت پر حاضری ہوئی جنھوں نے مرنے کے بعد بھی دوری اور جدائی گوارا نہ کی۔

"ان للہ ما أخذ ولہ ما أعطی وکل شیئ عندہ بأجل مسمی"

یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ ان کی نماز جنازہ [illegible]

صاحب پھولپوری نے پڑھائی جو وقت کے مقبول و بلند پایہ مشائخ میں سے ہیں اور جو محض ایک لطیفۂ غیبی کی بنا پر رات اچانک دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی تشریف لے آئے تھے، ان کو اس واقعہ کی کچھ خبر نہ تھی، مرحوم کے لیے یہ ایک فالِ نیک اور اللہ کی خاص رحمت تھی۔

جس وقت انھوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا ہے، اس وقت ان کی فطری صلاحیتیں اور نورسیدہ کمالات اپنے عروج پر تھے "تعمیر حیات" کے صفحات پر ان کی کمان چڑھی ہوئی تھی، اور ابھی ان کے ان مقالات کی گونج ختم نہیں ہوئی تھی جو انھوں نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت پر صحیح نقطۂ نظر واضح کرنے اور ان حقائق کو ظاہر کرنے کے لیے لکھے تھے جن سے اس اقدام کے اسباب و محرکات کا علم ہوتا ہے، یہ مقالات ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے رجحانات و جذبات کے خلاف تھے اور اس کے ردعمل میں بعض علاقوں میں سخت ہنگامے ہو چکے تھے، لیکن یہ مقالات اتنی طاقت کے ساتھ اور ایسے مدلل طریقہ پر لکھے گئے تھے کہ ان کے پڑھنے کے بعد بیسیوں آدمیوں کے خیالات بدل گئے، اس پرچہ کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ان کی زندگی میں اس کے تین ایڈیشن نکالنے پڑے اور دو ایڈیشن ان کے بعد نکلے، دوسری طرف "پیام انسانیت" کے موضوع پر ان کی دلنشیں و دلآویز تقریریں سننے کے لیے کتنے لوگ گوش برآواز تھے، ہندوستان کے کتنے اطراف و نواح سے ان کے بلانے کے لیے خطوط آرہے تھے، "تعمیر حیات" ندوۃ العلماء کا تعارف، پیام انسانیت اور کتنے ملی اور دینی کام تھے جو ان کی ممتاز صلاحیتوں کے طالب اور مشتاق تھے کہ اچانک انھوں نے سب سے آنکھیں بند کر لیں اور سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

□□□